خانقاہوں میں تعلیم کیلئے ایک مفید کتاب

فہم التصوف

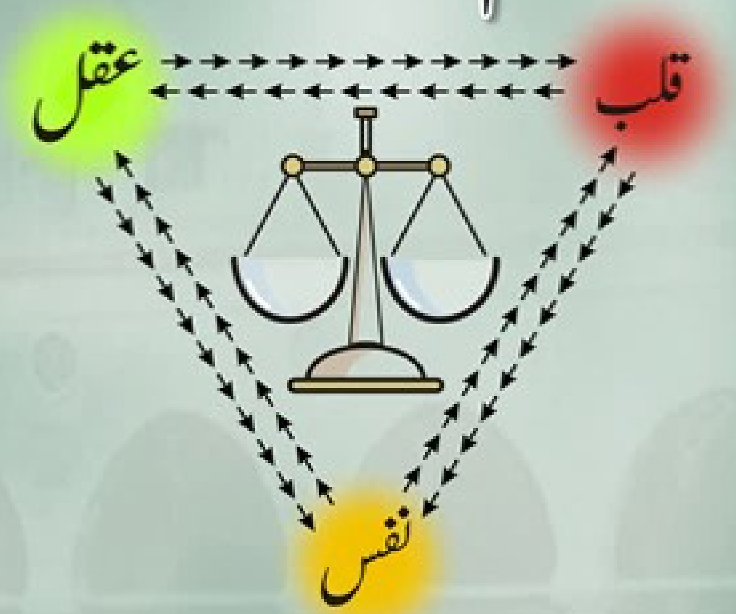

مؤلف

سید شبیر احمد کاکاخیل

مسترشد حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانیؒ
ومجاز بیعت دیگر اکابر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہم التصوف

مؤلف

سید شبیر احمد کاکاخیل

مسترشد

حضرت مولانا محمد اشرف صاحب سلیمانیؒ

خلیفہ مجاز

حضرت صوفی محمد اقبال مدنیؒ

حضرت احمد عبدالرحمن صدیقیؒ

حضرت سید تنظیم الحق حلیمیؒ

حضرت مولانا عبدالغفارؒ

حضرت ڈاکٹر فدا محمدؒ

حضرت سید میاں بشیر کاکاخیلؒ

حضرت حاجی عبدالمنانؒ مکہ مکرمہ

خانقاہ امدادیہ، مکان نمبر CB-1991/1 گلی نمبر 4 نزد آشیانہ چوک

بالمقابل جامع مسجد سیدنا امیر حمزہؓ اشرف لین اللہ آباد ویسٹریج 3، راولپنڈی

خانقاہ امدادیہ فون نمبرز: 051-5470582، 0332 5289274

انتساب

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ کے نام بالخصوص اور تمام مجددینؒ کے نام بالعموم جن کی کوششوں سے تصوف جو کہ اصلاحِ نفس و قلب و عقل ہے اور جس کے ذرائع وقت کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں، ہمیشہ ان مقاصد کے لئے ایک مؤثر نظامِ تربیت ثابت ہوا ہے۔ حضرت تھانویؒ چونکہ اس صدی کے مجدد ہیں اس لئے ان کی کتابوں سے اس میں زیادہ استفادہ کیا گیا ہے لیکن حضرت مجدد الف ثانیؒ کا ہزار سال پر محیط اثر ہمیشہ اس سلسلے میں تابندہ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ سارے اکابر کے مرقدوں پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔

نام کتاب: فہم التصوف

مؤلف : سید شبیر احمد کاکاخیل

صفحات : 350

سن اشاعت : مئی، 2018

اشاعت اول : 500

کتاب ملنے کا پتہ:

خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ، مکان نمبر: CB1991/1 گلی نمبر 4،
بالمقابل جامع مسجد سیدنا امیر حمزہؓ اللہ آباد ویسٹریج 3، راولپنڈی

فون نمبر: 03325289274، 051-5470582

فہرستِ موضوعات

تقریظ حضرت محدث مولانا محمد ایوب سورتی مدظلہ	7
تقریظ حضرت ڈاکٹر فدا محمد صاحب مدظلہ	8
تقریظ حضرت حاجی عبدالمنان صاحب مدظلہ	9
دیباچہ	10
تصوف کا ایک مختصر تعارف	14
ثبوت	15
تصوف کا بنیادی مقصد	18
تصوف کی ایک علیحدہ فن کے طور پر ضرورت	18
تصوف متنازعہ کیوں ہے؟	21
علمی اشکالات کا جواب	22
غالی صوفیاء کو جواب	25
تصوف کی چند مفید اصطلاحات	28
تربیت کا انحصار تین چیزوں کی اصلاح پر	51
مقامات سلوک	51
ایک اہم بات	54
صرف نفس کی اصلاح پر نظر رکھنا	54
اگر صرف دل کی اصلاح ہو تو	55
اگر صرف عقل کی اصلاح ہو تو	55
سلوک کا مجاہدہ	56
صحبتِ صالحین کے فائدے	58
ضرورتِ شیخ	60

مشائخ سے کیا پوچھنا چاہیے؟	61
شیخ کامل کی پہچان	63
مناسبتِ شیخ	65
شیخ کامل کی صحبت کے فائدے	65
بیعتِ طریقت	67
تمام سلسلوں کا ادب	69
حقیقتِ بیعت	69
بیعت کرنے کا طریقہ	70
بیعت کے وقت تعلیم	71
فنا فی الشیخ ہونا	73
دو طرح کا فنا فی الشیخ	75
مرشد کے حقوق	76
شیخ اور مرید کا تعلق	77
شیخ کا مقام	79
تصوف کے سلسلے	80
چاروں سلسلوں کے مشائخ کے اسمائے گرامی	83
شجرہ اور اس کی اہمیت	83
بندہ کی نسبت	84
امور تصوف	88
حاصل مطالعہ	94
سالک کے لئے مفید کتب	95
فقیر سے متعلق حضرات کے لئے ابتدائی ہدایات	97
اعمال	99

اخلاق	99
سلبی اعمال (اخلاقِ رذیلہ)	109
حبِ دنیا	110
حُبِ جاہ	114
حبِ باہ	116
حبِ مال	118
اخلاقِ رذیلہ کی قسمیں اور ان کا علاج	119
حرص	120
شہوت	122
غصہ	124
جھوٹ	126
غیبت	127
حسد	129
بخل	131
رِیا	133
عُجب	135
خود رائی	137
تکبّر	138
توحید	144
اخلاص	146
توبہ	149
محبت	154
شوق	158

اُنس	159
خوف	160
رجا	162
زُہد	164
توکل	165
قناعت	167
حِلم	168
صبر	168
شُکر	171
صدق	174
تواضُع	176
تفویض	177
رضا	179
فنا	181
دُعا	182
خشوع	188
تبلیغ	195
تفکر	201
تقویٰ	204
اعمال کے ثمرات(نتائج)	210
عبدیت کاملہ	210
رضائے الٰہی	213
غیر مقصود	218

ذرائع	218
منصوص ذرائع	218
غیر منصوص ذرائع	220
مجاہدہ	221
فاعلہ	247
ذکر	247
شغل	281
مراقبات	288
انوارات اور ان کی علامات	299
تصورِ شیخ	307
عشقِ مجازی	309
سماع	311
توابع یعنی احوال(Side effects) کا بیان	314
وہ احوال جن میں نقصان کا اندیشہ نہیں	315
اجابتِ دعا	315
الہام	316
رویائے صالحہ	316
فراست صادقہ	318
فنا	318
بقا	319
وجد	320
سکر کے بغیر وحدۃ الوجود	321
جن احوال میں نقصان کا اندیشہ ہے	322

استغراق	322
تصرف و تاثیر المعروف بہ توجہ	323
سکر	324
مشاہدہ	326
کرامت	327
کشفِ الٰہی	328
کشفِ کونی	328
وحدۃ الوجود سکر کے ساتھ	329
موانع	330
تصنع	330
تعجیل	332
حسن پرستی	334
مخالفتِ سنت	337
مخالفتِ شیخ	339
خواطر (خیالات)	342
ہاجس	347
خاطر	348
حدیثِ نفس	348
ہم	348
عزم	348
اجازت	349
شرائطِ اجازت	349

تقریظ حضرت محدث مولانا محمد ایوب سورتی مدظلہ

باسمہ سبحانہٗ و تعالیٰ شانہٗ

بخدمت محترم المقام جناب الحاج الشاہ شبیر احمد صاحب ادام اللہ فیوضکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ بعد سلام مسنون۔ طالب خیر مع الخیر ہے۔

ایک ہفتہ قبل آپ کی کتاب فہم التصوف بندہ کو موصول ہوئی۔ بندہ تو آپکو کئی برس قبل فہم الفلکیات سے جانتا تھا اور اسکی وجہ سے آپ کے علمی ذوق کا قائل تھا پھر ایک سال قبل آپ کی کئی کتابیں سلوک و تصوف تزکیہ و احسان کے موضوع پر پڑھ کر نہ صرف واقف ہوا بلکہ اپنے ناقص خیال میں آپکو طریق باطن کا شہسوار پایا اور اب ماشاءاللہ فہم التصوف تو میرے نزدیک اس موضوع پر انتہائی شافی اور کافی مجموعہ ہے۔ کوئی شک نہیں آپ نے بہت تفصیل اور عمدگی سے مسائل تصوف و سلوک کو بیان کیا ہے اور ان شاءاللہ طالبِ حق کیلئے یہ کتاب اکسیر ثابت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ آپکو بہت جزائے خیر دے اس علمی روحانی شاہکار کو قبولیت سے مالامال فرمائے اور طالبین کو اس سے خوب منتفع فرمائے۔

میں یقیناً اس کتاب پر کسی قسم کی تقریظ کہنے کا نہ اہل ہوں نہ صلاحیت رکھتا ہوں اس طریق کی الف با سے بھی واقف نہیں ہوں صرف بزرگوں کی نسبت کا سہارا ہے اور حدیث شریف کا ایک طالب علم ہوں دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ مجھے اخلاص عطا فرمائے اور اپنی رضا سے مالا مال فرمائے۔

مطالعہ میں کہیں کہیں چند معمولی غلطیاں کمپیوٹرنگ کی نظر آئی ہیں حاشیہ پر نشان لگا دیا ہے۔ معافی کی درخواست ہے۔ والسلام

محتاج دعا
محمد ایوب سورتی عفی عنہ
از مجلس دعوۃ الحق لسٹر یوکے
یکم ربیع الاول 1439ھ دو شنبہ

تقریظ حضرت ڈاکٹر فدا محمد صاحب مدظلہ

برصغیر پر اللہ کا احسان ہے کہ ہزار صدی کے بعد مقام مجددیت کیلئے یہ خطہ قبول ہوا۔ چنانچہ شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ ہزار صدی کے بعد مجدد الف ثانی کے عظیم خطاب کے ساتھ امتِ محمدیہ کے سامنے آئے اور ان کا فیض پوری دنیا اسلام میں پھیلا، بارھویں صدی کے مجدد شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ہوئے جب کہ تیرھویں صدی سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے حصہ میں آئی۔ چودھویں صدی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات سے آباد ہوئی۔ ان سارے حضرات نے اسلامی تعلیمات کو اپنے اپنے ادوار میں بیان فرما کر امت محمدیہ پر عظیم احسان فرمایا۔ فارسی کے ناپید ہونے کے بعد اور آج کے دور کی کمپیوٹر کی ایجاد کے بعد انگریزی ایسی چھا گئی کہ اردو کی استعداد بہت کمزور ہوگئی۔ اس دور کے لئے حضرات اکابرین کی تعلیمات کو نئے سرے سے آسان زبان میں جدید مثالوں اور اصطلاحات کے ساتھ بیان کرنے کی اشد ضرورت تھی۔ الحمدللہ شبیر صاحب نے اسی طرز پر ان علوم کو بیان کرکے نئی نسل پر احسان کیا ہے۔ مجموعہ فہم التصوف آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کتاب کو قبول فرمائے اور اس کو ہمارے بزرگوں کے فیوض و برکات کے پھیلنے کا ذریعہ بنائے۔

آمین

تقریظ حضرت حاجی عبدالمنان صاحب مدظلہ

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ اللہ تعالیٰ ہمارے عزیز بھائی شبیر کاکاخیل کو جزائے خیر دے انہوں نے تین آئمہ تصوف کی جو بہت باریک باتیں ہیں اس کو عام فہم انداز میں آگے بڑھایا ہے اور جس کی ضرورت بھی تھی۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ صاحب فرماتے تھے کہ لوگوں نے حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے مکتوبات کو پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ جو اس میں علم ہے وہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے کہ ان کی کتاب کو انہوں نے آگے بڑھایا ہے اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کا بڑا اونچا مقام ہے جو ہمارے اکابرین دیوبند میں ہیں ہماری سندیں ساری ان لوگوں سے چلتی ہیں حدیث کی بھی اور تصوف میں بھی ان کا بہت اونچا مقام تھا اور پھر ان دونوں کے شارح جو ہمارے دور میں ہیں وہ حضرت حکیم الامت انہوں نے ان دونوں حضرات کی تعلیمات کو خوب حکیمانہ انداز میں شرح کر کے عام فہم انداز میں پہنچایا ہے لیکن اس میں مزید تفصیلات کی یقیناً ضرورت رہتی ہے وقت کے ساتھ ساتھ۔ اللہ ہمارے عزیز کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی اِس کوشش کو قبولیتِ عام عطا فرمائے اور لوگوں کے لئے نافع بنائے اور ہم سب کے لئے صدقہ جاریہ بنائے۔

وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

بمقام بیت اللہ شریف مکہ مکرمہ

25 ذوالحج 1438

دیباچہ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْمُزَکِّیْ الْکَرِیْمِ أَمَّا بَعْدُ فَأَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰہَ وَ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ"

" اے ایمان والو ! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور (ایمان و عمل کے) سچوں کے ساتھ رہو۔" (التوبہ:119)

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس وقت کے سچوں کے ساتھ بیٹھنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ تقویٰ بھی نصیب فرمائے۔ آمین

تصوف دین کا ایک ایسا شعبہ ہے جس کا جو مقصد بتایا جاتا ہے اس سے کوئی بھی دیندار مستغنی نہیں۔ یہ انبیاء کی سنت ہے اور سب اس کے محتاج ہیں اس لئے ہر ایک پر لازم ہے کہ اس کے بنیادی مقاصد تک رسائی حاصل کرے۔ جہاں تک اس کے ذرائع کا تعلق ہے تو ان سے جب تک اس کے مقاصد پورے ہو رہے ہوں تو اس میں تبدیلی کی ضرورت نہیں لیکن جب اس سے وہ مقاصد پورے نہ ہو رہے ہوں جس کا تصوف میں حاصل کرنا ضروری ہے تو پھر ان ذرائع کے ساتھ چمٹنے میں کوئی خیر نہیں ان کو ایسا بدلنا کہ پھر ان سے مقصود حاصل ہو، ضروری ہو جاتا ہے۔

اس شعبے کا چونکہ اعمالِ قلب کے ساتھ تعلق ہے جو کہ انتہائی لطیف چیز ہے اس لئے اس میں دو طرح کے غیر پسندیدہ تغیرات اکثر و بیشتر وجود میں آتے رہتے ہیں جن کی پیش بندی اس فن کے ذمہ داروں کے ذمے لازمی ہوتی ہے۔ ان میں پہلا تغیر ان لوگوں کی وجہ سے آتا ہے جو جان بوجھ کر تصوف کو بگاڑنے پر تلے ہوئے ہوتے ہیں کیونکہ ان کے سفلی مقاصد اس بگاڑ کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ وہ لوگ یہ جانتے ہیں کہ وہ غلطی پر ہیں لیکن اپنے سفلی مقاصد کی وجہ سے اس کا اقرار نہیں کرتے اور مخلوقِ خدا کو دین سے برگشتہ کر رہے

ہوتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ان کی طرح ہیں جن کو قرآن میں "اَلْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" (وہ لوگ جن پر اللہ جل جلالہٗ کا غضب نازل ہوا) کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی صحبت سے ہر مؤمن کو بچائے کیونکہ یہ ایمان کے ڈاکو ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اولیاء کرام کی باتوں کی غلط تعبیریں کرتے ہیں اور قرآن و سنت کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ وحدت الوجود کے نام پر شرک اور معرفت کے نام پر الحاد پھیلا رہے ہوتے ہیں۔ دوسرا تغیر ان لوگوں کی وجہ سے آتا ہے جو تصوف کے اصل مفاہیم سے واقف نہیں ہوتے۔ وہ لوگ سنی سنائی باتوں کو بغیر تحقیق کے پھیلاتے رہتے ہیں۔ وہ مقاصد کو ذرائع اور ذرائع کو مقاصد بنا دیتے ہیں۔ اس طرح نظریاتی طور پر تصوف کو "کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی" کی عملی تصویر بنا دیتے ہیں اور عملی طور پر "دعوے بڑے اور عمل کم" کے مصداق بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ ان لوگوں کی طرح ہیں جن کو "الضَّآلِّيْنَ" (گمراہ) کہا گیا۔ یہ لوگ قابلِ رحم ہیں کیونکہ یہ گمراہ ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ وہ گمراہ ہیں۔ اگر ان کو کوئی ایسا ولی کامل مل جائے جن سے ان کو مناسبت ہو تو ان کی اصلاح ہو جاتی ہے اور خوش عقیدہ ہونے کی وجہ سے بہت جلد اپنے مقصود تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں لیکن اگر ایسا نہیں تو پہلا گروہ ان کو بہت آسانی کے ساتھ اپنا آلہ کار بنا لیتا ہے۔

ان ہی دو گروہوں کے مقابلے میں ایک ایسا تیسرا گروہ بھی وجود میں آیا ہے جو کہ اخلاص کے ساتھ تصوف کو خلافِ سنت سمجھ کر اس کی مخالفت کے درپے ہو جاتے ہیں یہ لوگ بھی قابلِ رحم ہیں۔ ان تک بھی تصوف کی صحیح تعبیر نہیں پہنچائی گئی ہے اگر کوئی ان کو تصوف کے بارے میں صحیح بات ان کی زبان میں پہنچائے تو یہ بھی قابلِ اصلاح ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی گمراہ ہیں کیونکہ نبی ﷺ کے کاموں میں سے ایک کام کی اپنی غلط فہمی کی وجہ سے مخالفت کر رہے ہیں۔ اگر ان کو بھی کسی طرح یہ سمجھا دیا جائے کہ اصل تصوف وہ نہیں جس کو تم تصوف سمجھ بیٹھے ہو یعنی جو ان پہلے دونوں گروہوں کا بیان کردہ ہے بلکہ اصل تصوف تو عین شریعت بلکہ شریعت کی تکمیل یا روح ہے تو وہ اپنی مخالفت

سے باز آسکتے ہیں اور اس طرح ان کو تصوف کی برکات حاصل ہوسکتی ہیں۔

چوتھا گروہ ان لوگوں کا ہے جو تصوف کو جانتے ہیں کہ عین حق ہے وہ قرآنی آیات کی تشریحات جانتے ہیں اور دل میں تصوف کی اصل اس کو مانتے ہیں لیکن بعض دنیاوی مقاصد کی خاطر تصوف کی مخالفت پر کمربستہ ہوتے ہیں۔ یہ گروہ بھی پہلے گروہ کی طرح "اَلْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اس لئے اصل میں یہ دونوں ایک ہیں۔ پہلا گروہ تصوف کے ذریعے اسلام میں بگاڑ پیدا کر رہا ہے اور یہ آخری گروہ تصوف کا انکار کر کے امت کو اس کی برکات سے محروم کرنا چاہتا ہے۔ ان دونوں کے لئے تو دعا ہی کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دل سے حبِ دنیا کو ختم کر کے ان کو ہدایت سے نواز دے۔ نہ انہوں نے دلائل سننے ہیں اور نہ ماننے ہیں اس لئے ان کے ساتھ بحث ضیاعِ اوقات کے سوا کچھ نہیں البتہ دوسرا اور تیسرا گروہ جو راستہ گم کرچکے ہیں ان کو راستے پر لانے کی کوشش کی جاسکتی ہے کیونکہ ان کو جیسے ہی صحیح راستے کا پتا چلے گا اس پر چل کر اپنی منزل مقصود کو پا لیں گے۔

یہ کتاب ان ہی دو درمیانی گروہوں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ اس میں یہ کوشش کی جائے گی کہ تصوف کی اصل کو واضح کیا جائے کہ یہ اصل میں کیا ہے۔ اس کا قرآن و حدیث کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ ان کی اصطلاحات جن کے مفاہیم کو لوگ بگاڑ کر حقیقت سے دور چلے جاتے ہیں ان کا اصل مفہوم کیا ہے؟ اس میں مقاصد کیا ہیں اور ذرائع کیا ہیں اور ان کا آپس میں کیا ربط ہے؟

یہ کتاب گو کہ فقیر کے الفاظ میں ہے لیکن یہ یا تو ان بزرگوں کے ملفوظات سے ماخوذ ہے جن کی صحبت میں اس فقیر نے نبوی شعبے کی الف با سیکھی ہے یا پھر ان بابرکت ہستیوں کی تحریرات سے جنہوں نے اس صدی کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر اس نبوی شعبے کو پھر سے نکھار کر قابل عمل بنا دیا۔ اس میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ مجددِ ملت، قطبِ ارشاد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ، علامۃ الدہر حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ، اپنے شیخ مولانا محمد اشرف سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ اور اپنے محسن حضرت صوفی محمد اقبال مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں

سے استفادہ کیا گیا ہے۔ گاہے گاہے اور حضرات کی تحریریں بھی زیرِ نظر رہی ہیں لیکن غلبہ ان کو حاصل ہے۔

فقیر کی یہ خواہش تھی کہ اس فن کے تشنگان کی اصل چشموں سے براہِ راست پیاس بجھے اس لئے فقیر کی یہ عادت رہی ہے کہ جس کو بھی تھوڑا سا دین کی طرف مائل دیکھا تو ان کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریرات سے متعارف کرنے کی کوشش کی لیکن آجکل کے انگریزی ماحول اور عربی لٹریچر سے دوری نے عام قاری کو ان بابرکت ہستیوں سے براہِ راست فیضیاب ہونے کا راستہ کافی حد تک بند کیا ہے اس لئے تعارف کے طور پر یہ کتاب اِن شاء اللہ کفایت کرے گی۔ آگے یہ کس کا دعویٰ ہے کہ اس فن کے ساتھ میں نے انصاف کیا۔ ہر ایک کی ہمت اور قسمت ہے کہ اپنے آپ کو کہاں تک سیراب کرتا ہے۔ فقیر کا کام ہے منزل کا تعین کرنا اس پر چلنا پھر ہر ایک کے ظرف پر منحصر ہے۔ تقاریظ اس وقت تین اکابر نے لکھی ہیں لیکن یہ چونکہ ضخیم کتاب ہے اس کے پڑھنے میں وقت لگتا ہے اس لئے دوسرے اکابر سے تقاریظ لینے میں وقت لگ سکتا تھا اور اس کے چھپوانے کا تقاضا دوست فرما رہے تھے۔ جو حضرات اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں اپنی رائے سے ضرور نواز دیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کو بھی شامل کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کو امت کے لئے بابرکت بنا دے اور جس مقصد کے لئے اس کو لکھا جا رہا ہے وہ مقصد پورا ہو۔ آمین ثم آمین۔

سید شبیر احمد عفی عنہ

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى خَاتَمَ النَّبِيِّنَ أَمَّا بَعْدُ: فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ "قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَ قَد خَابَ مَنْ دَسّٰهَا" بے شک وہ کامیاب ہوا جس نے اپنے نفس کو پاک کر لیا۔ اور بے شک وہ نامراد ہوا جس نے اس کو خاک میں ملا چھوڑا۔ (الشمس:9-10)

تصوف کا ایک مختصر تعارف

تصوف ایک متنازعہ لفظ ہے لیکن اس کا متنازعہ ہونا حقیقی نہیں بلکہ بعض حضرات نے ناسمجھی میں اس کے معنی غلط سمجھ لئے لہٰذا اس کی افادیت سے انکار کر بیٹھے۔ حقیقت میں کچھ اعمال ایسے ہوتے ہیں جو ظاہراً کرنے کے ہوتے ہیں جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ۔ اور کچھ اعمال باطناً ہوتے ہیں جن کا پتہ کسی اور کو نہیں چلتا اس کا پتہ صرف اللہ تعالیٰ کو یا کرنے والے کو ہوتا ہے اور ان ہی اعمال پر ظاہری اعمال منحصر ہوتے ہیں۔ اگر کسی کے یہ باطنی اعمال درست نہ ہوں تو چاہے اس کے ظاہر کے اعمال کتنے ہی درست ہوں وہ قبولیت کا درجہ نہیں پاتے۔ یا بعض دفعہ یہ ظاہری اعمال ان باطنی اعمال کی خرابی کی وجہ سے ضائع ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا ان باطنی اعمال کا درست کرنا بھی ضروری بلکہ اشد ضروری ہوا۔ سارے ظاہری اور باطنی اعمال کا انحصار تین چیزوں پر ہے، نفس، دل اور عقل۔ ان میں اعتدال ہو تو اعمال اچھے ہیں ورنہ جتنی بے اعتدالی ہوگی اتنی خرابی ہوگی۔ ان تینوں میں بے اعتدالی کو اعتدال پر لانا ہر شخص کے لئے ضروری ہے۔ وہ طور طریقے جن کے استعمال سے کسی شخص کے ظاہری باطنی اعمال درست ہو کر اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہوجائیں وہ تصوف کہلاتا ہے۔ شریعت کے طور طریقوں کو چونکہ فقہ بھی کہتے ہیں لہٰذا ان معنوں میں تصوف کو فقہ الباطن بھی کہا جاتا ہے۔

ثبوت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جب پیدا فرمایا تو اس کو اپنے ارادے کا مختار بنایا اور اس میں خیر و شر دونوں طرح کے مادے رکھے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا" اور نفس کی قسم اور اس کی جس نے اس کو درست کیا۔ پھر اس میں اسکا فجور اور تقویٰ الہام کیا۔ (الشمس:7-8) پس جب خیر کا مادہ استعمال ہوتا ہے تو کبھی کبھی اس پر فرشتے بھی رشک کرنے لگتے ہیں اور جب اس میں شر کے مادے کا پلڑا بھاری ہو جائے تو مجسم شیطان کی صورت میں بھی آجاتا ہے پھر فرمایا: "قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا" بے شک وہ کامیاب ہوا جس نے اپنے نفس کو پاک کر لیا۔ اور بے شک وہ نامراد ہوا جس نے اس کو خاک میں ملا چھوڑا۔ (الشمس:9-10) یعنی مادے تو اللہ تعالیٰ نے اس میں دونوں رکھے لیکن ان دونوں میں سے کسی کو بھی اختیار کرنے کا اختیار اس کو دے دیا۔ لیکن چونکہ یہ امتحان کے لئے تھا اس لئے یہ ارشاد فرمایا کہ کامیاب تو وہ ہے جو خیر کے مادے سے کام لے کر امورِ خیر انجام دے اور اپنے آپ کو نفس کے شر سے بچائے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کا مبارک ارشاد ہے كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ (القِيَامَة:20-21) یعنی ہر گز نہیں بلکہ تم فوری چیز کو پسند کرتے ہو اور بعد میں آنے والی چیز کو چھوڑتے ہو اس لئے عاجلہ کی یعنی دنیا کی محبت انسان کو آخرت سے غافل کر دیتی ہے اس کے لئے آپ ﷺ کا مبارک ارشاد ہے کہ ہر چیز کے لئے صفائی کا آلہ ہوتا ہے اور دلوں کے لئے صفائی کا آلہ ذکر اللہ ہے۔ اس طرح قرآن پاک میں عقلمندوں کی نشانی یہ بتائی گئی ہے کہ وہ ذکر اور فکر کرتے ہیں پس یہ اپنے آپ کو نفس کے شر سے بچانے کے لئے اور دل سے دنیا کی مذموم محبت نکالنے کے لئے اور عقل کو آخرت پر یقین دلانے کے لئے جو طریقے اور معمولات استعمال کیے جاتے ہیں ان ہی کو تصوف کہتے ہیں۔

چونکہ یہ ایک ضروری امر تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس میں ہمیں بغیر رہنمائی کے

نہیں چھوڑا۔ اس کے لئے انبیاء کرام کا مبارک سلسلہ جاری فرمایا۔ ان کا جو فرضِ منصبی تھا ان میں ایک اپنی امت کا تزکیہ بھی تھا۔ تزکیہ سے مراد یہی اپنے آپ کو نفس کے شر سے بچانا ہے۔ سب سے آخر میں ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ کی بعثت مبارک ہوئی جن کو قرآن عطا ہوا جس نے تمام ادیان کی تکمیل کی اور دوسری کتابیں جن کی حفاظت کا وعدہ نہیں تھا ان پر عمل منسوخ قرار دیا گیا اور قرآن کو ہدایت کا سرچشمہ قرار دے کر اس پر عمل کا مطالبہ ہوا۔ آپ ﷺ نے خود بھی اس پر عمل فرمایا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی اس پر عمل کے لئے تیار کیا۔ آپ ﷺ نے قرآن کے مطابق اپنے فرائضِ منصبی کا خوب حق ادا کیا جس کی طرف اشارہ اس آیت مبارکہ میں ہے: "كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ" جیسا کہ ہم نے تم میں ایک رسول تم ہی میں سے بھیجا جو تم پر ہماری آیتیں پڑھتا ہے اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب اور دانائی سکھاتا ہے اور تمہیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔ (البقرة: 151)

اس میں آپ ﷺ کے بارے میں ارشاد ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو قرآن کی آیتوں کی تلاوت سے روشناس کیا، ان کے دلوں میں للّٰہیت پیدا فرمائی اور ان کو کتاب و سنت کی تعلیم سے بہرہ ور فرمایا اور ان کو ایسے ان گنت علوم سے روشناس فرمایا جو وہ پہلے نہیں جانتے تھے۔ ان اُمور میں سے پہلے تلاوتِ قرآن کی تعلیم ہے جس کی ذمہ داری بعد میں قُراء حضرات نے اٹھائی۔ اس کے بعد تعلیم للّٰہیت ہے جس کا ذمہ تصوف کے ماہرین نے لیا اور اس کے ساتھ کتاب و سنت کی تعلیم ہے جس کی ذمہ داری علماءِ امت نے اٹھائی۔ پس اعمال کی دو قسمیں ہوئیں۔ جن میں ایک اعمالِ ظاہر یا اعمالِ جوارح ہیں اور دوسرے اعمالِ باطن یا اعمالِ قلب ہیں۔ علمِ ظاہر میں تلاوتِ قرآن اور فقہ ظاہر کے علوم آئے اور علمِ باطن میں فقہ باطن یا اعمالِ قلب کے علوم آئے۔ گو ان تمام علوم کی تدوین بعد میں ہوئی ہے لیکن یہ چونکہ اصل کارِ نبوت ہیں اس لئے ان کا سلسلہ آپ ﷺ تک جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ تلاوتِ قرآن اور تلاوت یا سماعتِ

احادیث کے سلسلوں کی طرح تصوف کے سلسلے بھی جاری ہوئے۔ اگرچہ اس کا معروف نام تصوف ہے لیکن حضرت سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے مطابق اس کا قرآنی نام تقویٰ ہے جو کہ تمام علومِ ہدایت کا دروازہ ہے جیسا کہ قرآن کے بارے میں قرآن ہی میں ارشاد ہے: "ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس عظیم الشان کتاب میں کوئی شک نہیں اور یہ متقین کے لئے ہدایت ہے۔ (البقرۃ:2) پس ضروری نہیں کہ غیر متقین اس قرآن سے ہدایت حاصل کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ غیر متقی اساتذہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسی قرآن کے اعلیٰ مضامین کو کھول کھول کر بیان کر رہے ہوتے ہیں لیکن خود ہدایت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ بخاری شریف کی حدیثِ احسان میں اس کا نام احسان ہے۔ اس کو کوئی زہد کہہ دے یا تقویٰ، احسان کہہ دے یا تصوف، اس میں کام دلوں کی صفائی کا کیا جاتا ہے۔ دل میں کان، زبان، ناک اور ذہن کے ذریعے ہر دم جو آلودگیاں آتی ہیں ان کا تدارک اور تلافی کی جاتی ہے، انسان کو انسان اور مسلمان کو مسلمان بنایا جاتا ہے۔ دلوں سے تکبر، عجب، حسد، کینہ، ریاء، بدگمانی، خودپسندی وغیرہ کو نکال کر اس میں تواضع، مسکینی، اخلاص، نیک گمانی، تفویض، توکل اور خوداحتسابی پیدا کی جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان کے دل کو مادہ پرستی سے نکال کر خدا پرستی کی طرف ڈالا جاتا ہے۔ اس کو ہر دم یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ تو کہاں سے آیا ہے اور کہاں جانا ہے؟ اور جہاں جانا ہے وہاں کیا ہوگا اور اس کے لئے کیا کرنا ہے؟ بس کرنا تو وہی شریعت کی اتباع ہے کہ ہمیں اسی کے لئے تو پیدا کیا گیا ہے لیکن تصوف میں اس پر زور دیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے کرنا ہے۔ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ مجاز حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تصوف کی جو مختصر مگر جامع تعریف بیان فرمائی ہے وہ یہ ہے تصوف میں ساری ریاضتیں اور کوششیں اس لئے ہوتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دائمی تعلق حاصل ہو جائے اور ہر کام فقط اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق ہونے لگے۔

تصوف کا بنیادی مقصد

مندرجہ بالا جامع تعریف میں خط کشیدہ حصّہ تصوف کا بنیادی مقصد ہے۔ اس کو اچھی طرح ذہن نشین کیا جائے۔ کیونکہ اسی پر قرآن میں ولایت کا وعدہ ہے: "بَلٰى مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ" جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف پھیر دیا یعنی دل کا قبلہ درست کرلیا اور سب کام اللہ تعالیٰ کے لئے کرنے لگا اور تھا نیکی کرنے والا یعنی شریعت پر چلنے والا تھا تو ان کو اللہ تعالیٰ اس کا اجر عطا فرمائیں گے اور نہ ان کو کوئی ڈر ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے (البقرۃ:112)۔ "لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ" نشانی ہے ولایت کی جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: " اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ" اس کا مفہوم یہ ہے کہ آگاہ ہوجاؤ کہ اولیاء اللہ کو نہ ڈر ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے (یونس:62)۔ یہ مضمون سورۃ اعراف میں اور بھی وضاحت کے ساتھ آیا ہے: "يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ" یعنی اے بنی آدم (ہم نے عالمِ ارواح ہی میں تمہیں کہا تھا کہ) اگر تمہارے پاس پیغمبر آئیں جو تم میں سے ہوں جو میرے احکام تم سے بیان کریں سو (ان کے آنے پر) جو شخص (تم میں ان آیات کی تکذیب سے) پرہیز رکھے اور (اعمال کی) درستی کرے (مراد یہ کہ ان کی کامل اتباع کرے) سو ان لوگوں پر (آخرت میں) نہ کچھ اندیشہ کی بات (واقع ہونے والی) ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے (الاعراف:35)۔

تصوف کی ایک علیحدہ فن کے طور پر ضرورت

جیسا کہ اعمالِ ظاہر میں بعض چیزیں فرض ہیں، بعض واجب، بعض سنت اور بعض مستحب۔ اسی طرح اعمالِ باطن میں بھی بعض چیزیں فرض ہیں، بعض واجب، بعض سنت اور بعض مستحب۔ دوسری طرف اعمالِ ظاہر میں بعض چیزیں

حرام ہیں، بعض مکروہ تحریمی ہیں اور بعض مکروہ تنزیہی۔ اسی طرح اعمالِ باطن میں بھی بعض چیزیں حرام ہیں، بعض مکروہ تحریمی اور بعض مکروہ تنزیہی۔ اس لئے ہر چیز کا اس کے مقام کے حساب سے مطالبہ ہو گا۔ جب بڑے بڑے لوگ اعمالِ باطن کے ایک حرام میں مبتلا ہونے کی وجہ سے جہنم جاتے ہوں تو پھر اس سے بچنا ضروری نہیں تو کیا ہے؟ سورۃ ھود میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُونَ أُولَئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِيْ الْآخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبَاطِلٌ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ" جو شخص (اپنے اعمالِ خیر سے) محض حیاتِ دنیوی (کی منفعت) اور اس کی رونق (حاصل کرنا) چاہتا ہے (جیسے شہرت و نیک نامی و جاہ اور ثوابِ آخرت حاصل کرنے کی اس کی نیت نہ ہو) تو ہم ان لوگوں کے (ان) اعمال (کی جزا) ان کو دنیا ہی میں پورے طور سے بھگتا دیتے ہیں اور ان کے لئے دنیا میں کچھ کمی نہیں ہوتی (یعنی دنیا ہی میں ان کے اعمال کے عوض ان کو نیک نامی اور صحت و فراغ، عیش و کثرتِ اموال و اولاد عنایت کردیے جاتے ہیں جب کہ ان کے اعمال کا اثر ان کے اضداد پر غالب ہو اور اگر اضداد غالب ہوں تو پھر یہ اثر بھی نہیں ہوتا۔ یہ تو دنیا میں ہوا۔ رہا آخرت میں سو یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے لئے آخرت میں بجز دوزخ کے اور کچھ (ثواب وغیرہ) نہیں اور انہوں نے جو جو کچھ کیا تھا وہ آخرت میں سب (کا سب) ناکارہ (ثابت) ہو گا اور (واقع میں تو) جو کچھ کر رہے ہیں وہ (اب بھی) بے اثر ہے (بوجہ فسادِ نیت کے مگر صورتِ ظاہری کے اعتبار سے ثابت سمجھا جاتا ہے۔ آخرت میں یہ ثبوت بھی زائل ہو جائے گا۔ (ھود:15-16)

یہ ترجمہ بیان القرآن سے یہ لیا گیا ہے اور اس میں قوسین میں تفسیری کلمات ہیں۔ بخاری شریف کی پہلی حدیث شریف ہے "اِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّات" جس کا مفہوم یہ ہے کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے یعنی ظاہر شریعت کے جتنے اعمال بھی کئے جائیں ان کا نتیجہ اس پر موقوف ہو گا کہ وہ اعمال کس کیلئے کیے گئے۔ اسی طرح ترمذی شریف کی ایک طویل حدیث شریف کے مطابق تین آدمی

جو اعلیٰ اعمال کو کرنے والے ہیں، ان میں ایک قاری ہے، ایک سخی ہے اور ایک شہید۔ لیکن چونکہ یہ اعمال انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں کیے تھے تو نتیجتاً بجائے جنت کے جہنم پہنچ گئے۔ اس حدیث شریف میں یہ بھی ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر اس کی روایت کے دوران باربار غشی طاری ہو جاتی تھی۔ مسلم شریف کی ایک حدیث شریف کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص کے دل میں اگر رائی برابر بھی تکبر ہو تو وہ جنت میں داخل نہیں ہوسکتا۔ اس سے اندازہ لگانا چاہیے کہ ریاء اور تکبر سے بچنا کتنا ضروری ہے۔ یہ دونوں اعمالِ قلب ہی تو ہیں۔ پس اخلاقِ حمیدہ کا حاصل کرنا اور اخلاقِ ذمیمہ سے چھٹکارا پانا روحانی صحت کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ اور جس کو یہ صحت حاصل ہو جاتی ہے تو اس کا قلب، قلبِ سلیم کہلاتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ شعراء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ أَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ" جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس دن مال اور بیٹے کوئی نفع نہیں دیں گے مگر سلیم دل جو لے کے آیا ہو اس سے فائدہ ہو گا۔ (الشعراء:89-88)

پس ان آیاتِ مبارکہ اور احادیثِ شریفہ سے تصوف کی ضرورت خوب واضح ہوگئی۔ آگے ہر ایک کی مرضی ہے کیونکہ یہاں تو اختیار دیا گیا اور اچھے بھلے کی تمیز سکھائی گئی ہے۔ ہر ایک کو اپنے ارادے کا پھل ملے گا۔ اعمالِ ظاہرہ تو فقہ کی صورت میں کتابوں میں مدوّن ہوگئے۔ ان کو کسی سے بھی سیکھ کر ان پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کی تشریح کسی بھی عالم سے لی جاسکتی ہے لیکن اپنے اپنے حالات میں اعمالِ قلبیہ پر کیسے عمل ہو یہ آسان بات نہیں۔ مثلاً نماز کو لے لیا جائے اس کے فرائض، واجبات، سنن اور مستحبات پر اچھی اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے کسی کتاب کا بھی مطالعہ کر لیا جائے تو نماز کے مسائل معلوم ہو جائیں گے اور تھوڑی سی کوشش سے ان تمام امور کو سیکھا بھی جاسکتا ہے۔ اس کے لئے کسی بڑے عالم کے پاس جانے کی ضرورت بھی نہیں جس نے بھی نماز اچھی طرح سیکھی ہو اس سے یہ نماز آسانی کے ساتھ سیکھی جاسکتی ہے کیونکہ اس میں اسے ہر ایک چیز نظر آرہی ہے اس لئے اس کی اصلاح کوئی مشکل نہیں۔

لیکن نماز کے اندر اگر کسی میں خشوع یا اخلاص نہیں تو اس کا پیدا کرنا آسان کام نہیں۔ نہ تو یہ محض کتابوں سے سیکھنے کی چیزیں ہیں اور نہ ہی یہ آپ ہر ایک سے پوچھ پوچھ کر حاصل کرسکتے ہیں۔ اس کے لئے باقاعدہ کسی کو اپنا رہنما بنانا پڑے گا جو اس راستے سے گزرا ہو۔ اور راستہ چونکہ نازک ہے اس لئے اس میں کسی خطرہ سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ رہنما اپنے فن میں طاق ہونے کے ساتھ ساتھ مستند بھی ہو۔ یعنی اس پر اعتماد کا سلسلہ حضور ﷺ تک پہنچتا ہو۔ اس کو سلسلہ کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ اگر کوئی نماز نہیں پڑھتا تو میں اس کے بارے میں اتنا فکرمند نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ ابھی اگر نمازی ہونے کی نیت کرلے تو ایک سیکنڈ میں نمازی ہو جائے گا لیکن اگر کسی میں تکبر دیکھتا ہوں تو اس کے بارے میں ڈر جاتا ہوں کیونکہ اگر اس نے اپنی اصلاح کی نیت کر کے کام شروع بھی کیا تو تکبر کو نکلتے نکلتے کافی عرصہ لگ سکتا ہے۔

تصوف متنازعہ کیوں ہے؟

یہ امر واقعی پریشان کن ہے کہ اتنا اہم اور مفید فن متنازعہ کیسے بنا؟ جب ہم اپنے اکابر کی کتابوں کو دیکھتے ہیں تو ہمارے سارے اکابر نہ صرف اس فن کے قدردان نظر آتے ہیں بلکہ ان میں بعض نے تو اس فن کی خدمت میں اپنی عمریں گزار دیں۔ لیکن آج ان ہی سے منسوب بعض حضرات اس فن کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے ہیں جیسے کہ یہ گمراہی کا ایک دروازہ ہو۔ اس کی جو وجہ اس عاجز کی سمجھ میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ جو تصوف کے مقاصد ہیں ان سے تو کسی کو بھی انکار نہیں۔ لیکن جو ان مقاصد کے ذرائع ہیں ان پر بعض لوگ کلام کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض ناسمجھوں نے ان ذرائع کو مقاصد کے طور پر پیش کر کے تصوف کا حلیہ بگاڑ دیا۔ ناسمجھوں کا تو خیر علاج ممکن ہے کیونکہ وہ جہالت سے ایسا کرتے ہیں اس لئے اگر جہالت دور ہو جائے تو ان کی اصلاح ہو جاتی ہے لیکن جو لوگ جان بوجھ کر اپنے چند ذاتی مفادات کی خاطر ذرائع کو مقاصد قرار دیتے ہیں ان کے ہاں سے اصل چیز رخصت ہو جاتی ہے اور چند رسومات رہ جاتی ہیں۔

جن میں وقت کے ساتھ مزید شدت آتی جاتی ہے جیسا کہ بعض صحیح بزرگوں کی وفات کے بعد ان کے سجادہ نشینوں نے کیا۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ طریقِ قلندر میں فرماتے ہیں:

"تصوف کے اصولِ صحیحہ قرآن و حدیث میں موجود ہیں۔ اور یہ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ تصوف قرآن و حدیث میں نہیں، بالکل غلط ہے۔ غالی صوفیاء کا بھی یہ خیال ہے اور خشک علماء کا بھی کہ تصوف سے قرآن و حدیث خالی ہیں، مگر دونوں غلط سمجھتے ہیں۔ خشک علماء تو یہ کہتے ہیں کہ تصوف کوئی چیز نہیں سب واہیات ہے بس نماز روزہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے، اسی کو کرنا چاہیے۔ یہ صوفیوں نے کہاں کا جھگڑا نکالا ہے؟ تو گویا ان کے نزدیک قرآن و حدیث تصوف سے خالی ہیں۔ اور غالی صوفی یہ کہتے ہیں کہ قرآن و حدیث میں تو ظاہری احکام ہیں، تصوف تو علمِ باطن ہے۔ ان کے نزدیک تصوف میں قرآن و حدیث ہی کی ضرورت نہیں۔ غرض دونوں حضرات قرآن و حدیث کو تصوف سے خالی سمجھتے ہیں، پھر اپنے اپنے خیال کے مطابق ایک نے تو تصوف کو چھوڑ دیا اور دوسرے نے قرآن و حدیث کو۔"

علمی اشکالات کا جواب

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس طرح قرآن میں "وَأَقِيْمُوالصَّلٰوةَ وَاٰتُوالزَّكٰوةَ" (اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ البقرة:43) موجود ہے اس طرح "يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا" (اے ایمان والو صبر کرو۔ آلِ عمران:200) اور "وَاشْكُرُوْ لِلّٰهِ" (اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاؤ) موجود ہے۔ اگر ایک مقام پر "كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ" (تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں۔ البقرة:183) اور "وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ" (اور لوگوں پر اللہ کے گھر کا حج کرنا اللہ کا حق ہے۔ آلِ عمران:97) پاؤ گے تو دوسرے مقام پر "يُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ" (عنقریب اللہ ایسی قوم کو لائے گا کہ جن کو اللہ چاہتا ہے اور وہ اس کو چاہتے ہیں۔ المائدة:54)

اور "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ" (اور ایمان والوں کو تو اللہ ہی سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ البقرۃ:165) بھی دیکھو گے۔ جہاں "وَاِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى" (اور جب وہ نماز میں کھڑے ہوتے ہیں تو سست بن کر کھڑے ہوتے ہیں النساء:142) ہے۔ اس کے ساتھ ہی "يُرَاۤءُوْنَ النَّاسَ" (لوگوں کو دکھاتے ہیں۔ النساء:142) بھی موجود ہے۔ اگر ایک مقام پر تارکِ صلوٰۃ اور تارکِ زکوٰۃ کی مذمت ہے تو دوسرے مقام پر تکبر اور عجب کی برائی ہے۔

اسی طرح احادیثِ شریفہ کو دیکھو جس طرح ابوابِ نماز و روزہ، بیع و شراء، نکاح و طلاق پاؤ گے، ابواب ریاء و کبر بھی دیکھو گے۔ اس بات سے کون مسلمان انکار کرسکتا ہے کہ جس طرح اعمالِ ظاہرہ حکمِ خداوندی ہیں اس طرح اعمالِ باطنی بھی حکمِ الٰہی ہیں۔ کیا "وَأَقِيْمُوالصَّلٰوةَ وَاٰتُوالزَّكٰوةَ" (اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ البقرۃ:43) امر کا صیغہ ہے اور "وَاصْبِرُوا"، "وَاشْكُرُوا" امر کا صیغہ نہیں؟ "كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ" سے روزہ کی مشروعیت اور مامور بہ ہونا ثابت ہوتا ہے اور "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ" سے محبت کا مامور بہ ہونا ثابت نہیں؟ بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ظاہری اعمال سب کے سب ہی باطن کی اصلاح کے لئے ہیں۔ اور باطن کی صفائی موجبِ نجات ہے اور اس کی کدورت موجبِ ہلاکت ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ "قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا" بے شک وہ کامیاب ہوا جس نے اپنے نفس کو پاک کر لیا۔ اور بے شک وہ نامراد ہوا جس نے اس کو خاک میں ملا چھوڑا۔ (الشمس:9-10) "يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ" یعنی اس دن مال اور اولاد کام نہیں آئیں گے مگر جو شخص اللہ تعالیٰ کے پاس سلیم قلب لے کے آیا۔ (الشعراء:89-88)

دیکھیں پہلی آیت میں تزکیہ باطن کو موجبِ فلاح اور دوسری میں سلیم قلب کے بغیر مال و اولاد سب کو غیر نافع فرمایا ہے۔ ایمان اور عقائد جن پر سارے اعمال کی مقبولیت منحصر ہے، قلب ہی کا فعل ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جتنے

اعمال ہیں سب ایمان کی تکمیل کے لئے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ اصل مقصود دل کی اصلاح ہے جس سے انسان مقبولِ بارگاہ اور صاحبِ مدارج و مقام ہوتا ہے اور اسی کا نام اصطلاح و عرف میں تصوف ہے۔ حضرت سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مستفسر کے جواب میں تحریر فرمایا:

"یہ فنِ سلوک نظری سے زیادہ عملی ہے۔ اس کے لئے ایسے کاملین کی ضرورت ہے جو اپنے حسنِ اعتقاد اور عمل کے لحاظ سے اسوۂ نبوی پر ہوں۔ جو اپنے آداب، اخلاق، عادات اور اتباعِ اوامر و نواہی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ ہوں۔ جن کی صحبت میں پرتو نبوی کا اثر ہو، اور جن کا سلسلہ صحبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت تک منتہی ہو، جس کا اصطلاحی نام شجرہ ہے۔ جس طرح فنِ روایت میں اس کا نام سلسلہ ہے۔"

اس مفہوم کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ علمِ حدیث جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت کا سلسلہ ہے، یہ سلوک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا سلسلہ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا سارا فیض صحبتِ نبوت کی تاثیر کا نتیجہ تھا۔ ان کے بعد صحابہ کے فیض سے تابعین اٹھے اور تابعین کے فیضِ صحبت سے تبع تابعین کا ظہور ہوا۔ یہ تین دور ایسے ہیں جن میں پچھلی جماعت اگلی جماعت سے بحیثیت جماعت کے متاثر ہے۔ مگر ہر دور میں جماعت تعداد اور کیفیت میں کم ہوتی چلی گئی۔ تبع تابعین کے بعد جب فتنوں کا ظہور ہوا تو تعداد بھی کم ہوگئی اب جماعت کی صحبت جماعت سے جاتی رہی۔ اب اشخاصِ کاملین کی صحبت سے اشخاصِ بااستعداد کے پیدا ہونے کا سلسلہ ہوا جس کا نام متاخرین نے ارادت یا پیری مریدی رکھ دیا ہے، ورنہ قدماء اور سلف صالحین کی اصطلاح صحبت ہی کی تھی۔ مرید کو صحبت یافتہ کہتے تھے جیسا امام محمد رحمۃ اللہ علیہ اور قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کو صاحبِ ابوحنیفہ کہتے ہیں۔ اس طرح حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ اور جنید رحمۃ اللہ علیہ بھی صحبت یافتہ کہلاتے تھے۔ جیسے یوں کہتے تھے کہ فلاں شخص نے شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی

صحبت اٹھائی ہے یا جنید رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت اٹھائی ہے۔

غالی صوفیاء کو جواب

صوفیاء پر اپنے اکابر کے اقوال حجت ہیں اس لئے اگر غالی صوفیاء تصوف کے مدعی ہیں تو ان کو اپنے اکابر کے اقوال سامنے رکھنے چاہییں جن میں چند پیش کیے جاتے ہیں۔

- حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "اگر تم کسی کو کرامات والا دیکھو کہ ہوا میں اڑتا ہو تو دھوکے میں نہ آجانا، جب تک یہ نہ دیکھو کہ وہ امر و نہی، حفظِ حدود اور پابندیٔ شریعت میں کیسا ہے۔"
- حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ "مخلوق پر سب راستے بند ہیں سوائے اس کے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بقدم چلے۔"
- حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "جس کو دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی ایسی حالت کا دعویٰ کرتا ہے جو اس کو حدِ شرعی سے باہر کر دیتی ہے تو اس کے پاس بھی نہ پھٹکو۔"
- حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت قولاً، فعلاً و ارادتاً اس لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کے بغیر نصیب نہیں ہوتی۔"
- حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "جو آدمی شریعت پر قائم ہوا اور جو کچھ احکام شرع کے ہیں ان کو بجا لایا اور سرِ مُو تجاوز نہیں کی تو اس کا مرتبہ آگے بڑھتا ہے یعنی تمام ترقیاں اس پر موقوف ہیں کہ شریعت پر ثابت قدم رہے۔"

ایک بات جس کا سمجھنا ضروری ہے کہ بعض اوقات بزرگوں نے نااہلوں سے اپنے علوم کو چھپانے کے لئے ذومعنی الفاظ استعمال کئے ہیں۔ جو اہل تھے انہوں نے اس سے اصل مطلب لے لئے اور دوسروں نے اس کو اپنے اپنے مطالب پر منطبق کیا جس سے مطلب کچھ کا کچھ ہوگیا۔ اس لئے اہلِ حق صوفیاء

نے بعد میں یہ قانون بنا لیا کہ صوفیاء کے کلام کو قرآن و حدیث پر پیش کیا جائے اگر اس کے مطابق ہے تو اس کو تو من و عن لے لیا جائے۔ اگر بظاہر قرآن و حدیث سے متصادم ہو تو اگر اس کی تاویل کی جاسکتی ہو تو تاویل کے ساتھ اس کا وہ مفہوم لیا جائے جو کہ قرآن و حدیث کے مطابق ہو اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو یا تو شطحیات میں سے ہو گا جس میں صوفی کو معذور سمجھا جائے گا لیکن اس کے قول کی تقلید نہیں کی جائے گی اور یا پھر اس کے کلام میں تحریف ہو چکی ہو گی جو کہ بعید نہیں۔ آخر آپ ﷺ کی احادیثِ شریفہ میں اگر لوگ موضوع روایتیں شامل کرسکتے ہیں، جن کی نگرانی کے لئے اسماء الرجال کا عظیم فن موجود ہے، تو صوفیاء کے اقوال میں تحریف کیوں نہیں ہوسکتی؟ جس کے لئے اس قسم کا کوئی فن معرضِ وجود میں نہیں آیا۔ اگر کوئی مدعی مثلاً حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا کوئی ایسا قول سامنے کرے جو شریعت سے متصادم ہو تو بجائے اس کے کہ ہم نعوذ باللہ قرآن و حدیث میں تحریف کے مرتکب ہوں یہ ضروری ہے کہ ہم اس کی کوئی ایسی تاویل کریں جس سے یہ شریعت کے ساتھ متصادم نہ رہے۔ اور اگر اس کی کوئی ایسی تاویل ممکن نہ ہو تو ہم اس کو حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں تحریف پر مبنی سمجھیں کیونکہ لوگوں کے لئے شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں تحریف کرنا حدیثِ رسول ﷺ میں تحریف سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ کیونکہ اس کو اسماءالرجال کی کسوٹی پر پیش کرنا ممکن نہیں جبکہ حدیثِ رسول ﷺ کے لئے ایسا انتظام موجود ہے۔ اس سے نہ تو شریعت پر حرف آئے گا نہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ پر کوئی تہمت آئے گی۔ اکابرِ امت نے اس طرح کے اُمور میں یہی کیا جس پر تاویل پرستی کی پھبتی کسی گئی۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے ہمیں تو اپنا دین بچانے سے غرض ہے جو کہ کتاب اللہ اور رجال اللہ کی بیک وقت اتباع کا نام ہے۔ اس لئے نہ تو کتاب اللہ پر کوئی حرف آنا چاہیے اور نہ ہمیں رجال اللہ سے کٹنا چاہیے۔ خوارج نے اپنے زعم میں کتاب اللہ کے ساتھ تمسک کیا تھا لیکن رجال اللہ کی ناقدری سے اتنے دور جا پڑے کہ آپ ﷺ نے ان کی گمراہی کی مستقل پیشنگوئی فرمائی اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ اپنے اس کارنامے پر فخر فرماتے تھے

جو انہوں نے نہروان میں خوارج کو تہ تیغ کر کے کیا تھا۔ دوسری طرف باطنیین نے رجال اللہ کے نام پر معانی کو اتنا بدلا کہ قرآن و حدیث سے انکار کے مرتکب ہوئے۔ اس طرح نہ ان کے عقائد محفوظ رہے اور نہ اعمال۔ امت کو بعد میں ایسے گمراہوں کو راہِ راست پر لانے اور لوگوں کو ان کے شر سے محفوظ رکھنے کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ قلعۃ الموت اور فاطمین کے دور میں عقلمندوں کے لئے کافی سامان موجود ہے۔ تصوف کا آخری مقام خالص بندگی، فنائیت اور بقاء عنداللہ ہے جس کا لازمی نتیجہ محبوبیت عنداللہ ہے۔ پس کسی کو اتنی بات اگر سمجھ میں آگئی تو اس کے لئے تصوف کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں۔ وہ ان غالی متصوفین کے کہنے سے جو یہ کہتے ہیں کہ شریعت اور ہے اور طریقت اور ہے، گمراہ نہیں ہوں گے بلکہ طریقت کو تکمیل شریعت سمجھیں گے۔ وہ خدا پرستی کے لبادے میں ان مادہ پرستوں کو بھی پہچان لیں گے جو دوسروں کو اکابر کے استغنا کی بڑی بڑی باتوں میں اس لئے مشغول کرتے ہیں کہ ان کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالیں۔ وہ فکر کے مصلحین کے جامے میں فکر کی گمراہی کو فروغ دینے والے ان فلسفیوں کو بھی پہچان لیں گے جو اپنی کج بحثی کے ذریعے سیدھی سادھی طریقت کو چیستان بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ انہوں نے چونکہ خود تصوف کو فلسفہ کی عینک سے دیکھا ہوتا ہے اس لئے دوسروں کو بھی یہ عینک لگانے پر مصر ہوتے ہیں۔ وہ ہمارے محبوب پیغمبر ﷺ کی محبت میں بظاہر مرنے والے ان نفس پرستوں کو بھی پہچان لیں گے جنہوں نے اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے دین میں نت نئے طریقے وضع کئے اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد "كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ"(المسلم) کو نہ صرف خود پسِ پشت ڈالا بلکہ اپنے متعلقین کو ان اللہ والوں کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتے کہ مبادہ وہ ان کو آپ ﷺ کا یہ پیغام سنا دیں اور پھر وہ ان کی نفسانی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ نہ بن سکیں۔ اگر کچھ کسر باقی ہو تو اس کے لئے حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف سلوکِ سلیمانی سے ”غیر شرعی یا عجمی تصوف“ کے عنوان پر مشتمل تحریر پڑھی جاسکتی ہے جس کی تفصیل حضرت کی کتاب سلوکِ سلیمانی جلد اول میں ملے گی جس سے اِن شاء اللہ اچھی

طرح تسلی ہو جائے گی۔

تصوف کی چند مفید اصطلاحات

ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کی منشاء کے مطابق زندگی گزارے۔ اس کے لئے جن علوم کا حاصل کرنا ضروری ہے وہ بھی فرض اور جن ذرائع پر یہ موقوف ہیں وہ بھی لازم ہیں۔ اور یہ بھی لکھا گیا ہے کہ ذریعہ فی نفسہٖ مقصود نہیں ہوتا لیکن اگر مقصد اس کے بغیر حاصل نہ ہوتا ہو تو وہ بھی لوازمات میں شامل ہو جاتا ہے۔ اسلام کی تمام تعلیمات کا سرچشمہ کتاب و سنت ہے جس کی ابتدائی تعلیم مجلسِ نبوی میں دی جاتی تھی اور چونکہ ابتدائی دور تھا حلقہ بگوشانِ اسلام اپنے اصلی مرکز میں موجود تھے جن کی تعداد بھی اس وقت اتنی زیادہ نہ تھی جتنی بعد میں ہوگئی اس لئے نبوی درسگاہ میں ان ضروری تعلیمات کو حاصل کرنے کے لئے علم حدیث، علم فقہ، علم تفسیر، اور علم تصوف کے نام گو کہ معروف نہیں تھے لیکن بعد میں جن تعلیمات سے یہ مدون ہوئے ان کے اصل کی تعلیم یکجا دی جاتی تھی۔ کوئی الگ الگ شعبے قائم نہ تھے۔ پس ان تمام علوم کے مقاصد آپ ﷺ کی نگرانی میں حاصل ہو رہے تھے اور ان سب مقاصد کو حاصل کرنے کا جو سب سے بڑا ذریعہ موجود تھا اور وہ آپ ﷺ کی صحبت تھی جس کے ہوتے ہوئے کسی اور ذریعے کی حاجت نہیں تھی۔ اس نبوی درسگاہ میں ایک اقامتی شعبہ ایسا بھی موجود تھا جس میں محبانِ خدا اور عاشقانِ رسول اللہ ﷺ تزکیہ نفس و اصلاحِ باطن کی عملی تعلیم و تربیت کے لئے ہر وقت موجود رہتے تھے اور وہ اصحاب صفّہ کہلاتے تھے۔ بعد ازاں جب اسلام عالمگیر حیثیت اختیار کر گیا اور آپ ﷺ کی صحبت بھی موجود نہیں رہی اور نہ ہی ان کی صحبت جن کو براہِ راست آپ ﷺ کی صحبت حاصل رہی تھی اس لئے ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے علماء دین نے الگ شعبے قائم کئے۔ جنہوں نے علم حدیث کی خدمت کی وہ محدث کہلائے۔ اور جنہوں نے علم تفسیر کا کام سنبھالا وہ مفسر کہلائے۔ جو فقہ کا کام کرنے میں منہمک ہو گئے وہ فقیہ بن گئے اور جنہوں نے تزکیہ نفس و اصلاحِ باطن کا شعبہ

سنبھالا وہ مشائخ اور صوفیاء مشہور ہوئے۔ اسی لئے اکابر سلف میں سے کسی نے شریعت کو طریقت سے الگ نہیں کیا بلکہ ہمیشہ طریقت کو شریعت کے تابع رکھا۔ درج ذیل میں چند ضروری اصطلاحات کا تعارف بیان کیا جاتا ہے جو کہ فی الحقیقت تو بہت آسان ہیں لیکن دکاندار پیروں نے ان کو باطل فلسفے کا ایسا گورکھ دھندہ بنایا ہوا ہے کہ بعض مخلصین ان کے ناموں سے چڑنے لگے ہیں۔ اس لئے علم تصوف میں ان کے اصل مفاہیم کا سمجھنا سالک کے لئے بہت ضروری ہے تاکہ کسی مرحلے پر کوئی اس کو دھوکہ نہ دے سکے۔ ایک بزرگ نے راقم سے فرمایا کہ اصطلاحات مبتدی کے لئے علم کی سیڑھی ہے اور منتہی کے لئے عیب ہے کیونکہ مبتدی اس کے بغیر سیکھ نہیں سکتا اور منتہی کو اس کی حاجت نہیں ہوتی وہ جس کے حسبِ حال جو مناسب سمجھتے ہیں ارشاد فرماتے ہیں کیونکہ اس کو سمجھانا مقصود ہوتا ہے اصطلاحات مقصود نہیں ہوتیں۔ چند ضروری اصطلاحات کا تعارف یہاں ضروری ہے تاکہ آگے کے ابواب آسانی کے ساتھ سمجھ میں آسکیں۔

شریعت

شریعت احکام تکلفیہ (جن احکام پر عمل کرنے کا ہمیں ذمہ دار بنایا گیا ہے) کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس میں اعمالِ ظاہری و باطنی سب آگئے۔ زندگی گزارنے کا جو طریقہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان کے لئے پسند فرمایا ہے اس کو شریعت کہتے ہیں۔ اس کو ہم تک پہنچانے کے لئے چونکہ نبی ﷺ کی ذات مبارک ذریعہ بنی ہے۔ اس لئے اس کو آپ صلی اللہ علیہ والہ سلم کا طریقہ یا سنت بھی کہتے ہیں اور آپ ﷺ کو شارع بھی کہتے ہیں یہ صرف اسی نسبت سے ہے ورنہ فی الحقیقت احکامات تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں۔

فقہ

متقدمین کی اصطلاح میں لفظ فقہ کو شریعت کا ہم معنٰی سمجھا جاتا ہے۔ جیسا امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے فقہ کی تعریف "معرفت النفس ما لھا وما

علیہا" منقول ہے یعنی نفس کے نفع و نقصان کی چیزوں کو پہچاننا پھر متاخرین کی اصطلاح میں شریعت کے صرف اس جز کا نام جو اعمالِ ظاہرہ سے متعلق ہیں فقہ ہوگیا۔

تصوف

شریعت کا وہ جزو جو اعمالِ باطنہ سے متعلق ہے متاخرین کے نزدیک اس کا نام تصوف ہوگیا۔ یہ وہ فن ہے جس کے ذریعے دل، نفس اور عقل کی بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے دل، نفس اور عقل کی حالت کا پتا چلتا ہے اور بیمار دل، باغی نفس اور ہدایت سے محروم عقل کا علاج کیا جاتا ہے۔ اسی کو حدیث شریف میں احسان کہا گیا اور قرآن میں لفظ تقویٰ کا مفہوم اس کے قریب تر ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ تقویٰ تو دل کی ایک کیفیت کا نام ہے جو مقصود فی الاعمال ہے اور نفس کی غلط خواہشات کا ضد ہے، تصوف اس کو بلکہ تمام اخلاقِ حمیدہ کو حاصل کرنے کا اور اس کے اضداد سے بچنے کا علم و فن ہے۔

طریقت

ان اعمالِ باطنی کے طریقوں (Procedures) کو جس سے اخلاقِ حمیدہ حاصل ہوتے ہیں اور اخلاقِ رذیلہ سے چھٹکارہ حاصل ہوتا ہے، اس کو طریقت کہتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے کیونکہ مقصد صحت ہے طریقہ نہیں پس جس وقت جن طریقوں سے روحانی اور قلبی صحت کا زیادہ امکان ہو اس وقت ان ہی طریقوں کو طریقت کہا جائے گا۔

حقیقت

طریقت سے جب اعمال کی درستگی ہوتی ہے تو اس سے قلب میں صفائی اور ستھرائی پیدا ہوتی ہے اس سے دل پر بعض اعمال اور اشیاء بالخصوص اعمالِ حسنہ و سیئہ کے حقائق و لوازمات منکشف ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کا

ادراک ہوتا ہے جس سے بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان جیسا تعلق ہونا چاہیے اس کا ادراک ہوتا ہے ان علوم و معارف تک سالک کی رسائی کو حقیقت کہتے ہیں۔

شریعت طریقت حقیقت

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تحقیق ان تینوں کے بارے میں درج ذیل ہے۔

یہ بات جاننا چاہیے کہ جو شریعت پر دل سے چل رہا ہے اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔شریعت ہی کا مطالبہ ہے اگر اس پر عمل ہورہا ہے تو اور کسی چیز کی ضرورت نہیں البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ شیطان اور نفس انسان کو شریعت پر نہیں چلنے دیتے۔ شیطان دل میں وسوسے ڈالتا ہے اور نفس شریعت کی اوامر و نواہی کی پرواہ نہیں کرتا اور عقل کو نفس و شیطان متاثر کرسکتے ہیں اس لئے نفس و شیطان کے مکر وفریب کو سمجھنے کے لئے اور ان کے دام میں آنے سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے کچھ طور طریقوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان طور طریقوں کو طریقت کہتے ہیں۔ طریقت پر چلانے کے لئے مشائخ کو نفس و شیطان کے مکروفریب کو جاننا ہوتا ہے اور جو جو عوامل اصلاح نفس و قلب و عقل میں کارفرما ہوتے ہیں ان کو سمجھنا ہوتا ہے، اس کو حقیقت کہتے ہیں پس ان حقائق کا جاننا ہر ایک کے لئے نہ ضروری ہے نہ مفید البتہ جو ان کو حاصل کرسکتے ہیں ان کو اس کے دو فائدے ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ کسی وجہ سے اگر عقیدہ یا دین کے فہم کو کسی کی تقریر، تحریر یا عمل سے نقصان ہوسکتا ہو تو اگر اس کی معرفت حاصل ہوگی تو دل مطمئن ہوگا اپنی راہ سے نہیں ہٹے گا اور اگر کسی اور کو اس قسم کا مسئلہ ہوگا تو ان کو بھی اس کی زبان میں سمجھا سکے گا۔ ایسے لوگوں کو اس فن کے محقق کہتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ بعض اوقات کچھ حقائق نامکمل صورت میں سامنے آجاتے ہیں یا جن و انس کے شیاطین کے وسوسے کی صورت میں لائے جاتے ہیں۔ ان حقائق کو جان کر نامکمل کی تکمیل ہوجائے گی اور جن و انس کے وساوس کا علاج بھی ہوجائے گا۔

معرفت

بندے اور خدا کے درمیان اس تعلق کا ادراک ہی معرفت کہلاتا ہے کہ اس کے ذریعے سالک ہر وقت اپنے حال کے مطابق اللہ تعالیٰ کی منشاء کا بہتر طریقے سے ادراک کرلیتا ہے۔ اس لئے اس صاحبِ انکشاف کو محقق اور عارف کہتے ہیں اور اس نعمت کو معرفت۔ عارف چونکہ اپنے عجز اور بے ثباتی اور اللہ تعالیٰ کی عظمت کو بھی اچھی طرح جانتا ہے اس لئے باوجود دوسروں سے بہتر جاننے کے اپنے آپ کو ہمیشہ قاصر سمجھتا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے آدم علیہ السلام اور ابلیس کے واقعے کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

نسبت

نسبت کے معنی تعلق کے ہیں۔ یہ تعلق جانبین سے ہوتا ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں نسبت سے مراد اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کا ایسا تعلق ہے کہ اس کی وجہ سے وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے آپ کو حاضر اور جوابدہ پاتا ہے اور ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کو کسی نہ کسی صورت میں یاد کرتا ہے۔ اس سے اس کو طاعات اور عبادات کی طرف طبعی رغبت یا ایسی کامل عقلی رغبت کہ وہ اس کی طبعیتِ ثانیہ بن جائے ہو جاتی ہے اور گناہوں سے اس کو ایسی نفرت ہو جاتی ہے جیسا کہ پیشاب پاخانے سے ہوتی ہے۔ ایسے شخص کو ہمہ وقت اتباعِ سنت کی فکر ہوتی ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کو ایسا قرب حاصل ہو جاتا ہے کہ اس کا معصیتوں سے حفاظت کا انتظام ہو جاتاہے اور طاعات کی توفیقات سے اس کو نوازا جاتا ہے جس پر رضائے الٰہی کا ترتب ہوتا ہے۔ اس کے آثار مختلف ہوتے ہیں جن میں خودبخود روحانی تربیت کے اسباب کا بننا، دینی کاموں کے لئے استعمال ہونا، اہلِ قلوب کے دلوں میں خودبخود اس کے لئے محبت کا پیدا ہونا اور اس کے پاس بیٹھنے سے اللہ تعالیٰ کا استحضار پیدا ہونا وغیرہ شامل ہیں۔

نسبتِ انعکاسی

یہ نسبت سب سے کمزور اور وقتی ہوتی ہے۔ جب سالک شیخ کے سامنے ہوتا ہے تو شیخ کا رنگ مرید میں منعکس ہوکر محسوس ہوتا ہے کہ جیسا کہ سالک کو نسبت حاصل ہوگئی ہے لیکن شیخ سے دوری کی صورت میں کمزور ہوتے ہوتے معدوم ہوجاتی ہے۔

نسبتِ القائی

شیخ کے دئیے ہوئے معمولات اور رابطے کی برکت سے سالک کو جو نسبت القا ہوجاتی ہے وہ نسبت القائی ہے۔ اگر اپنی اصلاح کی کوشش جاری رکھے تو اصلاح کے بعد یہ نسبت اصلاحی میں بدل سکتی ہے بصورت دیگر معمولات کی پابندی اور رابطے کے ذریعے باقی رہے گی لیکن اپنی مستقل حیثیت اس کی نہیں ہوگی۔

نسبتِ اصلاحی

یہ وہ اصل نسبت ہے جس کو پانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس میں سالک کے رذائل دور ہوکر فضائل میں بدل جاتے ہیں اور سیر الی اللہ کی تکمیل ہوجاتی ہے۔ یہ ایک پائدار نسبت ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو نصیب فرمائے۔ آمین

نسبتِ اتحادی

یہ بہت ہی کم پائی جاتی ہے۔ اس میں شیخ کا رنگ سالک پر اتنا چڑھ جاتا ہے کہ گویا وہ یک جان دو قالب بن جاتے ہیں۔ نہ تو اس کی کوئی ریس کرے اور نہ اس کا انکار۔ ممکن ہے لیکن تقریباً نہ ہونے کے برابر۔

بیعت

بیعت تصوف کی اصطلاح میں شیخ اور مرید کے درمیان معاہدہ ہے کہ شیخ

اس کو طریق تعلیم کرے گا اور مرید اس پر عمل کرے گا۔ اس کا مقصد اعمالِ ظاہری و باطنی کا اہتمام و التزام ہے جس کے لئے مرید شیخ کو اپنا نگران دل سے تسلیم کرلیتا ہے اور شیخ اس کو اپنا سمجھ کر اپنی تعلیم اور دعا سے اس کی مدد کا قصد کرتا ہے۔ اس کو بیعتِ طریقت کہا جاتا ہے اور ہمارے بزرگوں کے ہاں بتواتر رائج ہے۔ اس کی شرعی حیثیت سنتِ مستحبہ کی ہے لیکن اس کی برکت سے فرائض، واجبات اور سنن پر عمل نصیب ہو جاتا ہے اور سب سے بڑھ کر بعض خوش نصیبوں کو نسبت حاصل ہو جاتی ہے جس کے سامنے دنیا کی کوئی بھی دوسری چیز کچھ بھی نہیں۔ نسبت کو حاصل کرنے کے لئے اپنی تربیت کروانا فرضِ عین ہے اور بیعت اس کا ایک ذریعہ ہے لیکن سنتِ مستحبہ ہے۔

شیخ

وہ عارف جو طالبینِ طریقت (جن کو سالک یا مرید کہا جاتا ہے) کو تعلیم کرنے کا اہل ہو شیخ کہلاتا ہے۔ شیخ کی پہچان کے بارے میں تفصیل سے آگے آرہی ہے۔

مرید

وہ طالب جو شیخ کے ہاتھ پر توبہ کرتا ہے اور اپنی اصلاح کے لئے جو کہ فرضِ عین ہے یہ عہد کرتا ہے کہ وہ شیخ کی ہر بات کو بلا چون و چرا مانے گا۔

سلسلہ

اس سے مراد صحبت اور اعتماد کا وہ سلسلہ ہے جو موجودہ شیخ سے آنحضرت ﷺ تک جاتا ہے۔ ہند میں چار بڑے سلسلے چل رہے ہیں۔ جو کہ چشتیہ، نقشبندیہ، قادریہ اور سہروردیہ ہیں۔ جس شیخ سے آدمی بیعت ہوتا ہے تو اس کے ساتھ آدمی اس کے سلسلے میں داخل ہو جاتا ہے۔ ان سلسلوں کی مثال فقہ کے چار طریقوں حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی یا طب کے مختلف طریقوں یعنی ایلوپیتھی،

ہومیوپیتھی، آکو پنکچر اوریونانی حکمت وغیرہ سے دی جاتی ہے۔ ان کے اصولوں میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے لیکن سب کا نتیجہ وہی روحانی صحت یعنی نسبت کا حاصل کرنا ہے۔

تلوین

احوال کا بدلنا تلوین کہلاتا ہے۔ چونکہ مرید کی جب تربیت ہوتی ہے تو اس پر عجیب عجیب انکشافات ہوتے ہیں جس سے اس کے احوال تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ چونکہ یہ ناپختگی کی علامت ہوتی ہے اس لئے سالک اس سے پناہ مانگتا ہے اور تمکین کی تلاش میں رہتا ہے۔ لیکن تمکین کے لئے تلوین لازمی ہے جیسا کہ منزل کے لئے راستے کا قطع کرنا۔ چونکہ دورانِ تلوین مختلف احوال کا غلبہ ہوتا ہے جس میں سالک معذور ہوتا ہے، اس لئے ماخوذ نہیں ہوتے، لیکن اس حال میں وہ قابلِ تقلید بھی نہیں ہوتے بلکہ ابھی راہ میں ہوتے ہیں اس لئے مشائخ بھی ان کے لئے تمکین کے انتظار میں ہوتے ہیں۔

تمکین

تربیت کے بعد حسبِ استعداد کسی حالتِ محمودہ پر کسی سالک کو جو استمرار نصیب ہو جاتا ہے اس کو تمکین کہتے ہیں اس وقت تمام اشیاء کے حقوق خوب ادا ہوتے ہیں۔ اسی کو توسط اور اعتدال بھی کہتے ہیں صاحبِ تمکین حق شناس ہوتا ہے اور واصل ہوتا ہے اس لئے قابلِ تقلید اور مقتدا بننے کا اہل ہوتا ہے۔

سلوک

ایک ایک رذیلے کی اصلاح کو سلوک کہتے ہیں اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نزدیک اس میں دس مقامات یعنی توبہ، انابت، زہد، ریاضت، ورع، قناعت، توکل، تسلیم، صبر اور رضا کو تفصیلی طور پر طے کرنا ہوتا ہے۔

جذب

دل میں کسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی محبت کا پیدا ہو جانا اور دنیا کی محبت کا دب جانا گو عارضی ہو جذب کہلاتا ہے۔ یہ اگر سلوک کی تکمیل کے لئے شوق پیدا کرنے کے لئے ابتداءً توجہ، ذکر اذکار اور مراقبات کے ذریعے پیدا کیا جائے تو جذبِ مبتدی کہلاتا ہے اور یہ سلوک کی تکمیل کے بعد منجانب اللہ خود عنایت ہو تو یہ جذبِ منتہی کہلاتا ہے۔

سالک مجذوب

سلوک کی تکمیل کے بعد جذبِ منتہی جس کو عطا ہو جائے اس کو سالک مجذوب کہتے ہیں۔ اکثر سلسلوں کی ترتیب یہی ہوتی ہے۔

مجذوب سالک

جذبِ مبتدی کے بعد جو سلوک کی تکمیل کروا رہا ہو مجذوب سالک کہلاتا ہے۔ ایسے سالک کو بھی جذبِ منتہی جب عطا ہو جائے تو مجذوب سالک مجذوب کہلاتا ہے۔ نقشبندی کاملین حضرات کی یہی ترتیب ہوتی ہے۔

مجذوب متمکن

اگر مجذوب جذبِ مبتدی کے بعد سلوک کی تکمیل نہ کروائے تو ایسے مجذوب کو مجذوب متمکن کہتے ہیں یعنی حالت جذب میں تمکین کی حالت پیدا کرنے والا۔ ایسا شخص کامل نہیں ہوتا کیونکہ یہ مقام قلب میں ہوتا ہے جس میں نفس اور روح آپس میں گتھم گتھا ہوتے ہیں۔ باغی نفس جذب کے مفید اثرات کو بارآور نہیں ہونے دیتا لیکن جذب کی وجہ سے اس کی بعض علامات سے اس پر کامل کا گمان ہوسکتا ہے۔ ایسا شخص جب تک سلوک کی تمام منازل طے نہ کرلے نہ خود منزل پر پہنچا ہوتا ہے نہ دوسرے کو پہنچا سکتے ہیں حضرت مجدد صاحبؒ نے مکتوب نمبر 287 میں اس پر تفصیلی کلام فرمایا ہے۔

فنا

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ" اور میں نے جن اور انسان کو بنایا ہے تو صرف اپنی بندگی کے لیے۔ (الذاریات:56)

اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ" کی تفسیر حضرت عبداللہ بن عباسؓ "ای لیعرفون" سے کرتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کی عبادت اور معرفت کے لئے جو رکاوٹیں ہیں ان کو دور کئے بغیر یہ حاصل نہیں ہوسکتے۔ ان تمام رکاوٹوں کا ختم ہونا تب ممکن ہے جب انسان اپنا سب کچھ محسوس، غیر محسوس اللہ تعالیٰ پر قربان کرے یعنی اس کا نفس، عقل اور قلب کوئی ایسا کام، جذبہ اور سوچ تحریک نہ کرسکے جو اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے مقابلے میں آسکے۔ اور یہ تب ممکن ہے کہ انسان کو صرف وہی یاد ہو اور کچھ یاد نہ رہے۔ اس حالت کو فنا کہتے ہیں۔ اس کا مکمل تعین محال ہے کیونکہ اس کا ادراک فنا کے خلاف ہے اور بغیر ادراک کے کچھ معلوم نہیں ہوسکتا اس لئے یہ مقام حیرت و محویتِ محض ہے۔

جو ابتدائی جذب ہے اس میں دل کی قدرے اصلاح ہوچکی ہوتی ہے اس میں انسان اپنے دل کے جذب کے زور پر سلوک کے بغیر بھی اپنی کچھ خواہشات کو دبانے کے قابل ہو جاتا ہے اس قدر اس کو فنا حاصل ہو جاتی ہے یعنی قلبی طور پر، لیکن جو اس کا نفس ہے اپنے مقام پر نہیں آیا ہوتا تو عود کا خطرہ ہوتا ہے تو یہ جو ابتدائی جوش و جذبہ ہے اس کے ماند پڑتے ہی چونکہ ابھی نفس و روح آپس میں ملے ہوئے ہیں اس لئے وہ ارادہ جو اس کو حاصل ہوا ہے اپنے نفس کے ارادے کے مقابلے میں وہ ختم ہو جاتا ہے۔ سلوک کے ذریعے جو فنا حاصل ہوتی ہے تو چونکہ اس کا نفس روح سے علیحدہ ہو جاتا ہے تو ایک ایسے ارادے کی فنا حاصل ہو جاتی ہے جس میں پھر نفس واپس اس جگہ پر نہیں آسکتا تو یہ فنائے کامل ہوتی ہے۔

مختصر لفظوں میں ایک فنا ہوتی ہے جو ابتدائی جذب سے شروع میں حاصل ہوتی ہے جس میں نفس کی اصلاح ابھی نہیں ہوچکی ہوتی ہے وہ ناقص اور عارضی

ہوتی ہے اور اس پر بقا کا اطلاق نہیں ہوتا لیکن نفس کی اصلاح کے بعد نفس جب اپنی جگہ پر آتا ہے تو اس کی وجہ سے پھر انسان کو اس کو دبانے کے لئے اپنے دل کے ارادے کی ضرورت نہیں ہوتی، اس وقت کامل فنا حاصل ہو جاتی ہے اس لئے عود کا خطرہ بھی پھر نہیں ہوتا۔

بقا

اس حالت سے گزرنے کے بعد جب اللہ تعالیٰ اس کو واپس احساس لوٹا دے اور فنا کا اثر اتنا باقی رہے کہ اس کا ہر عمل فنا کے خط کشیدہ حصے سے مستفاد ہو تو یہ حالت بقا کہلاتی ہے۔ اس وقت سالک سب احکامات پر عمل کرتا ہے لیکن اس کی نسبت اپنی طرف نہیں کرتا۔ یعنی عبدیت محض اس کا خاصہ بن جاتی ہے۔

انسان کو دوام حاصل ہو جائے اللہ پاک کے احکام میں اور اطمینان حاصل ہو جائے اور تمکین حاصل ہو جائے تو یہ بھی ایک بقا ہے۔ یہ بھی اللہ پاک کا انعام ہی ہے اور دوسرا یہ کہ اللہ پاک کی طرف سے قبولیتِ تامہ نصیب ہو جائے تو یہ بھی ایک بقا کی شکل ہے۔

وحدت الوجود

اللہ تعالیٰ کی ذات کی محبت میں جب سالک خود کو اور سب کائنات کو بھول جائے اس حالت کو وحدت الوجود کہتے ہیں۔ اس حالت میں ماسویٰ اللہ کا علم بالکل نہیں ہوتا اور سالک مغلوب الحال ہوتا ہے۔ اس کو پہلے وحدت الوجود بالسکر کہتے تھے۔

وحدت الشہود

سالک کو جب اس حالت سے افاقہ ہو جاتا ہے تو اس کے اپنے بارے میں اور کائنات کے بارے میں علم واپس آجاتا ہے لیکن قلبی تعلق اس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہی ہوتا ہے اس حالت میں اس کو سب کچھ اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہوا دکھائی

دیتا ہے لیکن ہر چیز کی حقیقت اپنی اپنی جگہ پر دیکھتے ہوئے ہر حال کی رعایت کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اس کو پہلے وحدت الوجود بغیر سکر کے کہتے تھے۔

سکر

کتاب التعریفات المؤلف:علی بن محمد بن علي الزين الشريف الجرجانی کے مطابق "السکر ھو غیبة بوارِدٍ قوی وھو یعطی الطرب والالتذاذ ۔ و ھوأقوی من الغیبة وأتم منھا" یعنی قلب پر کسی وارداتِ قوی کا غلبہ ہو جانے سے غیبت کا طاری ہو جانا یہ خوشی اور لذت کی وجہ سے ہوتا ہے جبکہ سکر غیبت سے قوی تر اور مکمل ترین ہوتا ہے۔

صحو

کتاب التعریفات المؤلف:علی بن محمد بن علي الزين الشريف الجرجانی کے مطابق "الصحو: ھو رجوع العارف إلی الإحساس بعد غیبته وزوال إحساسه" یعنی کسی عارف کا غیبت کے بعد واردات قوی کے سبب احساس کی طرف لوٹنے کو صحو کہتے ہے۔

الہام

کسی کے دل میں کوئی بات القا کر دینے کو الہام کہتے ہیں۔ لیکن یہ لفظ ایسی بات کے القاء کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے جو اللہ تعالیٰ یا ملاء اعلیٰ کی جانب سے کسی کے دل میں ڈالی جاتی ہے۔ اللہ کی طرف سے انبیاء یا اولیاء کو جو اطلاع یا ہدایت روحانی طور پر دی جاتی ہے۔ اس کو الہام کہتے ہیں جیسا کہ رسول اللہ کا ارشادِ مبارک ہے: جب اللہ عزوجل کسی بندے سے بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے دین میں فقیہ بنا دیتا ہے اور رشد و ہدایت الہام فرما دیتا ہے۔ (مسند امام احمدؒ بن حنبل)

کشف

حواس خمسہ کے بغیر کسی چیز کا نظر آنا، معلوم ہونا یا کسی چیز کا ادراک ہونا۔

سیر الی اللہ

سالک جو ابتداء میں روحانی مریض ہوتا ہے، علاج کے لئے مرشد کامل کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور اس میں اطلاع و اتباع کے ذریعے سالک کی روحانی بیماریاں آہستہ آہستہ دور ہو رہی ہوتی ہیں۔یہاں تک درجہ ضرورت میں سالک کا دل ان بیماریوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ یعنی اس کے نفس کا تزکیہ ہو جاتا ہے جس کی طرف قرآن میں اشارہ ہے "قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا" یعنی بے شک جس نے نفس کو پاک کیا کامیاب رہا۔ اس کے ساتھ سالک کا قلب اخلاقِ حمیدہ سے آراستہ ہوا یعنی اس میں تواضع، اخلاص، تفویض، حبِ الٰہی و حبِ رسول اور انابت اِلی اللہ کی صفات پیدا ہوئیں اور اس میں رسوخ حاصل ہوا۔ یعنی ان صفات نے قلب میں جگہ پکڑ لی اوران کو حاصل کرنے کی تدابیر سے آگاہی ہوئی تو کہا جاتا ہے کہ اس کی سیر الی اللہ کی تکمیل ہوئی۔ اس کے بعد سالک کو علم الیقین اور فناءِ تام حاصل ہو جاتا ہے اور شیخ اس کو اکثر اجازت و خلافت دے دیتا ہے۔

سیر فی اللہ

سیر الی اللہ جو کہ تین چیزوں نفس ،قلب اور عقل کی اصلاح ہے ، مکمل ہونے کے بعد سالک خالص دین پر چلتا ہے جس کو طریق صحابہ بھی کہتے ہیں ۔ اس سے قلب کے اندر تزکیہ اور تقویٰ سے ایک خاص جلاء اور نور پیدا ہوتا ہے اور سالک برابر قلب کو ماسویٰ اللہ سے فارغ کرتا رہتا ہے تو حق تعالیٰ کی ذات و صفات اور افعال نیز حقائقِ کونیہ اور حقائقِ اعمالِ شرعیہ سالک کے دل پر منکشف ہوجاتے ہیں، جس سے اس کا خالق کے ساتھ قرب میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور وہ عین الیقین سے حق الیقین تک سفر کرتا رہتا ہے اس کو سیر فی اللہ کہتے ہیں

جس کی کوئی حد نہیں جتنا حصّہ جس نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے اپنی استعداد کے مطابق پایا وہ اس کا حصّہ ہے۔ موت تک سالک کی یہ سیر جاری رہتی ہے اور تفرید اور تجرید کے ذریعے قرب میں ترقی کرتا رہتا ہے۔ اس میں چاہے شیخ سے مرید بڑھ جائے۔ یہ بھی ممکن ہے۔ اس تمام تفصیل سے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ بعض کتابوں میں سیر فی اللہ کے بعد بھی دو سیر لکھی گئی ہیں لیکن حقیقت میں یہ سیر فی اللہ کا ہی حصّہ ہیں۔ ان کو الگ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک شیخ کی نگرانی میں سالک کے سلوک طے کرنے کا تعلق ہے وہ سیر الی اللہ ہے جس کا جاننا ضروری ہے۔ سیر فی اللہ سالک اور اللہ کے درمیان کا معاملہ ہے جس کے بارے میں ارشاد ہے۔

راز جو عاشق و معشوق کے درمیاں میں ہے
کراماً کاتبین کو بھی خبر نہیں اس کی

چاہے کسی کو اپنے جمال کے مشاہدہ میں مستغرق کر دے جو اصطلاح میں "مُسْتَھْلِکِیْن" کہلاتے ہیں یا ان کو مخلوق کی اصلاح پر مامور کر کے صفت بقاء سے متصف کر دے جو اصطلاح میں "راجعین" کہلاتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے جو بھی فیصلہ فرما دے۔ راجعین کو مرشدین بھی کہتے ہیں۔ ان کے ظاہر کو عام مخلوق سے خلط ملط کر کے ان کے ذریعے احکام شرعیہ لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔

علم الیقین

اس کی مثال ایسے ہے کہ جیسے مستند طریقوں سے کسی کو پتا چلے کہ زہر سے آدمی مرتا ہے اور آگ اشیاء کو جلاتی ہے۔

عین الیقین

اس کی مثال ایسے ہے کہ جیسے کوئی کسی چیز کو آگ سے جلتا ہوا دیکھتا ہے یا زہر سے مرتا ہوا دیکھتا ہے۔

حق الیقین

اس کی مثال ایسے ہے کہ جیسے خود پر کوئی چیز گزرتی ہے جیسے آگ سے جلا یا زہر سے مرنے لگا تو اس کے لئے وہ حق الیقین ہے۔

نفسِ بہیمی

یہ جانوروں کا نفس ہوتا ہے۔ جب کوئی انسان اپنی جبلت سے اتنا مغلوب ہو کہ شعور سے کام نہ لے تو اس وقت اس کا نفس، نفسِ بہیمی کہلائے گا۔

نفسِ انسانی

جب انسان کا شعور اس کی جبلت پر غالب آجائے اور شعور سے کام لینے لگے چاہے اچھا ہو یا برا، اس کے بعد جو ارادے کے ساتھ کرے گا اس وقت اس کا نفس، نفسِ انسانی کہلاتا ہے۔

مبداء فیض

جہاں سے فیض کی ابتدا ہوتی ہے۔

موردِ فیض

جہاں فیض کا ورود ہو رہا ہے۔

تنزل

تنزیہہ سے تشبیہ کی طرف سفر

تشبیہ

کسی چیز کو سمجھنے کے لئے کسی چیز کے ساتھ اس کی کسی صفت میں مشابہت کا ادراک

جبلت

انسان کے وہ عام اور مشترکہ جذبات، خواہشات اور رجحانات جو اسکے اپنے تخلیق کردہ نہیں ہوتے یا جنکی نشونما میں اسکا اپنا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا جو غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر انسان کی پیدائش کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔

قوتِ غضبیہ

اپنی ناپسندیدہ چیزوں کو دفع کرنے کا جذبہ

القائے رحمانی

دل میں رحمان کی طرف سے القا کا نظام جو عرفِ عام میں ضمیر کہلاتا ہے۔

القائے شیطانی

دل میں شیطان کی طرف سے وساوس ڈالنے کا نظام۔

لطائف ستہ

قلب، روح، سِرّ، خفی، اخفاء اور نفس

لطائف خمسہ

قلب، نفس، عقل، روح اور سِرّ

حال

دو معنوں میں بولا جاتا ہے۔ کسی عمل کا روحانی قوت سے لبریز ہونا اور دوسرا کوئی عارضی کیفیت

کیفیت

کوئی کسی وقت جیسا محسوس کرتا ہے۔

مقام

وہ جو کسبی طور پر ایک دیرپا باطنی حالت حاصل کی جاتی ہے۔

مکتسب

جس کو کسبی طور پر حاصل کیا جائے۔

وہبی

اللہ تعالیٰ کے فضل سے عطا ہونے والی

داعیہ

باطن میں کسی کام کے لئے محرک جذبہ

دواعی

داعیہ کی جمع

صدق

ایک مقام ہے جس کے مطابق قولاً فعلاً اور حالاً سالک سچ پر قائم ہو جائے۔

وجد

کسی اچھے اندرونی جذبے سے جوارح کا بے قابو ہو جانا۔

صبر

کسی مطلوبہ حالت پر خود کو برقرار رکھنے کی استطاعت کا مقام

توکل

اللہ تعالیٰ پر بھروسے کا مقام

تقویٰ

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرنے کا مقام

ہمت

اپنی توجہ سے کسی شاگرد یا مرید کو کسی مطلوبہ حال پر لانے کی استعداد۔

تجلی

کسی شئے کے دوسرے یا تیسرے یا چوتھے یا جہاں تک اللہ چاہے، مرتبے میں ظاہر ہونے کو تجلی کہتے ہیں

تجلی صوری

جب سالک اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کی موجودگی پر یقین ہونے کی وجہ سے اس کا خیال اللہ تعالیٰ کی طرف جاتا ہے تو قوتِ مدرکہ اور قوتِ واہمہ ایک ایسی وہمی صورت تراشتا ہے کہ جس میں شکل و رنگ اور جہت نہیں ہوتی لیکن یقین کیلئے ایک صورت بناتا اور درست کرتا ہے تاکہ اس کی شرح و تفصیل پیش کرے اور بعض اذہان میں یہ یقین صرف صورتِ خیالیہ کی شکل میں پھیل جاتا ہے۔ اور اس کو تجلی صوری کہتے ہیں۔

قوتِ واہمہ

خیال کی قوت جس سے انسان تصور قائم کر سکتا ہے۔

قوتِ مدرکہ

وہ قوت جس سے اشیاء و احوال کا ادراک حاصل ہوتا ہے

اعتبار

حقائق کے باہمی تعلق سے حقائق کا سمجھ میں آنا اعتبار کہلاتا ہے۔

عالمِ مثال

یہ ایک عالم ہے جو عالمِ ارواح اور اجسام کے درمیان ہے۔ جو کچھ عالم اجسام میں موجود ہے اس کی نظیر عالمِ مثال میں موجود ہے۔

حاسّہ

جس ذریعے سے کسی مدرک کا ادراک ہوتا ہے وہ اس کا حاسہ ہوتا ہے۔

مستہلک

فانی

لاہوت

مقامِ محویت یا مقامِ فنا، یہ جہات و حدود سے منزہ ہے

ناسوت

اجسام و محسوسات کی دنیا

ملکوت

فرشتوں اورنفوس و ارواح کی دنیا

جبروت

آسمانی دنیا ستاروں سے اوپر کا مقام

ہمہ اوست

وحدت الوجود کی صورت

خاطر

خیال جو دل پر چھا جائے۔

ہاجس

دل میں گزرنے والا خیال

احادیث نفس

نفس کی باتیں یعنی نفس کی خواہشات پر مبنی خیالات

ہیئت وحدانی

تمام لطائف بمع پورا جسم ہیئت وحدانی کہلاتا ہے۔

اصطلاحاتِ نقشبندیہ

رابطہ شیخ

نقشبندی طریقے کے پرانے اسلوب کے تحت ہر وقت ہر جگہ قلب میں تصور شیخ کے ذریعے شیخ طریقت سے اپنا رابطہ قائم رکھنا رابطہ شیخ کہلاتا ہے۔ اس کو تصور شیخ بھی کہتے ہیں۔

ہوش در دم

یہ اصل میں پاس انفاس ہی ہے۔ یہ کہ سالک کا ہر سانس حضور و آگاہی یعنی ہر دم ہوش میں ہو تاکہ کوئی سانس غفلت و معصیت میں نہ گزرے اور ہر وقت سانس کی حفاظت کرے تاکہ رابطہ ٹوٹنے نہ پائے اور وابستگی قائم رہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ہوشیار وہ شخص ہے کہ جس نے اپنے نفس کو ڈرایا۔ حضرت خواجہ نقشبند بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ کسی سانس کو ضائع نہ

ہونے دیں۔ یعنی سانس کے دخول و خروج اور خروج و دخول کے درمیان محافظت درکار ہے کہ کوئی سانس غفلت میں نہ گزرے۔ اگر غفلت محسوس کرے تو استغفار کرے اور آئندہ غفلت ترک کرنے کا ارادہ کرے۔ کیونکہ اسی غفلت کے سبب انسان معاصی کا مرتکب ہوتا ہے۔ ہوش دردم تفرقہ اندرونی کیلئے ہے۔

نظر بر قدم

یعنی نظر کی حفاظت کرنا۔ اس کے لئے اپنی نگاہ اپنے پاؤں کی طرف رکھنا۔ کیونکہ نیچی نظر رکھنا سنتِ رسول ﷺ ہے اور اس میں دل کی حفاظت ہے کیونکہ نظر دل کا دروازہ ہے غلط جگہ نظر پڑنے سے دل متاثر ہو سکتا ہے۔

سفر در وطن

سفر در وطن کے معنی ہیں "اپنے باطن میں سفر کرنا"۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنی بشری صفات سے ملکی صفات کی طرف بتدریج لوٹے اور روح جو بشریت کے جامے میں آکر صفاتِ ذمیمہ کا شکار ہوگئی ہے اس کو صفاتِ حمیدہ سے ہمکنار کرتا رہے۔ یعنی طلبِ جاہ، بغض، حسد، کینہ وغیرہ کو دل سے نکال باہر پھینک کر اور اپنے دل کو اُن سے بالکل پاک کر کے صفاتِ حمیدہ کی طرف انتقال کرنا ہے یہی وہ جگہ ہے جو مجاذیب متمکن کے سمجھنے کی ہے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ روح نفس کی وجہ سے صفاتِ ذمیمہ کا شکار ہوگئی ہے پس نفس کا زور جب تک جاری رہے گا تو صفاتِ ذمیمہ سے خلاصی کیسے ہوگی؟ جذب کی وجہ سے مقامِ قلب میں اگر کوئی آجائے تو اس کو اپنے محبوبِ اصلی کا پسندیدہ طریقہ نظر تو آئے گا لیکن اس محبوبِ اصلی کے عرفی وصال میں اخلاقِ ذمیمہ کا جو پہاڑ حائل ہے اس کو سر کیے بغیر کامیابی کیسے ممکن ہے؟ اسی کے لئے حضرت مجدد صاحبؒ نے سلوک کے دس مقامات طے کرنا بتایا ہے۔ صرف قلبی اسباق سے ایسا حاصل ہونا کیسے ممکن ہے؟

خلوت در انجمن

خلوت در انجمن کا مطلب یہ ہے کہ ہر وقت دل سے خدا کے ساتھ مشغول رہے چاہے خلوت ہو چاہے جلوت۔ اور اپنے تمام روزمرہ کے مشاغل مثلاً اکل و شرب، نشست و برخاست، معاملات، فہم و ادراک وغیرہ پر اللہ جل شانہٗ کے ساتھ تعلق کو قائم رکھے۔ خواجہ خواجگان حضرت شاہ نقشبند بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خلوت در انجمن ظاہر میں خلق کے ساتھ اور باطن میں حق کے ساتھ ہونا ہے۔ دوسرے لفظوں میں مخلوق میں حق کے لئے مخلوق کے حقوق کی ادائیگی کے لئے جب ہونا ہو تو اس وقت بھی دل حق کی طرف مکمل متوجہ ہو۔

یاد کرد

یاد کرد ذکر اور گیان کے ہم معنی ہے۔ مراد یہ ہے کہ اپنے شیخ سے سیکھے ہوئے ذکر بروقت ادا کرنا ہے ذکر اس کثرت سے کرے کہ اللہ جل شانہٗ کی حضوری حاصل ہو جائے۔

باز گشت

یعنی رجوع کرنا یا پھرنا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے ذکر کے بعد تین بار یا پانچ بار مناجات کی طرف رجوع کرے حضرت شاہ نقشبند قدس سرہٗ کی یہ دعا تھی۔ "الٰہی مقصود من توئی و رضائے تو، محبت و مغفرتِ خود بدہ"۔ اے اللہ میرا مقصود تو ہی ہے اور اپنی خوشنودی اپنی محبت اور مغفرت عطا کر۔ حضرت شاہ نقشبند قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ جو کچھ دیکھا سنا جائے اور جانا جائے وہ سب غیر خدا ہے کلمہ طیبہ کی "لا" سے سب کی نفی کرنی چاہئے۔

نگہداشت

اس سے یہ مراد ہے کہ ذاکر اپنے قلب کے بارے میں خبر رکھے اور کمال ہوشمندی سے رہے اور جو وساوس و خیالات غیر خدا کے دل میں آئیں، اُن کا

ابتدا ہی سے تدارک کرے ورنہ طبیعت کا اس طرف مائل ہونے کا خطرہ ہے پھر نجات مشکل ہوسکتی ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خطرہ کو ایک ساعت بھی دل میں نہ رکھنا چاہئے۔ بزرگوں کے نزدیک یہ بہت اہم ہے۔ اولیاء کاملین کو یہ دولت طویل عرصہ تک حاصل رہتی ہے۔

یاداشت

یہ فکر اور دھیان کے ہم معنی ہے اور اس سے مراد دوام آگاہی بحق سبحانہٗ و تعالیٰ ہے۔ یہ نگہداشت جس میں طالب اپنی کوشش سے اللہ تعالیٰ کی طرف مشغول رہتا ہے، اس کا نتیجہ اور اگلہ مرحلہ وہ ہے جس میں سالک خودبخود اللہ تعالیٰ کی طرف مشغول و مخاطب ہوتا ہے اور یہ مقام منتہی کو فنا و بقا کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اس کے بعد چاہے جیسی بھی حالت ہو اس سے متاثر ہوکر سالک اپنے محبوبِ حقیقی سے غافل نہیں ہوتا۔

وقوفِ زمانی

یہ نفس کے محاسبہ کے لئے ہے کہ دیکھا جائے کہ کس طرف جارہاہے تاکہ اگر غلط سمت میں جارہا ہو تو اس کو درست کرنے کی تدبیر فی الفور کی جائے۔ عام طور پر یہ متوسط کے لئے ہوتاہے۔

وقوفِ عددی

وقوفِ عددی سے مراد سالک کا اثنائے ذکر اس بات کا اہتمام کرنا کہ طاق عدد پر کرے نہ کہ جفت عدد پر۔ کیونکہ إِنَّ اللّٰهَ وِترٌ يُحِبُّ الْوِتْرَ۔ (رواه أبو داود والترمذی) لیکن ذکرِ عددی کے ساتھ ذکرِ قلبی بھی ضروری ہے۔

وقوفِ قلبی

اس سے مراد یہ ہے کہ سالک ہر وقت ہر لحظہ اپنے قلب کی طرف متوجہ رہے اور قلب خدا کی طرف متوجہ رہے۔ تاکہ سب طرف سے توجہ ٹوٹ کر

معبودِ حقیقی کی طرف ہو جائے اور وساوس و خطرات دل میں داخل ہی نہ ہونے پائیں۔ خصوصاً جلسہ ذکر کے دوران اُس کا پورا خیال رکھے۔ یہاں زندگی کو پیش آنے والے مختلف مراحل میں خدا کے پسندیدہ و ناپسندیدہ کام کا سوال بھی سامنے آتا ہے۔ گویا ہر پیش آنے والے امر پر یہ فیصلہ کرے کہ یہ کام خدا کو ناپسند ہے اس لئے مجھے اس کا ترک کرنا ضروری ہے اور اس میں خدا کی پسندیدہ صورت یہ ہے جس پر کاربند ہونا میرے لئے لازمی ہے بس اسی کا نام وقوفِ قلبی ہے۔ وقوفِ قلبی شاہ نقشبند بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بہت ضروری ہے اور یہ رکنِ عظیم ہے۔ طریقہ سلسلہ نقشبندیہ کا دارومدار اسی پر ہے۔

تربیت کا انحصار تین چیزوں کی اصلاح پر

انسان کے کردار کا انحصار تین چیزوں پر ہے، نفس، دل اور عقل۔ ان میں اعتدال ہو تو کردار اچھا ہے ورنہ جتنی بے اعتدالی ہوگی اتنی خرابی ہوگی۔ ان تینوں میں بے اعتدالی کو اعتدال پر لانا ہر شخص کے لئے ضروری ہے۔ وہ طور طریقے جن کے استعمال سے کسی شخص کا کردار اللہ تعالیٰ کا مقبول کردار بن جائے اسی کو طریقت کہتے ہیں۔

ان تینوں کی اصلاح کے لئے مختلف طریقے مختلف سلاسل میں رائج ہیں جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ بنیادی بات سلوک کا طے کرنا ہے۔ کچھ حضرات اس کو ابتدا ہی میں طے کراتے ہیں کچھ اس کے لئے پہلے جذب کسبی حاصل کرتے ہیں۔

مقامات سلوک

توبہ، انابت، ریاضت، قناعت، تقویٰ، زہد، صبر، توکل، تسلیم اور رضا یہ وہ دس مقامات ہیں جن کا تفصیل کے ساتھ طے کرنا حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نزدیک ہر سالک کے لئے لازمی ہیں۔ اس میں توبہ تو رجوع الی اللہ کی ابتدا اور گناہوں سے رکنا ہے، انابت خیر کے اعمال کی طرف میلان کا بڑھانا ہے۔ اس کے

لئے ریاضت سے جسم کو مشقتوں کا عادی بنانا ہے۔ یہ مقام ریاضت ہے اور قناعت سے دنیا کی طرف میلان کم کرانا ہے جو مقام قناعت ہے پھر زہد سے اس پر نفس کو عمل کرانا ہے۔ یہ مقام زہد ہے۔ تقویٰ ان سب کا لازمی نتیجہ ہے لیکن اس کا عملی نفاذ کرانا ایک الگ شعبہ اور مقام یعنی مقام تقویٰ ہے۔ تقویٰ جب حاصل ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ انہونی میں ہونا دکھاتا ہے جس سے توکل کو فروغ ہوتا ہے جو مقام توکل ہے۔ اس کے بعد سالک سب کچھ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تشریعی ہو یا تکوینی تسلیم کرلیتا ہے، اسی کو مقامِ تسلیم کہتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ صبر ہے جو پورے دین کی جان ہے۔ یہی مقامِ صبر ہے۔ اس کے بعد انسان صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ سے قلباً قالباً قالاً اور حالاً راضی ہوتا ہے جس کو مقام رضا کہتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جس کے بعد فی الحقیقت تو آخرت میں اور بشارتاً اس دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوجاتے ہیں گویا کہ یٰاَیَّتُهَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّةُ ۝ ارۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرۡضِیَّةً ۝ فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبٰدِیۡ ۝ وَادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ ۝ (سورۃ الفجر:27تا30) اسی کو نفس مطمئنہ کا مقام کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نصیب فرمائے۔ اس سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اصل مقامات کیا ہیں اور دعوے کیا ہیں۔ ان میں سے کونسی چیز ہے جو مراقبہ کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے۔ مثلاً مقام رضا ہی کو لیجئے جو کہ آخری مقام ہے۔ اس میں ایک تو اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کی سوچ ہے اور ایک راضی ہونا ہے۔ یہ سوچ جو ہے راضی ہونے کی اہمیت کے علم اور نفس کے اس پر راضی ہونے کے درمیان کی حالت ہے۔ یہ درمیان کی حالت تو بیشک کوئی مراقبہ کے ساتھ حاصل کرسکتا ہے جو کہ جذب کسبی میں حاصل ہو جاتی ہے لیکن نفس کا اس پر راضی ہونا یہ نفس کی تربیت و اصلاح کے بعد ہی ممکن ہے جس کے لئے سلوک کا طے کرنا لازم ہے۔ اسی پر حضرت مجدد صاحب ؒ نے مکتوب نمبر287 میں زور دیا ہے۔ جب یہ دس مقامات طے ہوجائیں تو امید کی جاسکتی ہے کہ نفس نے ماننا سیکھ لیا دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوا اور عقل کو بات سمجھ آگئی۔

جب یہ تین چیزیں نفس، قلب اور عقل درست ہوجائیں تو سیر الی اللہ مکمل

ہوجاتا ہے اور سیر فی اللہ شروع ہوا۔ اس سے پہلے نفس نے روح کو جکڑا ہوتا ہے اور نفسانی خواہشات انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتیں اپنے میں مگن رکھتی ہیں اس لئے جیسے ہی نفس سے روح آزاد ہوجاتی ہے تو یہ رکاوٹ دور ہوجاتی ہے اور روح ملاء اعلیٰ جاکر اللہ تعالیٰ کا روحانی مشاہدہ شروع کر لیتی ہے یہ کیفیتِ احسان کا ابتدائی درجہ ہوتا ہے۔ سالک جتنا جتنا اپنے ارادے سے غیر سے اپنے آپ کو جتنا جتنا یکسو کرتا رہتا ہے اتنی اتنی اس کی کیفیتِ احسان میں ترقی ہوتی ہے۔ اس وقت قلب روح کے ذریعے لیتا ہے اور نفس مطمئنہ کے ذریعے اپنے آپ پر نافذ کرتا ہے اور عبادت میں نفس کو مشغول کردیتا ہے اور باقی اوقات میں اس سے کیفیتِ حضوری حاصل ہوتی ہے۔ جس وقت عقل قلب کی ایمانی کیفیت سے منور اور ایمانی اخبار سے مغلوب ہو جاتی ہے تو اس کا بھی عالم بالا کے ساتھ تعلق ہوجاتا ہے۔ اس وقت اس تعلق کی بنیاد پر اس کے مناسب حقائق کھلتے ہیں اور مکاشفات ہوتے ہیں اس وقت یہ سِر کہلاتا ہے۔ جس کے ذریعے اس کا عقل سِر بن جاتا ہے اور اس کے ذریعے حقیقت اور فقاہت تک رسائی حاصل ہوجاتی ہے جس سے ہدایت اور معرفت کا راستہ ہموار ہوجاتا ہے۔ پس اسی سے تقویٰ میں ترقی ہورہی ہوتی ہے جس کی کوئی انتہاء نہیں پھر جیسے شاہ ولی اللہؒ نے فرمایا ہے کہ جس کے دل کی صفائی زیادہ ہو وہ صدیقین میں ہوجاتا ہے اور جس کی عقل میں صفائی زیادہ ہو وہ علمائے راسخین میں ہوجاتا ہے اور جس کے نفس میں صفائی زیادہ ہوتی ہے وہ زہاد میں شامل ہوجاتا ہے۔ اس طرح یہ سب حضرات گو منتہی کہلاتے ہیں لیکن ان کی تشکیل اپنی اپنی ہوتی ہے۔

اس درجے میں پختگی کی حالت میں مجاہدہ اور مشاہدہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں تو ایسے حضرات میں بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ہر لحہ مجاہدہ بھی ہوتا ہے لیکن ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ بھی ہو رہا ہوتا ہے کیونکہ ان کی جو نفس کی رکاوٹ ہوتی ہے وہ بالکل ختم ہوچکی ہوتی ہے لیکن ظاہر ہے اعمال تو نفس کے ذریعے ہوتے ہیں اور نفس کی اپنی فطرت جو ہے کہ وہ آرام ہی چاہتا ہے تو جس قدر بھی مجاہدہ ہو رہا ہوتا ہے اسی لمحے ان کا اتنا ہی مشاہدہ ہو رہا ہوتا ہے تو یہ دونوں چیزیں

ساتھ ساتھ چلتی ہیں البتہ جو ناپختہ لوگ ہوتے ہیں ان میں ہوسکتا ہے کہ دو طرح کے لوگ ہوں ایک یہ کہ جس میں مجاہدہ ہی نہ ہو اور دوسرا وہ جس میں مجاہدہ ہو لیکن مشاہدہ نہ ہو اور وہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ جو نفس ہے اس میں سے اعمال کا کچھ حصہ اپنے لئے رکھ لیتا ہے یا اپنے اوپر نظر چلی جاتی ہے تو جو کیفیت للّٰہیت ہے جو اس کے ساتھ مقصود ہے وہ نہیں ہوتی ہے اس وجہ سے مجاہدے کا کچھ حصہ بغیر مشاہدے کے ضائع ہوجاتا ہے تو اس میں یہ کافی باریک نکتہ ہے۔

ایک اہم بات

اس نظام تربیت میں یہ بات سب سے اہم ہے کہ ان تینوں کی اصلاح ہو تو سب کی اصلاح مکمل ہوگی ورنہ کسی کی بھی نہیں ہوگی۔

صرف نفس کی اصلاح پر نظر رکھنا

اگر صرف نفس کی اصلاح پر نظر ہو اور اس کے علاج کے لئے مجاہدات جو اس کا قدرتی علاج ہے کرتے ہوئے دل اور عقل کی اصلاح سے غفلت ہوجائے تو یہ مجاہدات جوگ کا روپ دھار لیتے ہیں جس کی وجہ سے اس کو جوگی کی صورت میں بزرگی کی بیماری لاحق ہوجاتی ہے۔ لوگ بھی ان کی محنت شاقہ کو دیکھ کر ان کے معتقد ہوتے ہیں۔ عقل کی اصلاح نہ ہونے کی وجہ سے غلط سلط فلسفے بھی جھاڑنا شروع کرلیتا ہے۔ شیطان اس کے دل پر قبضہ کرلیتا ہے اور بعض دفعہ ایمان کو بھی خطرہ لاحق ہوجاتا ہے۔ کسی ایک دینی لائن میں مجاہدہ کی صورت میں اس لائن کی اہمیت ذہن میں ضرورت سے زیادہ بیٹھ جاتی ہے اور صرف اسی کے ہوکر باقی دینی کاموں کی مخالفت بھی شروع کرلیتا ہے۔ چونکہ عقل پہلے سے گمراہ ہوتی ہے اس لئے اپنی گمراہی کے لئے جو مستدل ضعیف روایتیں ملیں چاہیں ضعیف احادیث ہوں چاہے خواب ہوں چاہے کشف ان کی بنیاد پر قرآن اور سنت کے روشن دلائل کو پس پشت رکھ کر جیتا جاگتا فتنہ بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے سب کو امان میں رکھے۔ اگر ایسا نہ ہو تو مندرجہ ذیل نتائج سامنے آسکتے ہیں۔

اگر صرف دل کی اصلاح ہو تو

اس صورت میں جب سالک کافی آگے چلا جاتا ہے تو نفس کی اصلاح بالکل بھول جاتا ہے۔ اپنے نفس کی اصلاح بھی ذکر، اذکار اور مراقبات کے ذریعے کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے ان کی افادیت سے تو انکار نہیں لیکن ہر چیز کا اپنا دائرہ کار ہوتا ہے اس کی اپنے دائرہ کار میں افادیت کو دیکھ کر اگر اس کو کسی دوسرے دائرہ کار میں استعمال کیا جائے تو سوائے ناکامی کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا کیونکہ یہ ایسا ہوگا جیسے آنکھ سے کوئی سننے کی کوشش کرے۔ یہ جو علاجی فاعلات ہیں یہ تو دل بیدار کرنے کے لئے ہیں اور دل جب بیدار ہوجائے تو اس کے ذریعے نفس کو اصلاح کے لئے آمادہ کرنا ہوتا ہے کیونکہ اس وقت وہ آسانی کے ساتھ آمادہ ہوسکتا ہے اور جب وہ اپنی اصلاح کے ڈگر پر چلنے لگتا ہے یعنی سلوک کے دس مقامات طے کرنے پر تو نفس کی اصلاح ہونے لگتی ہے۔ اس میں ہر مقام دوسرے مقام کے لئے بنیاد بنتا ہے۔ اگرچہ صلاحیتیں اور احوال ہر سالک کے مختلف ہوتے ہیں اس لئے ان کی ضرورت کا درجہ ہر ایک کے لئے مختلف ہوتا ہے لیکن گزرنا سارے مقامات سے ضروری ہے تاکہ نفس کی رکاوٹ پر قابو پایا جاسکے۔ اگر کوئی ایسا نہیں کرتا اور دل کی اصلاح کو ہی کافی سمجھ لے تو ایسے حضرات کو حضرت مجدد الف ثانیؒ مجذوب متمکن فرماتے ہیں۔ اور مزید یہ فرماتے ہیں کہ نہ یہ خود پہنچے ہیں نہ دوسروں کو پہنچا سکتے ہیں۔

اگر صرف عقل کی اصلاح ہو تو

اگر چہ اہل حق کے ہاں سلوک طے کرنے میں اس کا کوئی ذکر ایسا نہیں آیا ہے کہ کوئی صرف عقل کی اصلاح کرتا ہو لیکن فلسفیانہ تصوف جس کو بعض حضرات صحیح تصوف سمجھتے ہیں ان کے ہاں یہ ہی ہوتا ہے۔ ایسے حضرات باقی سب لوگوں کو بے وقوف سمجھتے ہیں اور خود کو عقل کل۔ ان کے کچھ نام نہاد مراقبات ہوتے ہیں جس میں اپنے اوہام اور خیالات کو پالتے رہتے ہیں۔ ان پر پہلے فلسفہ کا رنگ چڑھا ہوتا تھا اب آج کل سائنس کا دم بھرتے ہیں حالانکہ یہ بات طے ہے

کہ سائنس ایک تدریجی ترقی پذیر علم ہے اور قرآن و سنت خالق حقیقی کی طرف سے بھیجا گیا علم ہے۔ اس لئے سائنس بتدریج ان چیزوں کو ثابت کرتی رہے گی جو مذہب نے سکھائی ہیں لیکن جہاں تک نہیں پہنچا اس میں اس سے رہنمائی لینے میں خسارے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس کا رول ایک خادم کا ہے۔ اس کو جو دین کا مخدوم بنائے گا اس نے نہ دین کو سمجھا نہ سائنس کو۔ اس لئے صرف عقل کی اصلاح کا دم بھرنے والے چونکہ اپنے نفس کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں اور صرف گہری گہری باتیں کرنے کو ہی کافی سمجھتے ہیں۔ مثلاً آج کل ایک اس قسم کے متفکر کی بات میں نے سنی کہ تقریر کر رہے ہیں کہ جب تک اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ترجیح نہیں دو گے اس وقت تک مسائل حل نہیں ہو سکتے تھے اس پر دلائل پر زور جاری تھے لیکن کلین شیو، جسم پر شریعت کا کوئی نشان نہیں، نماز کی پرواہ نہیں، عملیات کا بازار گرم اور یہی بات اکثر لوگ چاہتے ہیں۔ لوگ نفس کی آزادی چاہتے ہیں۔ باتوں کی حد تک بعض ہندو بھی آپ ﷺ کی محبت میں نعتیں لکھتے ہیں لیکن کیا اس سے ان کی آخرت میں نجات ہو گی؟

سلوک کا مجاہدہ

سلوک میں مقامات کے طے کرنے میں مجاہدہ کی ضرورت تو پڑتی ہے کیونکہ نفس نے روح کو باندھا ہوتا ہے۔ نفس سے یہ خود بخود آزاد نہیں ہو سکتی الا ماشاءاللہ۔ شاہ ابوسعید ؒ کا واقعہ کافی مشہور ہے وہ جسمانی مجاہدہ تھا لیکن مجاہدے کی کئی قسمیں ہیں۔ اس میں ایک قسم نفسیاتی مجاہدے کی ہے جو جسمانی مجاہدے سے بھی زیادہ مشکل ہوتا ہے جیسا کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کا جو واقعہ ہے کہ آپ حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تھے۔ حضرتؒ اُن کو فصوص الحکم کا درس دے رہے تھے۔ حضرت ؒ کا نسخہ پرانا تھا تو خواجہ صاحب کی زبان سے نکلا حضرت میرے پاس ایک نیا نسخہ آیا ہے تو کیا میں وہ نیا نسخہ لے آؤں یہ پرانا ہو چکا ہے۔ تو حضرت نے ذرا بے دھیانی سے فرما دیا ہاں آپ کا نسخہ تو اچھا ہی ہوتا ہے۔ بس اِس طرح فرما دیا اور آگے درس جاری رکھا۔ تو جو

صاحبزادے تھے وہ سمجھ گئے کیونکہ وہ تو مزاج شناس تھے تو انہوں نے کہا کہ خواجہ صاحب کچھ پتہ ہے کہ یہ کیا ہوا ہے؟کہتے ہیں نہیں، کہتے ہیں یہ حضرت کے ناگواری کے الفاظ ہیں۔ اب اُن کو احساس ہوگیا سمجھ میں بات آگئی۔ انہوں نے فوراً معافی مانگ لی پھر بھی کام نہیں ہوا۔ پھر معافی مانگی پھر بھی کام نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ ہوتے ہوتے رونا شروع کر لیا پھر بھی کام نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ اُن کے جوتے سر پر رکھ کر رونا شروع کر لیا معافیاں مانگی پھر بھی کام نہیں ہوا جب بہت زیادہ رونا شروع کر لیا اور خوار و خجل ہوگئے تو صاحبزادے نے سفارش کی کہ حضرت اب تو میرے خیال میں اِن کو معاف کرنا چاہیے کوئی بات نہیں تو معافی ہوگئی اور حضرتؒ نے اُن کی سفارش پر معاف کر دیا اور ساتھ ہی اجازت بھی دے دی اور فرمایا یہ آپ کی تکمیل کے لئے تھا۔ مفتی محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ آخری دن اُن کی اتنی دھنائی ہوئی اتنی دھنائی ہوئی باتوں باتوں میں اور یہ حالت ہوئی کہ کہتے ہیں مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی اور میں سمجھا کہ مجھ سے تو یہ کیڑے بھی اچھے ہیں۔ میری کیا حالت ہے اور اپنے آپ سے مجھے گھن آنے لگی۔ تو کہتے ہیں کہ کچھ دیر کے بعد حضرت کا خادم آیا کہ حضرت آپ کو بلا رہے ہیں کہتے ہیں یہ سن کر میری تو جان نکل گئی کہ اب پتا نہیں کیا ہو گا؟ تو ڈرتے ڈرتے میں حضرتؒ کے پاس گیا تو حضرتؒ نے فرمایا کہ مجھے اپنے مشائخ سے جو اجازت پہنچی ہے جو امانت پہنچی ہے میں اللہ پر توکل کر کے آپ کو اجازت دیتا ہوں تو کہتے ہیں میرے پیروں سے جان نکل گئی کہ یا وہ حالت یا یہ حالت تو ظاہر ہے وہ مجاہدہ تھا تو مجاہدہ کی قسمیں ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے ہر ایک کا ایک جیسا مجاہدہ تو نہیں ہوتا بلکہ جس کو آپ مجاہدہ سمجھتے ہوں وہ مجاہدہ ہی نہیں ہو گا۔ اِس قسم کی یہ جو طریقے ہوتے ہیں وہ ہمارے مشائخ نے بہت ایجاد کیے ہوئے ہیں۔ بہت سارے طریقے مجاہدے کے ہیں جس سے وہ سلوک طے کرا دیتے ہیں لہٰذا اِس کی detail میں نہیں جانا چاہیے نہ اِس پر زیادہ بحث کرنا چاہیے یہ ہمارا میدان نہیں ہے یہ شیخ کی صوابدید پر ہے۔ ہاں بہرحال سلوک طے کرنا لازم ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کا سلوک طے کرا دے۔

حاصلِ تصوف

حضرت حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"وہ ذرا سی بات جو حاصل ہے تصوف کا، یہ ہے کہ جس طاعت میں سستی محسوس ہو، سستی کا مقابلہ کر کے اس طاعت کو کرے، اور جس گناہ کا تقاضا ہو، تقاضے کا مقابلہ کر کے اس گناہ سے بچے، جس کو یہ بات حاصل ہوگئی اس کو پھر کچھ بھی ضرورت نہیں کیونکہ یہی بات تعلق مع اللہ پیدا کرنے والی ہے اور یہی اس کی محافظ ہے اور یہی اس کو بڑھانے والی ہے۔"

صحبتِ صالحین کے فائدے

سورۃ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے جو دعا تلقین فرمائی ہے اس میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ" اس میں ہم اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں سیدھا راستہ عنایت فرما۔ راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے انعام کیا ہے نہ کہ ان لوگوں کا راستہ جن پر تیرا غصّہ ہے اور نہ ان کا جو گمراہ ہوچکے ہیں۔ انعام کن لوگوں پر ہو چکا ہے ان کے بارے میں ارشاد ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو انبیاء ہیں، صدّیقین ہیں، شہداء ہیں اور صالحین ہیں۔ نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے اور باقی تینوں ہر زمانے میں موجود رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں "كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ" یعنی صادقین کے ساتھ ہوجاؤ۔ (سورۃ توبہ:119) صادقین کے ساتھ ہونے کا چونکہ حکمِ الٰہی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ قیامت تک صادقین پیدا کرتے رہیں گے۔ شہداء بھی ہر دور میں ہیں اور صالحین بھی۔ صرف کتاب کے ذریعے حق اور باطل کا واضح ہونا بھی بہت مشکل ہے۔ اگر یہ واضح ہو بھی جائے تو عمل کی توفیق اکثر تب ملتی ہے جب صالحین کی صحبت میسر ہو کیونکہ انسان پر صحبت کا اثر لازم ہے۔ ایک حدیث شریف ہے کہ بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر والدین اس کو یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں۔ اس لئے صالحین کی صحبت کے حاصل

کرنے پر بہت زور ہے اور اس کے بالمقابل صحبتِ بد سے بچنے کی تلقین بھی کی گئی ہے۔ بقول مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ

یک ساعت در صحبتے با اولیاء　　بہتر از صد سالہ طاعتِ بے ریاء
صد سالہ بے ریا کی جو طاعت ہے، سے بہتر　　صحبت میں اولیاء کی ایک ساعت بنے اکثر

صحبتِ صالح کی مثال عطار کی دی گئی ہے کہ اور کچھ نہ ہو تو بھی عطر کی خوشبو تو نصیب ہو ہی جاتی ہے۔ اور صحبتِ بد کی مثال لوہار کی دکان سے دی گئی ہے کہ اور کچھ نہ بھی ہو تو دھواں تو پریشان کرتا ہی ہے۔ اس لئے انسان کو ہمیشہ اپنی صحبت کا خیال رکھنا چاہیے نہیں تو نتیجہ بہت خراب ہو سکتا ہے۔ بقول مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ

صحبتِ صالح ترا صالح کند　　صحبتِ طالح ترا طالح کند
صحبتِ صالح سے تو صالح بنے　　صحبتِ طالح سے تو طالح بنے

جو شخص خدا تعالیٰ کی ہم نشینی کا طالب ہو تو اس کو اولیاء کرام کی صحبت میں بیٹھنا چاہئے۔ صحبتِ نیکاں کے متعلق یہ غزل بہت عجیب اور مناسب ہے جو شیخ سعدی کے مشہور قطعہ گلے خوشبوئے در حمام روزے۔۔۔ کا ترجمہ ہے۔

اک دن ملی حمام میں مٹی اک خوشبودار
محبوب کے ہاتھوں سے نرم نرم مزیدار

پوچھا کہ کیا تو مشک ہے عنبر ہے بتا دے
خوشبو سے تری دل مرا بس مست ہے سرشار

وہ کہہ اٹھی ناچیز ہوں مٹی ہی ہوں فقط
مدت سے ایک پھول کی صحبت ہے اختیار

مٹی ہی ہوں کچھ بھی نہیں جو بھی ہوں وہی ہوں
ہیں مجھ پہ ہم نشین کے جمال کے آثار

شبیر نے صحبتِ صالحین کے لئے یہ
سعدی کے بیاض سے ہیں چن لئے کیا خوب اشعار

ضرورتِ شیخ

جیسا کہ بتایا گیا کہ نیک ہونے کے لئے نیکوں کی صحبت ضروری ہے۔ یہ ایک عام بات ہے جس کو ہر ایک جانتا ہے۔ لیکن باقاعدہ تربیت کے لئے کسی ایک نیک شخص کے ساتھ جس کو تربیت کا فن بھی آتا ہو اور اس کی صحبت میں برکت بھی ہو، تعلق ہونا ضروری ہوتا ہے۔ عادت اللہ یوں ہی جاری ہے کہ کوئی کمال استاد سے سیکھے بغیر حاصل نہیں ہوتا پس جب اس راہِ طریقت میں آنے کی توفیق ہو تو استادِ طریق کو ضرور تلاش کرنا چاہئے۔ جس کے فیض، تعلیم، برکت و صحبت سے مقصودِ حقیقی تک پہنچے گا۔

سفر عشق پہ جانا نہیں رہبر کے بغیر
جو چلا عمر گزاری عشق کے اثر کے بغیر

چنانچہ حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں کہ

"بھلا نری کتابوں سے بھی کوئی کامل مکمل ہوا ہے۔ موٹی بات ہے کہ بڑھئی کے پاس بیٹھے بغیر کوئی بڑھئی نہیں بن سکتا۔ حتیٰ کے بسولہ بھی بطور خود ہاتھ میں لے کر اٹھائے گا تو وہ بھی قاعدہ سے نہ اٹھایا جا سکے گا۔ بلا درزی کے پاس بیٹھے سوئی پکڑنے کا انداز بھی نہیں آتا۔ بلا خوشنویس کے پاس بیٹھے اور بلا قلم کی گرفت اور کشش دیکھے ہرگز کوئی خوش نویس نہیں بن سکتا۔ ایسی ہستی اگر کسی کو میسر ہو تو اس کو اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت سمجھ کر ان سے استفادہ کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔ اسی ہستی کو طریقت میں شیخ کہتے ہیں۔ ویسے تو شیخ عربی میں بوڑھے کو کہتے ہیں لیکن اس سے مراد رہبر کامل ہے جس کا ہاتھ پکڑنے سے مقصود حاصل ہونے کی قوی امید ہوتی ہے۔"

مشائخ سے کیا پوچھنا چاہیے؟

بعض حضرات کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ جب کتابوں میں سب کچھ لکھا جا چکا ہے اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ جو چیز اختیاری ہے اس کے لئے ہمت سے کام لینا چاہیے اور جو اختیار میں نہیں اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے نیز مقصود اور غیر مقصود کا پتا بھی لگ گیا تو پھر شیخ کی کس لئے ضرورت ہے یا ان کی صحبت تو مفید ہے لیکن اس سے کن چیزوں کے بارے میں پوچھنا چاہیے؟ ایک طالب کے جواب میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو تحریر فرمایا اس کا لبِ لباب یہاں دیا جاتا ہے۔

حضرت کے جواب کا مفہوم یہ ہے کہ مقاصد یعنی جن کے کرنے کا حکم ہے یا جن سے رکنے کا حکم ہے وہ سب اختیاری اعمال ہیں۔ باوجود اس کے سمجھ جانے کے کچھ غلطیاں سالک سے ایسی ہوسکتی ہیں کہ اصل مقصود حاصل نہیں ہو پاتا۔ مثلاً کبھی تو کوئی مقام حاصل ہو چکا ہوتا ہے اس کو غیر حاصل سمجھتا ہے مثلاً کسی کو مجاہدے سے خشوع کا مقصود درجہ حاصل ہو چکا ہے لیکن اس کو غیر اختیاری وساوس پیش آرہے ہیں اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ ابھی مجھے خشوع حاصل نہیں اور اس کے غم میں کڑھ رہا ہے۔ دوسری طرف بعض اوقات جو مقام حاصل ہو چکا ہوتا ہے وہ بدپرہیزی کی وجہ سے باقی نہیں رہتا لیکن یہ غفلت کی وجہ سے اس کا ادراک نہیں کر رہا ہوتا ہے۔ مثلاً پہلے اس کو خشوع کا مقصود درجہ حاصل تھا لیکن اب یہ وساوس سے متاثر ہو کر اس میں اپنا ارادہ بھی شامل کرتا ہے جس سے وساوس غیر اختیاری نہیں بلکہ اختیاری بن جاتے ہیں لیکن سالک ان کو غیر اختیاری سمجھ رہا ہوتا ہے۔ کبھی سالک کو یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ اس نے کسی رذیلہ پر قابو پا لیا ہے اس لئے وہ اس سے بے فکر ہو جاتا ہے حالانکہ موقع پر پتا چل جاتا ہے کہ ایسا نہ تھا۔ مثلاً دو چار خفیف حادثوں میں رضاء بالقضاء کا احساس ہوا یہ سمجھا کہ رضا کا مقام حاصل ہوگیا ہے پھر کوئی بڑا حادثہ واقع ہوا اور اس میں رضاء نہیں ہوئی، یا درجہ مقصود تک نہیں ہوئی مگر یہ اسی دھوکے میں رہا کہ رضاء حاصل ہے۔ اس طرح حاصل کو غیر حاصل سمجھنے میں یہ خرابی ہوتی ہے کہ مایوس ہو کر سالک کی

ہمت جواب دے جاتی ہے اور اس کے حاصل کرنے کی کوشش ترک کر دیتا ہے پھر وہ حاصل کردہ نعمت بھی سچ مچ زائل ہو جاتی ہے۔ اور غیر حاصل کو حاصل سمجھنے میں یہ خرابی ہوتی ہے کہ اس کا اہتمام ہی نہیں کرتا اور محروم رہتا ہے۔ غیر راسخ کو راسخ سمجھنے میں یہ خرابی ہوتی ہے کہ سالک تکمیل کا اہتمام ترک کر دیتا ہے اور راسخ کو غیر راسخ سمجھنے کا نتیجہ پریشانی اور تعطل ہوتا ہے۔ مثلاً شہوتِ حرام کا مقابلہ کیا اور نئے نئے ذکر کی وجہ سے عالمِ شوق میں شہوتِ حرام کا تقاضا ایسا دب گیا کہ اس کی طرف التفات بھی نہیں ہوتا تھا۔ پھر ان آثار کا جوش و خروش کم ہونے سے طبعی التفات گو درجہ ضعیفہ میں سہی ہونے لگا، یہ شخص سمجھا کہ سارا مجاہدہ بے کار گیا پھر اصلاح سے مایوس ہو کر سچ مچ شہوتِ حرام میں مبتلا ہو گیا۔ ہزار ہا مثالیں دی جاسکتی ہیں جن سے یہ پتا چلتا ہے کہ محض معلومات سے عمل حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ اس نظامِ اصلاح کی ایک عملی ترتیب ہوا کرتی ہے جس پر عمل اس وقت ہوسکتا ہے جب سالک کسی شیخ کی نگرانی میں ہو۔ اور اس سے یہ بھی پتا چلا کہ مرید کو شیخ سے اپنی اصلاح کے لئے کیسے رابطہ رکھنا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ مرید کو اپنا حال جو کچھ بھی ہے بلاکم و کاست اچھا ہے یا برا شیخ کو بتانا چاہیے۔ سالک کو یہ اختیار نہیں کہ وہ کسی چیز پر اچھے یا برے کا حکم لگا دے۔ یہ کام شیخ کا ہے کہ واقعات اور احوال کے تسلسل میں اس کو کیا سمجھتا ہے؟ وہ چاہے مرید کو اس کے بارے میں بتائے یا بغیر بتائے اس کو ایسا طریقہ بتا دے کہ اس پر عمل کرنے سے اس کی بری حالت اچھی میں بدل جائے یا اچھی حالت میں مزید ترقی ہو۔ بعض دفعہ سالک کو علم تو ہوتا ہے لیکن تجربہ نہیں ہوتا اور اصلاح میں تجربہ کی افادیت سے کون منکر ہے؟ بعض دفعہ سالک اپنے لئے کوئی اچھی چیز تجویز بھی کرسکتا ہے لیکن اپنے نسخے پر عمل سے اس کو اطمینان نہیں ہوتا اور تشویش میں مبتلا رہتا ہے۔ شیخ سے جو بات معلوم ہوتی ہے اس سے تشویش ختم ہو جاتی ہے جو کہ یکسوئی کا ذریعہ ہوتی ہے۔ نیز طالب اگر مخلص ہے تو شیخ کی عدم موجودگی میں اپنے لئے مشکل طریقہ پسند کرسکتا ہے۔ کیونکہ وہ جلد اصلاح چاہے گا جس کا تقاضا مجاہدہ زیادہ کرنا ہوگا۔ حالانکہ یہ عین ممکن ہے کہ وہ اپنی برداشت

کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر مجاہدہ کر کے اور اس میں ناکام ہو کر ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جائے۔ جبکہ تجربہ کار شیخ راستے کی مشکلات کو جانتے ہوئے اس کی استعداد اور حالات کے مطابق زیادہ آسان طریقہ تعلیم کرے گا۔ جس سے مقصود میں کامیابی ہوگی اور بشاشت حاصل کر کے مزید ترقی کا بھی اہل ہو گا۔ جب کوئی سالک کام شروع کر کے شیخ کو اپنے احوال کی بالالتزام اطلاع کرتا رہے اور اس کے مشورہ کی اتباع کرتا رہے اور یہ اتباعِ کامل اس وقت ہو سکتی ہے جب اس پر اعتماد ہو اور اس شیخ کی بات کے ماننے کا خود کو پابند کرے تو اس وقت اس کو محسوس ہو گا کہ شیخ کے بغیر مقصود تک رسائی عادتاً تقریباً ناممکن ہے۔

شیخ کامل کی پہچان

شیخ کے بارے میں جب معلوم ہوا کہ اس کی صحبت کتنی اکثیر ہے اور بغیر اس کی رہبری کے مقصود پانا بہت مشکل ہے تو یہ بھی لازم ہوگیا کہ شیخ کامل کی پہچان ہو۔ کیونکہ خدانخواستہ کسی دنیادار یا اناڑی شیخ کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا تو اس کی مثال یوں ہوگی کہ کوئی اپنی گاڑی کے لئے اناڑی ڈرائیور یا کسی ڈاکو کا انتخاب کرلے۔ الحمدللہ بزرگوں نے اس کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے شیخ کامل کی پہچان کی نشانیاں کھول کھول کے بیان کی ہیں جو یہاں درج کی جاتی ہیں۔ شیخ وہ ہے جو امراضِ باطنہ اور اخلاقِ رذیلہ و حمیدہ سے پوری واقفیت رکھتا ہو اور سالک سے جو غلطیاں ہوسکتی ہوں ان کو بھی جانتا ہو اور ایسے غلطی کرنے والوں کی اصلاح بھی کرسکتا ہو۔ نیز سلوک کے مختلف مراحل میں عُروج و نُزول سے واقف ہو اور نفس و شیطان کے اثرات اور ملکوتی اور ربانی تصرفات کی پوری واقفیت رکھتا ہو کہ ان کے درمیان تمیز کر سکے۔ اسلئے شیخ کا صاحبِ فن اور صاحبِ ذوق اور مجتہد ہونا ضروری ہے۔ اگر طریق کو محض کتبِ تصوف دیکھ کر یا لوگوں سے سن کر حاصل کیا ہو اور تربیت کرنے کے لئے بیٹھ گیا ہو تو وہ مرید کے لئے مہلک ہے۔ اس لئے کہ وہ طالب اور سالک کے حالات اور واردات و تغیرِ حالات کو نہیں سمجھتا جس کو ابنِ عربی رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ کی علامات میں مختصراً تین چیزوں پر موقوف

کیا ہے یعنی یہ کہ شیخ میں

(1) دینِ انبیاء کا سا ہو (2) تدبیر اطباء کی سی ہو (3) سیاست بادشاہوں کی سی ہو جس کی تفصیل یہ ہے

(1) شیخ کا عقیدہ صحیح ہو یعنی صحابہ کرام ؓ کے عقیدے اس کے عقیدے ہوں جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ "فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ" پس اگر وہ بھی ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو وہ بھی ہدایت پا گئے، اور اگر وہ نہ مانیں تو وہی ضد میں پڑے ہوئے ہیں، سو تمہیں ان سے اللہ کافی ہے اور وہی سننے والا جاننے والا ہے۔ (البقرۃ: 137)

(2) اس کے پاس طَلَبُ العِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ کے مطابق فرضِ عین علم ہو۔

(3) اس پر عمل کرتا ہو۔

(4) اس کی صحبت کا سلسلہ آپ ﷺ کی صحبت تک پہنچتا ہو۔

(5) اس کو کسی بھی شیخ کامل سے تربیت کی اجازت ہو۔

(6) اس کا فیض جاری ہو یعنی سب کو محسوس ہوتا ہو۔

(7) وہ اصلاح کرتا ہو مروت نہیں۔

(8) ان کی مجلس میں حبِ الٰہی پیدا ہوتا ہو اور دنیا کی محبت سے دل سرد ہو رہا ہو۔

جس میں یہ علامات موجود ہوں اس کی صحبت کو اپنے لئے اکسیر اعظم سمجھے وہ شخص اس قابل ہے کہ اس کو شیخ بنایا جائے اور اس کی زیارت و خدمت کو اپنے لئے سعادت سمجھے۔ ان کمالات و علامات کے بعد پھر شیخ کامل میں کشف و کرامات، تصرف و خوارق وغیرہ کو ہر گز نہ دیکھے کہ ان کا ہونا شیخ کامل کے لئے ضروری نہیں۔

مناسبتِ شیخ

یہ امر تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ فیوض باطنی کے لئے پیر و مرید کی باہمی مناسبت فطری شرط ہے۔ کیونکہ نفع عادتاً الفت پر موقوف ہے۔ جو مناسبتِ فطری کی حقیقت ہے اور یہی مناسبت ہے جس کے نہ ہونے پر مشائخ، طالب کو اپنے پاس سے بعض دفعہ دوسرے شیخ کے پاس جس کے ساتھ مناسبت، ظن یا کشف سے معلوم ہو بھیج دیتے ہیں۔ کیونکہ اس طریق میں مصلح کے ساتھ مناسبت ہونا بڑی ضروری چیز ہے۔ مناسبت کے بغیر طالب کو نفع نہیں ہو سکتا اور مناسبتِ شیخ جو فیض لینے اور دینے کا مدار ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ شیخ سے مرید کو اس قدر انس ہو کہ شیخ کے کسی قول و فعل سے مرید کے دل میں طبعی نکیر پیدا نہ ہو، گو عقلی پیدا ہو۔ یعنی شیخ کی سب باتیں مرید کو پسند ہوں اور شیخ کو مرید سے انقباض نہ ہو اور یہی مناسبت بیعت کے لئے شرط ہے۔ لہٰذا پہلے مناسبت پیدا کرنے کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ کہ اس کی سخت ضرورت ہے جب تک یہ نہ ہو مجاہدات، ریاضت، مراقبات و مکاشفات سب بیکار ہیں۔ کوئی نفع نہ ہو گا۔ اگر طبعی مناسبت نہ ہو تو عقلی پیدا کر لی جائے، اس پر نفع موقوف ہے۔ اس لئے جب تک پوری مناسبت نہ ہو بیعت نہیں کرنی چاہیئے۔

شیخ کامل کی صحبت کے فائدے

(1) شیخ کے اندر جو چیز ہے وہ آہستہ آہستہ مرید کے اندر آجاتی ہے۔

(2) اصلاح کامل نہ بھی ہو تو کم از کم اپنے عیوب نظر آجائیں گے جو اصلاح کی کنجی ہے۔

(3) آہستہ آہستہ مرید پر شیخ کا رنگ چڑھتا جاتا ہے جس سے وہ شیخ کے اخلاق و عادات میں اتباع کرنے لگتا ہے۔ شیخ کی صحبت میں جو افادات زبانی سننے میں آتے ہیں وہ یا تو شیخ کی عمر بھر کے تجربے کا نچوڑ ہوتا ہے جس کا مفید ہونا ظاہر ہے یا شیخ کے قلب پر مریدین کے لئے ان

کے مناسب مضامین القاء کئے جاتے ہیں جو تیر بہدف ثابت ہوتے ہیں۔

(4) شیخ کے سامنے اپنا ہیچ ہونا مکشوف ہو جاتا ہے جو تواضع کی کنجی ہے۔

(5) اہلِ محبت کی صحبت سے مرید کے دل میں بھی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔

(6) مشائخ اعمالِ صالحہ کی وجہ سے بابرکت ہوتے ہیں اس لئے ان کی تعلیم میں برکت ہوتی ہے اس کے مقابلے میں خود کتابیں دیکھ کر علاج کرنا مفید نہیں ہوتا۔

(7) مقبولینِ الٰہی کی صحبت میں اگر آدمی اخلاص کے ساتھ رہ رہا ہو تو یا تو اس کی حالت اچھی ہوگی یا بری۔ اگر اچھی ہوگی تو اس سے یہ حضرات خوش ہوں گے اور دل سے ان کے لئے دعا گو ہوں گے جس سے ان کو مزید ترقی حاصل ہوگی اور اگر مرید کی حالت بری ہے تو شیخ کو اس پر شفقت ہوگی وہ اس کی اصلاح کریں گے تعلیم سے اور دعا سے۔ اس لئے صحبت سے ہر صورت فائدہ ہوا۔

(8) مرید جب شیخ کی صحبت میں ہوتا ہے تو شیخ کے کمالات اس پر ظاہر ہوتے ہیں اور دین پر چلنے کا جو سلیقہ ان کو عطا ہوتا ہے وہ مرید کو بھی صحبت سے آہستہ آہستہ ملنے لگتا ہے۔ دوسری طرف شیخ پر مرید کے عیوب منکشف ہوتے رہتے ہیں اس لئے وہ مرید کے بارے میں بہتر سے بہتر رائے قائم کر لیتے ہیں جس سے مرید کی اصلاح کافی تیز ہو جاتی ہے۔

(9) ان حضرات کے دل خدا کی یاد سے روشن ہوتے ہیں۔ ان کے پاس رہنے سے وہ نور آہستہ آہستہ مرید کے دل میں بھی آجاتا ہے۔ نور جب آتا ہے تو ظلمت ختم ہو جاتی ہے اس لئے مرید پر اپنی حیثیت اور اللہ تعالیٰ کی عظمت منکشف ہونے لگتی ہے جس سے اس کی قلبی بیماریوں کی اصلاح خودبخود ہونے لگتی ہے اور اس کے اشکالات حل ہونے لگتے ہیں۔

(10) شیخ کی خدمت میں رہ کر بزرگوں کی خدمت کا موقع مل جاتا ہے۔ بعض دفعہ قبولیت کی کوئی ایسی گھڑی مل جاتی ہے جس میں شیخ کے دل میں اس کے لئے ایسے جذبات پیدا ہوجاتے ہیں جس سے یہ بہت جلدی واصل ہو جاتا ہے۔

غور طلب

شیخ کی صحبت کو حاصل کرنے پر حریص ہونا اچھی بات ہے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا لیکن یہ اس صورت میں فائدہ مند ہوتی ہے جب اس سے شیخ کو تکلیف نہ دی جائے اور اس کے مزاج کے مطابق ان مواقع میں حاصل کی جائے جو مواقع شیخ نے مریدین کے لئے کسی ضابطے کے مطابق مقرر کئے ہیں۔ ورنہ مریدین کے لئے شیخ کی صحبت کو حاصل کرنے کی وہ کوششیں جس سے شیخ کو تکلیف ہو سخت مضر ہے۔ اس لئے شیخ کے مزاج کی اچھی طرح تحقیق کی جائے کہ وہ مریدین کو اپنی صحبت کس طرح میسر کرنا چاہتے ہیں، بس اسی طرح اس کو حاصل کیا جائے۔ ان میں جو اوقات میسر ہوں تو اس وقت اپنے تقاضوں کو اگر ممکن ہو آگے پیچھے کر کے شیخ کی صحبت سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کی کوشش کی جائے۔

بیعتِ طریقت

جب کسی شیخ کامل کا پتا چل جائے اور ان کے بارے میں اطمینان ہو جائے اور وہ شیخ بھی تربیت کرنے پر آمادگی کا اظہار فرمائے تو اس کے لئے ایک معاہدہ بہت مفید ہوتا ہے جس کو بیعت ہونا کہتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس باشرع صاحبِ سلسلہ شیخ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر یہ عہد کیا جائے کہ اپنی تربیت کے لئے صرف اسی شیخ کے ساتھ رابطہ رکھوں گا اور شیخ اس کی تربیت کا ارادہ کرے۔ یہ سنتِ مستحبہ ہے۔ اس کے ذریعے اکثر وہ نعمتِ عظیم جس کو نسبت کہتے ہیں حاصل ہو جاتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو مخاطب فرما کر علاوہ بیعتِ جہاد و بیعتِ اسلام کے التزامِ احکام و اہتمامِ اعمال کے لئے بیعت فرمایا ہے۔ متعدد

احادیث سے ثابت ہے جیسا کہ عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے۔

عن عَوْف بْن مَالِكٍ الْأَشْجَعِيّ رضی الله عنه قَالَ: كُنَّا عِنْدَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تِسْعَةً أَوْ ثَمَانِيَةً أَوْ سَبْعَةً فَقَالَ: أَلَا تُبَايِعُونَ رَسُولَ اللهِ قَالَ: فَبَسَطْنَا أَيْدِيَنَا وَقُلْنَا: قَدْ بَايَعْنَاكَ يَا رَسُولَ اللهِ فَعَلَامَ نُبَايِعُكَ؟ قَالَ: عَلَى أَنْ تَعْبُدُوا اللهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَالصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ وَتُطِيعُوا" (الحديث اخرجه مسلم و ابو داؤد و نسائي)

یعنی حضرت عوف ابن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے۔ نو آدمی تھے یا آٹھ یا سات۔ ارشاد فرمایا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت نہیں کرتے؟ ہم نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور عرض کیا کہ کس امر پر آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی بیعت کریں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان امور پر کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو اور پانچوں نمازیں پڑھو اور احکام سنو اور مانو۔ (روایت کیا اس کو مسلم، ابو داؤد و نسائی نے)

اس بیعت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خطاب کیا کہ یہ نہ بیعتِ اسلامی تھی نہ بیعتِ جہادی۔ لہٰذا اس حدیث میں مشائخ کے ہاں مروج بیعت کا صریح ثبوت ہے۔ جس طرح فقہ میں بہت سارے مجتہدین تھے لیکن ان میں چار اپنے شاگردوں کے ذریعے زیادہ معروف ہوئے اور ان کا فقہ محفوظ ہوا ان پر چلنے والے حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کہلائے۔ اسی طرح فن تصوف میں بھی بہت سارے سلسلے رائج ہوئے، ان میں چار سلسلے چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ کو پاک و ہند میں زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ جس صاحب کو جس سلسلہ کے ساتھ بھی مناسبت ہو اس کے ذریعے اس کو نسبت حاصل ہو سکتی ہے۔ کافی تو ایک ہی سلسلہ ہوتا ہے لیکن ہمارے اکابر چاروں سلسلوں میں بیعت فرماتے ہیں تاکہ سب کا ادب ملحوظ رہے اور سلسلوں کے تقابل سے، جیسا کہ بعض مغلوب الحال لوگ کرتے ہیں محفوظ رہے۔

تمام سلسلوں کا ادب

سلسلوں کی مثال طب کی مختلف قسموں کی ہے جیسے ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، طب یونانی اور آکوپنکچر وغیرہ۔ مطلوب صحت ہوتی ہے نہ کہ صحت حاصل کرنے کا طریقہ اس لئے جس کو جس طریقے سے شفا حاصل ہو جائے وہ اس کا اگر ممنون ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن اس کو دوسری قسموں کو ناقص کہنے کا حق نہیں ہوگا کیونکہ جس طرح مختلف لوگوں کے مزاج مختلف ہیں اس طرح ان کی شفا کے طریقے بھی مختلف ہیں جس کو جس قسم سے زیادہ مناسبت ہے اس سے علاج کرے گا تو جلدی صحت یاب ہوگا اسی طرح روحانی صحت بھی مطلوب ہے لیکن اس کو حاصل کرنے کے طریقوں میں آزادی ہے جس سے جس کو مناسبت ہو اس سے استفادہ کرے لیکن باقی لوگوں کو جن کو دوسرے سلسلوں کے ساتھ مناسبت ہو ان کو اپنے طریقے پر مجبور نہ کریں۔ جس طرح ہم ایک امام کی تقلید کر کے باقی اماموں کو بھی اولیاء سمجھتے ہیں اور ان کی تقلید کرنے والوں کے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں کرتے اس طرح اس میں بھی کسی بھی طریقے کے ساتھ مناسبت ہو تو اس سے استفادہ کریں لیکن دوسرے سلسلوں کو ناقص نہ سمجھیں۔

حقیقتِ بیعت

بیعت جس کے اندر بیع کی صورت ہے، شیخ کے ہاتھ بک جانا ہے۔ جس میں اپنے کو شیخ کے ہاتھ احکام ظاہرہ و باطنہ کے التزام کے واسطے گویا بیچ دیا۔ جس کی حقیقت یہ ہے کہ طالب کو اپنے شیخ پر پورا اعتقاد اور کلی اعتماد ہو کہ یہ میرا خیرخواہ ہے جو مشورہ دے گا وہ میرے لئے نہایت نافع ہوگا۔ اس پر پورا اطمینان ہو۔ اس کی تجویز و تشخیص میں دخل نہ دے۔ یوں یقین رکھے کہ دنیا بھر میں میری جستجو اور میری تلاش میں میرے نفع کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ اس کو اصطلاحِ تصوف میں وحدتِ مطلب کہا جاتا ہے۔ اس کے بغیر بیعت ہونا نافع نہیں۔ کیونکہ اصلاحِ نفس کے لئے شیخ سے مناسبت شرط ہے اور مناسبت کی

پہچان یہی ہے کہ اس کی تعظیم اور قول و فعل اور حال پر قلب میں اعتراض نہ ہو۔ بالفرض اگر قلب میں اعتراض آئے تو اس سے رنجیدہ ہو، اور گھٹن محسوس کرے۔ عوام کے لئے بیعت کی صورت البتہ نافع ہوتی ہے۔ بیعت سے ان کے قلب پر ایک عظمت اور شان، شیخ کی طاری ہو جاتی ہے۔ جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کے قول کو باوقعت سمجھ کر اس پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ خواص کے لئے کچھ مدت کے بعد بیعت نافع ہوتی ہے۔ بیعت سے ہر دو جانب ایک خلوص اور تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ شیخ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ ہمارا ہے اور مرید سمجھتا ہے کہ یہ ہمارے ہیں۔ ڈانواں ڈول حالت نہیں رہتی۔

بیعت کرنے کا طریقہ

شیخ مرید کے داہنے ہاتھ کو اپنے داہنے ہاتھ میں لے کر بیعت کرتا ہے۔ اور کثیر مجمع کو بذریعہ رومال، چادر وغیرہ بیعت کیا جاتا ہے۔ اور مستورات کو پردہ کے پیچھے کہ وہاں ان کا کوئی محرم بھی ہو رومال وغیرہ سے بیعت کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ "عن عائشه رضى الله عنها قالت : "لا والله ما مست يد رسول الله صلى الله عليه وسلم يد امرأة قط غير أنه يبايعهن بالكلام" (أخرجه البخاري ومسلم)

اس سے ثابت ہوا کہ عورت کا ہاتھ ہاتھ میں لئے بغیر آپ ﷺ بیعت فرماتے تھے پھر فرماتے میں نے تم کو بیعت کر لیا ہے۔ اس لئے مشائخ میں عورتوں کو بغیر ہاتھ میں ہاتھ لئے زبانی طور پر یا کسی کپڑے وغیرہ سے بیعت کرنا معمول ہے۔ یہ بیان تو شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت ہونے کا ہے اور جو شخص شیخ کی خدمت میں نہ پہنچ سکے وہ وہیں سے بذریعہ خط و کتابت، ٹیلی فون یا بواسطہ شخصِ معتبر بیعت ہو سکتا ہے اور اس کو بیعتِ عثمانی کہا جاتا ہے، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے بموقع بیعتِ رضوان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی غیر موجودگی میں اپنے بائیں ہاتھ پر دائیں دستِ مبارک کو رکھ کر فرمایا کہ میں نے عثمان رضی اللہ عنہ

کو بیعت کر لیا۔

بیعت کے وقت تعلیم

مریدین کو یہ بتانا چاہیے کہ

(1) ہر وقت اللہ تعالیٰ پر نظر ہو، عبادت صرف اس کی ہو، مانگنا صرف اس سے ہو، اسی کو راضی کرنے کے لئے تمام کوششیں ہوں اور ہر حال میں اس سے راضی ہوں۔

(2) خوشی غمی یعنی ہر حال میں سنت کی تلاش اور اس پر عمل ہو۔ جس پر عمل نہ ہوسکے اس پر دل سے ندامت اور استغفار ہو۔ اپنی ہر رائے کو سنت کے مقابلے میں بودی اور نکمی سمجھنا اور سنت پر عمل کرنے اور اس کو پھیلانے کا عزم ہی اپنا شیوہ ہو۔

(3) تمام عبادات میں سنت طریقے کو جاننے کی اور پھر اس پر عمل کرنے کی کوشش ہو۔ معاملات کی صفائی کا خیال اور اہتمام ہو۔ اپنی معاشرت کو شریعت کے مطابق ڈھالنے کا عزم ہو اور دل کے روحانی امراض مثلاً تکبر، عجب اور حسد وغیرہ کا علاج کر کے روحانی فضائل مِثل تواضع، تفویض اور اخلاص وغیرہ سے مزین کرنے کی نیت ہو اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے مدد کا خواستگار ہو نیز ہر وقت اپنی اصلاح کی دھن اور اپنے رب کا دھیان ہو۔

(4) شریعت اور طریقت کو ایک سمجھا جائے۔ شریعت پر چلنے کے عزم کے ساتھ وقتی طور پر ماحول کی مشکلات کے پیشِ نظر اور شریعت پر چلنے کی منصوبہ بندی کی خاطر کچھ شرعی ضروریات کو آگے پیچھے کرنا پڑے تو اس کے لئے شیخ سے رابطے کی کوشش کی جائے تاکہ اس سلسلے میں رہنمائی حاصل ہوسکے کیونکہ یہ کام بہت نازک ہے۔

(5) شیخ کے بتائے ہوئے ذکر کی پوری پابندی کی جائے اور اگر اس میں کوئی

مسئلہ یا مشکل پیش آرہی ہو تو شیخ کو اس کی اطلاع کی جائے۔

(6) نمازوں کی قضا اس طرح کرنا کہ ہر وقت کی نماز کے ساتھ نماز سے پہلے یا بعد اسی وقت کی قضا کے صرف فرض ادا کرنا اور عشاء میں وتر بھی اور فرصت اور ہمت کے ساتھ یا ایک دن میں کئی کئی وقت یا کئی کئی دن کی نمازوں کو ادا کر لینا۔ اس طرح قضا شدہ روزوں اور زکٰوۃ کی ادائیگی کا اہتمام کرنا، حج فرض ہو تو اس کی تیاری کرنا۔

(7) کسی کا مالی حق اپنے ذمے ہو اس کو ادا کرنا یا معاف کرانا۔

(8) بد نظری سے ایسے بچتا ہو جیسے سانپ بچھو سے۔ جن اخبارات اور رسائل میں تصویریں ہوں کوشش کی جائے کہ ان کو نہ پڑھا جائے۔ اگر کسی وجہ سے پڑھنا پڑ جائے تو اس کا خیال رکھا جائے کہ تصویریں نہ دیکھیں۔ اسی طرح گانا سننے سے سخت پرہیز کیا جائے اگر روکنے پر قادر نہ ہوں تو "یا ھادی یا نور لاحول ولا قوۃ الا باللہ" پڑھیں تاکہ اس کے شیاطین آپ کے اوپر حاوی نہ ہوں۔

(9) ہر قسم کے حرام مال سے بچتا ہو۔ سوال اور اشرافِ نفس، نمود و نمائش، شرکیہ اور بدعتی رسومات، بے صبری اور ناشکری سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے لئے ایسی کتابیں پڑھنی چاہئیں جس میں ان چیزوں کی مذمت مؤثر انداز میں کی گئی ہو۔

(10) والدین کے تمام جائز حقوق کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہو۔ ان کی ناجائز باتوں سے اگر کسی کو تکلیف ہو رہی ہو تو ان کو نہ ماننا چاہیے لیکن ادب اور خدمت کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اگر کوئی مشکل صورت ہو تو شیخ کے ساتھ مشورہ کرنا چاہیے اس کے علاوہ شیخ جو بھی تعلیم فرمائے تو اس پر عمل کرنا۔ اپنے احوال سے شیخ کو وقت پر ان کے پسندیدہ طریقے پر آگاہ کرنا اور اس کے مطابق پھر عمل کرنا۔ اطلاع اور اتباع کا سلسلہ تا اصلاح جاری رہنا چاہیے۔

فنا فی الشیخ ہونا

از روئے حدیث حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيئَة (رواه البيهقي في الشعب بإسناد حسن) دنیا کی محبت ساری خطاؤں کی جڑ ہے۔ یہی دنیا کی محبت ہے جس کی وجہ سے سب روحانی بیماریاں ہیں اور یہی دنیا کی محبت ہے جو اس کے علاج میں رکاوٹ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت ساری سعادتوں کا منبع ہے جیسا کہ قرآن میں ارشادِ مبارک ہے وَالَّذِينَ اٰمَنُوٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ اور ایمان والوں کو تو اللہ ہی سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ (البقرة:165) لیکن کیا بات ہے کہ ایمان کے باوجود اللہ تعالیٰ کی محبت کا وہ مظاہرہ نظر نہیں آتا جو ہونا چاہیے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات وراء الوریٰ ہے اس لئے طبیعت قریبی چیزوں کے اثر کی وجہ سے اس کا اثر نہیں لیتی جیسا کہ مد و جزر چاند کی وجہ سے زیادہ ہے اور سورج کی وجہ سے کم حالانکہ چاند سورج کا کروڑواں حصہ ہے، وجہ صاف ظاہر ہے کہ وہ زمین کے قریب ہے۔ آپ ﷺ زماناً دور ہیں لیکن چونکہ آپ ﷺ کی تعلیمات اور سیرت موجود ہے اس لئے اس کا اثر طبعاً زیادہ ہے اور شیخ چونکہ سامنے ہوتا ہے اس لئے طبعاً اس کا اثر کافی زیادہ ہوتا ہے۔ اب ہم اگر اس اثر کو تربیت کے لئے استعمال کرلیں تو تربیت بہت آسان ہو جاتی ہے۔ پس اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہے جس کا واحد راستہ اتباعِ رسول ﷺ ہے اور اس کو صحیح معنوں میں اپنانے کے لئے اپنے آپ کو شیخ کی تربیت میں دینا ہے۔ آگے دو چیزوں کی ضرورت رہتی ہے۔ ایک تو شیخ کے ساتھ مناسبت جو شیخ کو چننے سے پہلے ہے اور دوسرا پھر اس کا قلباً قالباً مناسب قرب۔ یہ قلباً جو قرب ہے وہ فنائیت کہلاتی ہے یعنی یہ دل کے اتنے قریب ہو جائے کہ اپنی بات اس کے سامنے بھول جائے اور اس کی بات یاد رہے۔ ایسی حالت کو فنا فی الشیخ کہتے ہیں۔ قالباً قرب سے مراد شیخ کی صحبت ہے بشرط اجازتِ شیخ۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ بری صحبت سے خلوت اچھی ہے اور اچھی صحبت خلوت سے اچھی ہے، پھر شیخ سے کسی کی صحبت مرید کے لئے اچھی ہوسکتی ہے۔ فنافی الشیخ جتنا قوی ہو گا اگر شیخ صحیح ہے تو اتنا ہی اتباعِ نبوی ﷺ زیادہ

حاصل ہوگی اور اس میں سالک اتنا ہی فنا ہوگا اور یہ فنا جتنی زیادہ حاصل ہوگی اتنا ہی سالک فنا فی اللہ کا مقام حاصل کرے گا۔

فنا فی الشیخ سے فنا فی الرسول اور اس سے پھر فنا فی اللہ حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہے جو اتباعِ سنت میں مضمر ہے اور اس کے لئے جو موانع ہیں وہ فنا فی الشیخ سے دور ہوسکتے ہیں۔

فنا فی الشیخ

فنا فی الشیخ کا رتبہ اگر ہو — تو شیخ کے قلب کا تجھ پر اثر ہو
پھر اس کا قلب تیرا رہنما ہو — نہ یوں دنیا میں تو پھر دربدر ہو
تو جانے اس کو وہ بھی تجھ کو جانے — میسر تجھ کو پھر اس کی نظر ہو
دعا میں اس کی شامل تو رہے پھر — تجھے رستے کا نہ پھر خوف و ڈر ہو
پھر اس کا قلب تیرا مقتدا ہو — وسیلہ تیرا پھر اس کا ہی در ہو
خدا ہی دیتا ہے سب کو یقیناً — ملانے کے لئے کوئی مگر ہو
یہ دل سے دل کو ملنے کا ہے رستہ — ترے سامنے اگر نور کا سفر ہو
نبی کے لفظ ہم تک جیسے پہنچے — تو اس میں زور سارا راوی پر ہو
نبی کا نورِ قلب بھی دل سے دل کو — ملا صحبت پہ ہی یہ منحصر ہو
شبیرؔ اس نور کے پانے کے واسطے — فنا فی الشیخ رہو کہ خوب تر ہو

فنا فی الرسول

جو شیخ اتباع میں سنت کی مشغول ہو — اس کو ہی دیکھتے دیکھتے فنا فی الرسول ہو

یہ رتبہء بلند ملا جس کو مل گیا سالک کا ہر عمل پھر خدا کو قبول ہو

محبوبیت خدا کی جب سنت میں ہے پنہاں رحمت کا دل پہ اس سے نہ پھر کیوں نزول ہو

خوشنودئ خدا کا یہ رستہ جسے ملے اس کی نظر میں بدعتیں رستے کی دھول ہو

سنت میں جذب قبول کے درجے میں ہے موجود اک جست میں باخدا بنے، شرک کا ذہول ہو

سنت کی اتباع کو کرو شیخ سے حاصل تو اولیاء کے گروہ میں تیرا شمول ہو

یہ جذب کو دعوت ہے تو اک جست میں شبیر سالک کا طے اک آن میں رستے کا طول ہو

فنا فی اللہ

راستہ جس کو دوامی اگر سنت کا ملے بالآخر اس کو پھر مقام عبدیت کا ملے

یہی فنائیت فی اللہ کا مقام ہی ہے جو کہ سنت کے طریقے پہ سہولت سے ملے

خدا نے ایک ہی رستہ رکھا تو باقی ہے اسی کو پا کے ہی پھر راستہ جنت کا ملے

یہی فنائیت فی اللہ بقا باللہ ہے اسی سے مژدہ جانفزا محبت کا ملے

جو بندگی میں ہے آگے وہی محبوب زیادہ اسی کو آگے ہی مقام پھر قربت کا ملے

یہی وصول ہے یہ وصل ہے اور یہ ہی فلاح شبیر اس کو ہی تو نام پھر نسبت کا ملے

دو طرح کا فنا فی الشیخ

جس طرح فنا فی اللہ کے دو ذریعے ہیں۔ فنا فی صفات اللہ اور فنا فی ذات اللہ۔ صفات میں فانی ہونا کافی نہیں ہوتا کیونکہ جن صفات میں فنا نہیں وہی مانع بن جائیں گی جس میں انسان کا اپنا وجود بھی ہے اسلئے فنا فی اللہ مکمل نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس جو ذات میں فانی ہے وہ اصل فنا فی اللہ ہے اور اس میں خود کو واقعی فنا کرلیتا ہے اس لئے اس میں عود کا خطرہ نہیں۔ فنا فی الشیخ میں بھی دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں جس طرح صفات میں فنا ہونے والے اور شیون میں فنا ہونے والے ہوتے ہیں۔ جو صفات والے ہوتے ہیں وہ شیخ کی کسی ایک صفت میں فنا ہوتے ہیں اس سے متاثر ہوجاتے ہیں اور جو ذات والے ہوتے ہیں وہ شیخ کی ذات میں فنا ہوجاتے ہیں پھر ان کا شیخ کی صفات کی طرف دھیان نہیں رہتا۔ جس طرح آپ ﷺ کی صفات کی طرف دھیان نہیں رہتا آپ ﷺ کی ذات میں فنا ہونے کی وجہ سے تو یہ وہ محبت ہے جو اصلی محبت ہے عقلی یا غرضی محبت نہیں ہے اس کا عقل اور دلیل سے واسطہ نہیں اور جن کو یہ حاصل ہوتی ہے ان کو اللہ تعالیٰ کی بھی خالص محبت حاصل ہو جاتی ہے۔ جن کی محبت شیخ کی کسی خاص صفت کے ساتھ ہوتی ہے وہ کچی ہے اور جس کو شیخ کی ذات کے ساتھ محبت ہو وہی اصلی ہے۔

مرشد کے حقوق

(1) یہ اعتقاد رکھے کہ میرا مطلب اسی شیخ سے حاصل ہوگا اس لئے صرف اسی کی طرف متوجہ رہے اور اگر کسی اور سے جاگتے میں یا خواب میں فائدہ محسوس ہو تو اس کو بھی اپنے شیخ ہی کی برکت سمجھے۔

(2) اپنے شیخ کے ساتھ محبت کرے کیونکہ شیخ کے ساتھ عقیدت بھی گو کہ کافی ہے لیکن محبت اس سے زیادہ مفید ہے۔ اصلاح میں شیخ کی محبت کو بہت دخل ہے کیونکہ محبوب کی بات میں کوئی عاشق بات نہیں نکالتا۔

(3) جو وظیفہ شیخ تعلیم کرے صرف اسے کرے۔ اگر کسی اور نے وظیفہ دیا ہو یا خود سے کوئی وظیفہ شروع کیا ہو تو اس پر شیخ کو مطلع کرے۔ اگر شیخ اجازت دے تو ٹھیک ہے ورنہ بلا تکلف ان وظائف کو چھوڑ دے صرف وہی وظائف جو شیخ نے دیئے ہیں ان کو کافی سمجھے۔

(4) شیخ کی موجودگی میں ہمہ تن شیخ کی طرف متوجہ رہے۔ فرائض، واجبات

اور سنتوں کے علاوہ نوافل شیخ کی تجویز سے ہی پڑھے۔ اگر وہ روکیں تو بالکل رک جائے۔ اس میں اپنے دل کو سمجھائے کہ مریض کو بعض دفعہ ملائی سے بھی روکا جاتا ہے جو کہ صحت مندی کے لئے بہت مفید ہے۔

(5) جو کچھ مرشد کہے اس پر نہ اعتراض کرے نہ شیخ کے ساتھ مناظرہ کرے۔ دل میں پھر بھی تشویش ہو تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ یاد کرلے۔

قلندر جو کہے دیکھ کر کہے ہے

(6) مرشد کی آواز پر آواز بلند نہ کرے لیکن اتنی کم آواز سے بھی بات نہ کرے کہ سننے میں تکلیف ہو۔

(7) جو کچھ اپنا حال ہو برا یا بھلا، بلاکم و کاست بیان کرے اس پر شیخ جو تجویز کرے دل و جان سے قبول کرے۔

(8) اس کے پاس بیٹھ کر کسی وظیفہ وغیرہ میں مشغول نہ ہو اِلّا یہ کہ شیخ خود ہی وظیفہ کرنے کو فرمائے۔

(9) کوئی بھی دینی خدمت کرنی ہو چاہے کتنا ہی اس کے ساتھ تعلق ہو یا اس کا شرح صدر ہو اگر شیخ اس سے روک دے تو بلا تکلف اس سے رک جائے کیونکہ شیخ کو مرید کے بارے میں زیادہ معلوم ہے کہ اس کو کس وقت کونسا کام کرنا چاہیے۔

شیخ اور مرید کا تعلق

آج کل چونکہ اسی تعلق کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے اس طریق میں افراط اور تفریط کا بازار گرم ہے اس لئے اس کو واضح کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ مرید کے لئے مرشد کی مثال ایک طبیب کی سی ہے یا ایک شفیق راہبر کی۔ شیخ مرید کو اپنی بصیرت کے مطابق طریقہ تعلیم کرتا ہے۔ یعنی مرید کو کچھ کرنے

کو بتاتا ہے اور کچھ کرنے سے روکتا ہے۔ جس کے کرنے کے بارے میں بتاتا ہے اس میں کچھ کی مثال تو دوا کی سی ہوتی ہے کہ اس پر عمل اگر نہ ہو تو بیماری کا علاج نہیں ہوگا اور مرض بڑھے گا اور کچھ کی مثال غذا کی سی ہے جس سے روحانی قوت حاصل ہوتی ہے۔ اور جن سے روکتا ہے اس کی مثال پرہیز کی سی ہے پس اگر کوئی دوا اور غذا کا اہتمام تو کرے لیکن پرہیز نہ کرے تو اس کا بھی علاج نہیں ہو پاتا۔ بلکہ اس سے عین ممکن ہے کہ دوا ہی آئندہ کے لئے غیر مؤثر ہو جائے اور شیخ کو بعد میں اپنی دوا تبدیل کرنی پڑے۔ پس شیخ کا کام تعلیم کرنا ہے اور مرید کا کام اس پر عمل کرنا۔ اگر مرید عمل کرنے کے لئے تیار ہو لیکن شیخ تعلیم نہ کرے تب بھی کام نہیں ہوسکتا اور شیخ تعلیم کرے لیکن مرید اس پر عمل نہ کرے تب بھی کام نہیں چلے گا۔ اس کے لئے شیخ کی صحبت کی ضرورت ہے اور اس کی غیر موجودگی میں مکاتبت یا کسی اور ذریعے سے رابطے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ مرید کے ذمہ لازم ہے کہ شیخ کو اپنی حالت سے مطلع کرے جیسا کہ مریض ڈاکٹر کو مطلع کرتا ہے اور شیخ جو نسخہ تجویز کرے اس پر مرید کو عمل کرنا پڑتا ہے۔ اس باہمی تعلق کو دو الفاظ کے ذریعے یاد رکھا جاسکتا ہے۔ "اطلاع و اتباع" پس مرشد کو بروقت اطلاع کرنا اور شیخ کی تجویز کا اتباع کرنا مرید کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ اس باہمی تعلق کو مضبوط کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے شیخ کے بارے میں مرید کا یقین راسخ ہو کہ یہی شیخ میرے لئے سب سے زیادہ مفید ہے۔ یہ نہیں کہ یہی شیخ سب سے افضل ہے کیونکہ اس کا پتا تو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو نہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس شیخ کے ساتھ اپنے آپ کو مقید کرے گا اور کسی اور شیخ کی طرف ہرگز متوجہ نہیں ہوگا چاہے وہ دوسرا شیخ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ اسی کو توحیدِ مطلب کہتے ہیں۔ اس کی مثال بھی بالکل ایسی ہے کہ علاج کے دوران کسی اور ڈاکٹر کی طرف رجوع کرنا علاج کو بگاڑ دیتا ہے۔ شیخ کے ان چار حقوق کو حضرت خواجہ مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے یوں نظم کیا ہے۔

چار حق مرشد کے ہیں رکھ ان کو یاد
اطلاع و اتباع و اعتقاد و انقیاد

شیخ کا مقام

بعض حضرات بڑے بڑے مشائخ کی تلاش میں عمر بھر سرگرداں رہتے ہیں اور اپنے قریب کے مشائخ کے فیض سے محروم ہوجاتے ہیں۔ شیخ سے فیض حاصل کرنے کا ذریعہ اس کا بڑا ہونا نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ مناسبت ہونا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ رابطے کا قائم ہونا ہوتا ہے۔ اگر کوئی شیخ بہت بڑا ہو لیکن اس کے ساتھ کسی کو مناسبت نہ ہو یا مناسبت تو ہو لیکن اس کے ساتھ رابطے کے ذرائع کمزور ہوں تو اس سے فائدہ نہیں ہوگا۔ شیخ اور مرید کے باہمی تعلق میں دو چیزیں مؤثر ہوتی ہیں۔ ایک تو شیخ کا صاحبِ فن ہونا اور ایک اس کا صاحبِ برکت ہونا۔ اب اگر کوئی شیخ بہت بڑا ہے تو وہ زیادہ صاحبِ برکت ہوگا لیکن ان کے فن سے مستفید ہونے کے لئے رابطہ قائم ہونا ضروری ہوتا ہے یعنی اطلاع اور اتباع کا انتظام ہونا ضروری ہے۔ برکت چونکہ اس کی تعلیم میں ہوگی اس لئے اگر تعلیم ہی نہ ہو تو صرف برکت کس چیز میں آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ گو حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کا مقام بہت بڑا ہے لیکن کسی بھی صحابی سے کم ہے کیونکہ صحابی کو صحبت حاصل تھی جو کہ تمام چیزوں سے زیادہ اہم ہے۔ صاحبِ برکت ہونے کے لئے اتنا کافی ہے کہ شیخ صاحبِ سلسلہ ہو کیونکہ سلسلہ ہی برکت کا ماخذ ہے۔
دوسری بات یہ ہے کہ بڑے شیخ کے ہاں کچھ اور نزاکتیں بھی آجاتی ہیں جن کا نباہنا بھی ضروری ہوتا ہے اس لئے بعض لوگ بڑے بڑے مشائخ کے پاس رہ کر بھی محروم ہوجاتے ہیں، جس کی وجوہات ان گنت ہیں۔ اس لئے قریب ترین جن مشائخ کے ساتھ مناسبت ہو، ان میں جس کے ساتھ مناسبت زیادہ ہو اور رابطہ آسان ہو، ان کی طرف رجوع کرنا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ بڑے مشائخ بھی بعض اوقات ان ہی وجوہات کی وجہ سے طالبین کو ان کے قریب کے مشائخ کی طرف رجوع کرا دیتے ہیں۔ بعض حضرات نے اس ضمن میں شیخ کی مثال بجلی کے کھمبے

سے بھی دی ہے کہ جس کھمبے کے ساتھ بھی اپنے بلب کو لگایا جائے گا تو وہ جلے گا تو اتنا ہی جتنی بلب کی طاقت ہے چاہے وہ کھمبا پاور ہاؤس میں ہو یا اس سے دور کسی اور جگہ۔ پس مرید کی استعداد کے مطابق ہر اس شیخ سے جس کے ساتھ اس کو مناسبت ہے اتنا ہی فائدہ ہوگا جتنا بڑے مشائخ سے ہوتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات مرید اپنے شیخ سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ مربی حقیقی تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے وہ ہر طالب کی طلب کے مطابق اس کے شیخ کے قلب باصفا سے اس کی طلب کے بقدر چشمہ عرفان جاری کرتا ہے۔ اس کا بعض اوقات کھلی آنکھوں مشاہدہ بھی ہوتا ہے کہ بعض طالبین کی مجلس میں موجودگی سے شیخ کے قلب پر ایسے عالی مضامین کا ورود ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں پہلے خود شیخ کو بھی پتا نہیں ہوتا اور اس وقت اس کے سامنے بھی آجاتے ہیں۔ اسی لئے بعض حضرات نے اپنے ملفوظات کے قلمبند کروانے کا بندوبست کیا ہوتا ہے کہ مبادا کسی طالب کی طلبِ صادق کے طفیل دنیائے عرفان کا کوئی موتی اچانک ہاتھ آجائے تو اس کو ضائع ہونے سے بچایا جا سکے۔

تصوف کے سلسلے

جیسا کہ پہلے بتایا گیا یہ سلسلے صحبت کے سلسلے ہیں۔ مقصد کے اعتبار سے سب ایک ہیں یعنی سب کے ہاں نفس کی اصلاح مقصود ہے لیکن ہر ایک نے اپنے اپنے ذرائع اختیار کئے ہیں جن کے اپنے اپنے اصول ہیں۔ مثلاً سلسلہ چشتیہ میں پہلے رذائل کو دور کرنے پر زور دیا جاتا ہے پھر فضائل پیدا کئے جاتے ہیں اور نقشبندیہ میں فضائل کے پیدا کرنے سے رذائل کو بھی دور کیا جاتا ہے۔ سلسلہ قادریہ اور سہروردیہ کے بھی اپنے اصول ہیں۔ جس طرح اپنے شیخ کو اپنے لئے سب سے زیادہ مفید سمجھنے کے ساتھ باقی مشائخ کی تنقیص سے بچنا ضروری ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کسی کی مناسبت جس سلسلے کے ساتھ پیدا فرمائی ہو اس سلسلے سے استفادہ کرتے ہوئے باقی سلسلوں کی تنقیص سے اپنے قلب و ذہن کو بچانا ضروری ہے۔

ایک شیخ کو چھوڑ کر دوسرے شیخ سے بیعت ہونا

شیخ کا انتخاب تا حیات ہوتا ہے کیونکہ کسی کو بھی اصلاح کے بعد جیسا کہ اوپر بتایا گیا اپنے اوپر اچھا گمان نہیں رہتا تاہم بعض دفعہ ایسے حالات پیش آسکتے ہیں جس سے مرید کی اصلاح جو کہ بیعت کا اصل مقصد ہے متاثر ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے اس صورت میں کسی دوسرے شیخ کا ہاتھ پکڑنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے مثلاً

1. شیخ اول کو متبعِ شریعت نہ پانا۔ یعنی بدعت یا اصرارِ کبیرہ پر دیکھنا

اس میں وقت کے مقتدر مفتیانِ کرام کی رائے کو ترجیح ہوگی۔ اپنی رائے کی نہیں کیونکہ رائ علیل علیل کے مصداق ممکن ہے جس چیز کو مرید لازم سمجھتا ہے وہ فی الحقیقت شریعت میں لازم نہ ہو اور جس چیز کو وہ اہم نہیں سمجھتا وہ شریعت میں اہم ہو۔ وہ مفتیان کرام بھی اہل فتویٰ ہونے کے ساتھ ساتھ کاملین بھی ہوں ورنہ ذوق حقیقتِ حال تک پہنچنے میں حائل ہوسکتا ہے۔

2. شیخ اول سے باوجود متشرع، متبعِ سنت ہونے کے مناسبت کا نہ ہونا

بعض دفعہ کسی مجلس میں دوسروں کے بیعت کرنے کی وجہ سے وقتی طور پر دل کسی کی طرف مائل ہو جاتا ہے یا کسی وقت کسی شیخ کے ساتھ وقتی طور پر مناسبت کا احساس ہو جاتا ہے تو اس سے بیعت ہو جاتا ہے۔ بعد میں پتا چلتا ہے کہ اس کے ساتھ مناسبت نہیں ہے تو ترقی رک جاتی ہے اور استفادہ رکتے رکتے بالکل ختم ہو جاتا ہے ایسی حالت میں اگر ساری عمر گزارے تو محرومی کا اندیشہ ہے اس وقت چند احتیاطی تدابیر کے بعد شیخ بدلنے کی تجویز ہوسکتی ہے۔ پہلے اس بات کو دیکھا جائے کہ عدم مناسبت کہیں اپنے نفس کے شر کی وجہ سے تو نہیں مثلاً بعض لوگ فرضِ عین علم کی بجائے کسی علامہ سے بیعت ہونے کو لازم سمجھتے ہیں

تو یہ نفس کا خبط ہے اس کے لئے اس کو دیکھنا ہے کہ شیخ کے پاس اگر ضرورت کے درجے کا علم ہے تو اس کو کافی سمجھے۔ شیخ کا تخصص اصلاح کرنے میں کمال کا ہے علم میں کمال کا نہیں یہ شعبہ ہی دوسرا ہے۔ اس کے لئے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت تھانویؒ کا بیعت ہونا یاد رکھے۔

بعض کو مشائخ کے بارے میں تصرفات اور کرامات کا پتا لگا ہوتا ہے وہ اپنے شیخ میں اس کو نہ پا کر کچھ بدگمان سا ہو جاتا ہے جس سے ترقی رک جاتی ہے اور وہ اس کو عدم مناسبت سمجھ لیتا ہے۔ اس صورت میں اپنی نیت کی درستگی کی ضرورت ہے نہ کہ شیخ کی تبدیلی کی۔

3. شیخ اول کا انتقال کر جانا

اگر ابھی تکمیل نہ ہوئی ہو تو اس کے لئے کسی دوسرے شیخ سے اصلاح کے لئے رجوع کرنا مستحسن ہے دو صورتوں میں۔ جدید شیخ سے تجدیدِ بیعت کے ساتھ یا گزشتہ بیعت کو برقرار رکھتے ہوئے محض تکمیل کے لئے۔ اس میں بھی بہتر یہ ہے کہ جدید شیخ کے ذوق کے مطابق عمل کیا جائے۔

اگر تکمیل ہوئی ہو اور مرید مزید پختگی حاصل کرنا چاہتا ہو تو اس کے لئے بھی جدید شیخ سے بیعت کی جاسکتی ہے یا اس کی نگرانی میں بغیر بیعت کے اپنے آپ کو دیا جاسکتا ہے چنانچہ ہمارے حضرت دادا پیر حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ اول سلسلہ نقشبندیہ سے مجازِ بیعت تھے۔ اپنے شیخ کے انتقال کے بعد چونکہ ابھی طبیعت کو سیری نہ ہوئی تھی، اس لئے سلسلہ چشتیہ میں حضرت میانجیو نور محمد صاحب جھنجھانوی نور اللہ مرقدہٗ سے بیعت فرمائی۔ اور حضرت میانجیو صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے بھی مجازِ بیعت ہوئے جن کے فیوض و برکات سے آج عرب و عجم فیض یاب ہیں۔ حضرت کے اس بیعت کی منظوری دربارِ رسالت سے ہونے کا واقعہ تاریخ مشائخ چشت میں موجود ہے۔

غور طلب

دوسرا شیخ تجویز کرنے پر پہلے شیخ کی شان میں کبھی سُوِ ادبی قولاً و فعلاً، غائباً، حاضراً ہرگز نہ کرے اگرچہ شیخ اول متشرع نہ رہا ہو کہ یہ سخت وبال ہے۔

چاروں سلسلوں کے مشائخ کے اسمائے گرامی

سلسلہ چشتیہ کے سرخیل حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ان کے آگے پھر دو شاخ ہیں چشتیہ صابریہ کے سرخیل حضرت صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ ہیں اور چشتیہ نظامیہ کے سرخیل حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ ہیں، سلسلہ قادریہ کے سرخیل حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ، سلسلہ سہروردیہ کے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ اور سلسلہ نقشبندیہ کے حضرت شیخ بہاؤالدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

شجرہ اور اس کی اہمیت

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مناصب جو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان فرمائے ہیں چار ہیں۔ یعنی قرآن کی تلاوت سکھانا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تزکیہ کرنا، کتاب کی تعلیم دینا اور حکمت کی تعلیم دینا۔ قرآن کی تلاوت کے شعبے کی ذمہ داری قرّاء حضرات نے، تزکیہ کی صوفیاء کرام نے اور علم و حکمت کی علماء کرام نے اٹھائی۔ علماء کرام میں محدثین کرام نے احادیثِ شریفہ کو امت تک محفوظ طریقے سے پہنچانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ اپنی سندوں کی حفاظت کرتے ہیں اور اپنی سندوں کو اس ترتیب سے روایت کرتے ہیں جس ترتیب سے ان تک روایت پہنچی ہوتی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح صوفیاء کرام اپنی نسبت کو اسی ترتیب سے بیان کرتے ہیں جس ترتیب سے ان تک نسبت پہنچی ہوتی ہے۔ نسبت کی اسی ترتیب کا بیان شجرہ کہلاتا ہے۔ بعض حضرات نے اپنا شجرہ منظوم انداز میں چھاپا ہوتا ہے اور برکت کو حاصل کرنے کے لئے اس کو پڑھتے ہیں۔ یہ دعائیہ شکل میں بھی ہوتی ہے اور مریدین اپنی دعا کی قبولیت کے لئے اس نسبت کو بطور وسیلہ پکڑتے ہیں۔

بندہ کی نسبت

بندے کو حضرت صوفی محمد اقبال مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بواسطہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ چاروں سلسلوں میں اور ان ہی سے بواسطہ حضرت مولانا ابوالحسن ندوی رحمۃ اللہ علیہ طریقہ قادریہ راشدیہ میں اور بواسطہ حضرت علی مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ نقشبندیہ میں حضرت سید تنظیم الحق حلیمی رحمۃ اللہ علیہ سے بواسطہ حضرت مولانا فقیر محمد رحمۃ اللہ علیہ کے چاروں سلسلوں میں اور ان ہی سے بواسطہ حضرت سیف الرحمٰن گل بادشاہ المعروف میخ بند باباجی رحمۃ اللہ علیہ سلسلہ قادریہ، نقشبندیہ، معصومیہ مجددیہ میں اور حضرت ڈاکٹر فدا محمد صاحب مدظلہ، سید بشیر احمد رحمۃ اللہ علیہ اور حاجی عبدالمنان صاحب مدظلہ سے بواسطہ مولانا محمد اشرف رحمۃ اللہ علیہ چاروں سلسلوں میں اجازت ہے۔ اس کے علاوہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن صدیقی رحمۃ اللہ علیہ سے بذریعہ مولانا عبیداللہ انور رحمۃ اللہ علیہ طریقہ راشدیہ میں اور بذریعہ مولانا شمس الحق افغانی حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ چار سلسلوں میں اور حضرت مولانا عبدالغفار صاحب مدظلہ سے بذریعہ کثیر مشائخ کے عرب و عجم کے مزید سلسلوں میں اجازت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کے اس حسنِ ظن کو بندے کے حق میں قبول فرما کر اپنی خالص بندگی میں قبول فرمائے۔ آمین۔

طریقت کے سلسلے

سلسلوں کی مثال طب کے مختلف طریقوں کی طرح ہے جیسے ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، یونانی طب اور آکوپنکچر وغیرہ۔ مطلوب صرف صحت ہوتی ہے طب کا طریقہ نہیں اس لئے جس کو جس طریقے سے بھی شفا حاصل ہو تو وہ ٹھیک ہے لیکن اگر وہ یہ کہے کہ باقی طریقے ٹھیک نہیں تو اس کا کہنا غلط ہوگا کیونکہ مقصود جس ذریعے سے بھی حاصل ہو تو ٹھیک ہے البتہ مزاجوں کے فرق سے طریقے کا انتخاب ایک اچھا اصول ہے۔

چار سلسلے چشتیہ، نقشبندیہ، قادریہ اور سہروردیہ ہند و پاک میں زیادہ مشہور ہیں لیکن سلسلے صرف چار نہیں اور بھی ہیں جن میں شاذلیہ، رفاعیہ، کبرویہ،

عبودیہ وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ ان سارے سلسلوں کے اپنے اپنے اصول ہیں جن سے صرف مشائخ کو سروکار ہوتا ہے، عوام کو صرف شیخ سے سروکار ہوتا ہے۔

سوائے نقشبندیہ سلسلے کے باقی سلسلوں کے ہاں سلوک پہلے طے کرایا جاتا ہے جذب کے ذریعے تکمیل ہوتی ہے۔ نقشبندیہ سلسلے میں خواجہ نقشبندؒ نے اس وقت کے حالات کے پیشِ نظر شوقِ سلوک پیدا کرنے کے لئے جذبِ مبتدی کو مقدم کیا اور اس کے لئے طریقہ دریافت کرلیا جس سے جو عشق روح کو اللہ تعالیٰ سے قالب کے ساتھ ملنے سے پہلے تھا اس کو ذکر، شغل اور مراقبہ کے ذریعے یاد دلایا جس سے جذبِ منتہی کی طرح لیکن جذبِ مبتدی پیدا ہوتا ہے لیکن چونکہ اس کا مقصد بنیادی طور پر سلوک کے لئے تیار کرنا تھا اس لئے سلوک طے کئے بغیر سالک کی تکمیل نہیں ہوتی۔ جذب حاصل ہو تو اس کے کچھ توابع ہوتے ہیں مثلاً ایسے شخص کی توجہ کی قوت بڑھ جاتی ہے اور اس کی کیفیات ایسی ہوتی ہیں کہ عوام کا ان کی طرف رجوع ہو جاتا ہے۔ یہ دو چیزیں ایسی ہیں جس کو شیطان استعمال کرسکتا ہے اور سلوک کو طے کرنے میں تاخیر کرا کے نفس کو پھر دل کی حالت دگرگوں کرنے کا راستہ دیا جاتا ہے اور نفس اگر ایسا کر دے تو نہ صرف ایسا سالک اپنے آپ کو خطرے میں ڈال دیتا ہے بلکہ دوسرے سالکین جو اس کی طرف راغب ہوتے ہیں ان کا راستہ بھی مار دیتے ہیں۔ اس چیز کو دور کرنے کے لئے حضرت مجدد صاحبؒ نے اپنے بھائی کو مکتوب نمبر 287 میں اس کی تفصیلات لکھ دیں جن کو احقر نے کتاب "حقیقت جذب و سلوک" میں جمع کر کے اس کی تشریح کے ساتھ چھاپ دیا ہے۔

اس کتاب میں اس کی تفصیل پڑھنی چاہیے کیونکہ یہ حضرت مجدد صاحبؒ کی خواہش کے عین مطابق ہے کہ حضرتؒ کے سلسلے سے تعلق رکھنے والے اس سے آگاہ ہوں تاکہ ان تمام مسائل کے شکار ہونے سے بچ جائیں جن کا حضرتؒ نے اپنے مکتوب میں ذکر کیا ہے۔

چونکہ یہ سلسلہ بقول حضرت تھانویؒ کے عوام کے لئے بہت مفید ہے لیکن عوام ہی ان مسائل کے شکار بھی ہوسکتے ہیں اس لئے اس خطرے کے پیشِ نظر

احقر نے سلوک کو طے کرانے کے لئے اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے یعنی پہلے تذکیر سے کام لیا جائے جیسا کہ تبلیغی جماعت کا معمول ہے اور تذکیر کے ذریعے سلوک طے کرانے کا شوق پیدا کیا جائے اوردو مقامات کو جذبِ مبتدی سے پہلے طے کرایا جائے اس کے بعد جذبِ مبتدی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے جب وہ حاصل ہو تو بقیہ سلوک طے کرایا جائے تو اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ یہ جذبِ منتہی پر منتج ہو جائے۔

سلوک کے دو مقامات جو پہلے طے کئے جائیں گے درج ذیل ہیں۔

(1) توبہ (2) انابت۔یہ دونوں باقی مقامات سلوک کے لئے بنیاد ہیں۔ توبہ سے منفی اعمال سے کٹنا نصیب ہوگا اور انابت سے مثبت اعمال کا اجراء ہوگا۔ یعنی مقامِ توبہ گزشتہ گناہ آلود زندگی سے اپنے آپ کو کاٹنا ہے اور مقام انابت بقیہ زندگی میں شریعت مطہرہ کی پاکیزہ زندگی حاصل کرنے کے لئے استقامت حاصل کرنا ہے۔ باقی مقامات ان دو مقامات کے تفصیلی حصول کے لئے ذرائع ہیں۔ ان بنیادوں کی بنیاد بھی جذب سے پہلے ہو جائے تو کم از کم مجذوب متمکن ہونے سے اِن شاء اللہ حفاظت ہو جائے گی۔

اس کے ساتھ چاروں سلسلوں کے نمائندہ ذکر سے کام شروع ہوگا۔ لاالٰہ الا اللہ، لا الٰہ الا ھو، حق اور اللہ شروع میں ایک ایک تسبیح پھر حسب استطاعت ان میں اضافہ ہوگا۔ اس کے بعد ذکرِ قلبی، روحی، سِرّی، خفی اور اخفیٰ۔ پھر مراقبہ احدیت، پھر مراقبہ توحیدِ افعالی، صفاتِ ثبوتیہ، شیوناتِ ذاتیہ، تنزیہہ و صفاتِ سلبیہ، شانِ جامع، معیت، حقیقتِ کعبہ، حقیقتِ قرآن اور حقیقتِ صلوٰۃ کرایا جائے گا۔ بعد ازاں مراقبہ عبدیت، مراقبہ احسان، حبِ الٰہی، حب فی اللہ، نور اور دعائیہ کرائے جائیں گے۔ ان اذکار و مراقبات سے صرف اتنا جذب حاصل کرنا ہے کہ سالک سلوک طے کرنے کے لئے تیار ہوجائے اور جیسے ہی شیخ کو پتا چلے کہ سالک اتنا جذب حاصل کرچکا ہے کہ سلوک کو طے کر سکتا ہے تو طریق جذب کے حصول کو موقوف کرکے سلوک کے مقامات طے کرانا شروع کیا جائے۔ دو مقامات تو پہلے طے ہوچکے ہوں گے۔ چونکہ ریاضت کے بغیر نفس قابو

نہیں آتا اس لئے اپنے آپ کو اس نیت سے ریاضت کا خوگر بنانا کہ شریعت پر چلنے میں نفس رکاوٹ نہ بنے ضروری ہے۔ نفس زدہ دل میں دنیا کی جو محبت ہوتی ہے وہ دنیاوی چیزوں پر حریص کردیتی ہے جس کا علاج قناعت حاصل کرنا ہے لیکن اگر اس پر عمل نہ ہو تو محض تخیل ہی تخیل رہ جائے گا اس کو عملی جامہ جب پہنایا جاتا ہے تو اس کو زہد کہتے ہیں۔ پھر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے ناپسندیدہ اعمال و افعال سے دور رکھنے کے لئے مقام تقویٰ حاصل کیا جاتا ہے جو ایک حفاظتی قلعہ کی مانند ہے۔ اس مقام کے بعد جو بھی قدم اٹھایا جائے گا تو شریعت کے مطابق اچھی نیت سے اٹھایا جائے گا ان شاء اللہ۔اس کا لازمی نتیجہ صبر ہے کیونکہ صبر کے بغیر تقویٰ قائم نہیں رہ سکتا۔ موہوم خطرات سے بچنے کے لئے مقام توکل لازم ہے بغیر اس کے شریعت پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔ جب یہ گھاٹی گزر جائے تو پھر سالک دل سے اللہ تعالیٰ کے تکوینی و تشریعی احکامات کو تسلیم کرلیتا ہے جو کہ مقام تسلیم ہے۔ اس سے مقام رضا کے لئے رستہ کھل جاتا ہے کہ انسان پھر ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے راضی ہوتا ہے اور جواب میں اللہ تعالیٰ بھی اس سے راضی ہوجاتے ہیں جس کا پتا تو ادھر چلے گا لیکن اس کے آثار یہیں سے شروع ہوجاتے ہیں۔

امور تصوف

اب چند سطروں میں تصوف کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے جو کہ مشہور کتاب "شریعت اور طریقت" سے لیا گیا ہے۔ اس کو بلاشبہ تصوف کا نچوڑ کہا جا سکتا ہے۔

1... مقصود

یہ دو قسم کے ہیں:

1.1... اعمال

اعمال دو قسم کے ہیں۔

1.1.1... سلبی اعمال

سلب کسی چیز کے دور کرنے کو کہتے ہیں۔ پس اس سے اخلاقِ رذیلہ جیسے دنیا کی محبت، ریاء، تکبر، حسد، کینہ، بغض، بے صبری، ناشکری وغیرہ سے چھٹکارہ حاصل کرنا مطلوب ہے۔

1.1.2... جلبی اعمال

جلب کسی چیز کے حاصل کرنے کو کہتے ہیں۔ پس اس سے اخلاقِ حمیدہ جیسے اللہ کی محبت، صبر، شکر، اخلاص، تفویض، تواضع، رضا، صدق وغیرہ کا حاصل کرنا مطلوب ہے۔

1.2... ثمرات

ثمرات (نتائج) بھی دو قسم کے ہیں:

1.2.1... بندگی

بندے کی طرف سے ہمہ وقت بندگی

1.2.2... اللہ تعالیٰ کی طرف سے رضا و قربِ خاص

اللہ تعالیٰ کی طرف سے رضا اور قربِ خاص کا حاصل ہونا جس کو وصول بھی کہتے ہیں۔

2... غیر مقصود

یہ تین قسم کے ہیں:

2.1... ذرائع

ذرائع دو قسم کے ہوتے ہیں:

2.1.1... مجاہدہ

جس میں کم بولنا، کم کھانا، کم دیکھنا، کم مطالعہ ، کم سونا اور ناجنس یعنی جن سے ملنے میں نقصان کا اندیشہ ہو ان سے کم یعنی صرف بضرورت ملنا جلنا شامل ہیں۔اس کے علاوہ کچھ نفسیاتی مجاہدات بھی ہوتے ہیں ۔لیکن ان سب کی ضرورت صرف فرائض واجبات کی تکمیل اور حرام اور مکروہ تحریمی سے بچنے تک ہے۔ اس کے بعد سنتوں پر بتدریج عمل بڑھانا ہوتا ہے کیونکہ اس پر عمل بڑا مجاہدہ ہے۔ اس سے باقی تکمیل ہوجاتی ہے۔

2.1.2... فاعلہ

یہ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں یعنی وہ جو مفید ہیں اور ان میں کوئی خطرہ بھی نہیں ان میں ذکر، شغل اور مراقبہ آتے ہیں اور وہ جو مفید تو ہیں لیکن ان میں خطرہ بھی ہے۔ ان میں تصورِ شیخ، عشقِ مجازی اور سماع آتے ہیں۔

2.2... توابع

یعنی سلوک میں ان سے (کوئی چاہے یا نہ چاہے) پالا پڑسکتا ہے اور یہ سب

غیر اختیاری ہیں۔ یہ بھی دو قسم کے ہیں یعنی وہ جن میں نقصان کا احتمال ہے اور وہ جن میں کوئی نقصان نہیں۔

2.2.1... وہ توابع جن میں نقصان کا احتمال نہیں

ان میں چند درج ذیل ہیں:

2.2.1.1... اجابتِ دعا

دعاؤں کا قبول ہونا۔

2.2.1.2... الہام

کسی ولی کے دل میں حق تعالیٰ کی طرف سے کسی بات کا القاء ہو جانا۔

2.2.1.3... رویائے صالحہ

اچھے خوابوں کا نظر آنا۔

2.2.1.4... فراستِ صادقہ

یعنی سچی اٹکل جو واقع کے مطابق ہو۔ اس کو بصیرت بھی کہتے ہیں۔

2.2.1.5... فناء

رذائل کا دل سے اتر جانا فناء ہے

2.2.1.6... بقاء

فناء کا بھی دل سے اتر جانا یعنی خود فناء کے حاصل ہونے کو نہ جاننا بقاء ہے۔ بعض لوگ اس کو فناء الفناء بھی کہتے ہیں۔

2.2.1.7... وحدۃ الوجود بغیر سکر

دل کا صرف اللہ سے متعلق ہونا اور مخلوقات سے اثر نہ لینا باوجود اس کے

کہ ان کو جانتا ہو کہ موجود ہیں جیسے سورج ہو تو تارے نظر نہیں آتے۔

2.2.1.8... وجد

کسی عجیب و غریب محمود حالت کا طاری ہو جانا۔

2.2.2... وہ توابع جن میں نقصان کا احتمال ہے

وہ یہ ہیں:

2.2.2.1... اِستغراق

کسی کیفیت میں ہمہ تن متوجہ رہ کر باقی چیزوں کو بھول جانا۔

2.2.2.2... تصرف

اپنی ہمت و توجہ سے کسی شخص یا چیز کو متاثر کرنا۔

2.2.2.3... سکر کے ساتھ وحدۃ الوجود

یعنی وحدۃ الوجود میں بغیر قصد کے شرعی تشریحات کا ذہن میں نہ ہونا اور ایسی باتوں کا منہ سے نکل جانا جس پر شریعت گرفت کرتی ہو۔

2.2.2.4... قبض و بسط

وارداتِ قلبی کا موجود نہ ہونا قبض اور اسکا موجود ہونا بسط کہلاتا ہے۔ دل پر منجانب اللہ جو کیفیات القاء کی جاتی ہیں ان کو وارداتِ قلبی کہتے ہیں۔

2.2.2.5... مشاہدہ

کسی امر یا ہستی کا کامل استحضار۔ اس کو کیفیتِ حضوری بھی کہتے ہیں۔ اس میں سالک کو اپنے آپ کی خبر نہیں رہتی اس لئے اس سے ایسی حرکات کا ظہور ہو سکتا ہے جو عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں۔

2.2.2.6... کرامت

کسی نیک مسلمان کے ہاتھ سے ایسے کام کا ہوتے نظر آنا جو کہ عام فطری قوانین کے مطابق ممکن نہ ہو۔

2.2.2.7... کشفِ الٰہی

ذات و صفات الٰہی سے متعلق علوم و اسرار و معارف کا قلب پر وارد ہونا۔

2.2.2.8... کشفِ کونی

یعنی جن کو عام لوگ نہیں دیکھ سکتے ان کا نظر آنا، چاہے وہ گزشتہ وقت کے حالات ہوں یا آئندہ کے واقعات، یا غائب چیزیں دور یا قریب کی ہوں۔

2.3... موانع

وہ امور جن سے سالک اپنے مقصد سے دور ہٹ جاتا ہے اور اگر اس کی اصلاح نہ کی گئی تو عبادالرحمٰن کی بجائے عبادالشیطان میں سے ہو سکتا ہے۔ وہ یہ ہیں۔

2.3.1... حسن پرستی

کسی شخص کے حسن میں ایسا محو ہو جانا کہ شریعت کے احکامات کی پرواہ نہ رہے۔ یہ انتہائی مذموم حرکت ہے۔ صوفیاء کے کلام سے بعض لوگوں کو اس کا شبہ ہو جاتا ہے جس کی ناسمجھی سے غلط تعبیر کر کے اپنی عاقبت خراب کر بیٹھتے ہیں۔ چاہے وہ شخص عورت ہو یا مرد یا امرد۔ اللہ تعالیٰ بچائے۔ آمین

2.3.2... تعجیل

کسی کیفیت کو حاصل کرنے کے ایسے درپے ہو جانا کہ راہِ سلوک کی احتیاطیں پیشِ نظر نہ رہیں۔ اس سے سالک کا دل پریشان ہو کر ہمت ہار جاتا ہے۔ بسا اوقات شیخ کے ساتھ بدگمانی تک ہو جاتی ہے۔

2.3.3... تصنع

سالک کو جو حالت حاصل نہیں ہے اس کا حاصل کیا ہوا اپنے آپ کو دکھانا۔

2.3.4... مخالفتِ سنت

سلوک کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جو سنت کا مخالف ہو اس لئے سنت کی مخالفت کا کوئی راستہ نہیں۔ سالک کا کسی امر میں قصداً سنت کی مخالفت اس کو سلوک سے بہت دور گرا دیتا ہے۔

2.3.5... مخالفتِ شیخ

سلوک میں شیخ کے بتائے ہوئے طریقے کی مخالفت کرنا۔

2.4... خواطر

خیالات کو کہتے ہیں۔ خیال کے مراتب پانچ ہیں۔

2.4.1... ہاجس

جب کوئی بات قلب میں ابتداءً واقع ہوئی اور نفس نے اس کو ابھی لیا نہیں اس کو ہاجس کہتے ہیں۔

2.4.2... خاطر

اگر اس شخص کو توفیق ہوئی اور اول ہی سے اس کو دفع کر دیا تو اس کے بعد والے حالات سے بچ گیا اور اگر نفس اس کی طرف متوجہ ہوا مگر اس کے کرنے نہ کرنے کا کوئی منصوبہ نفس نے فی الحال نہیں باندھا اس کو خاطر کہتے ہیں۔

2.4.3... حدیثِ نفس

جب نفس کرنے نہ کرنے کے برابر درجہ میں منصوبہ باندھنے لگے اور ان سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ ہو تو اس کو حدیثِ نفس کہتے ہیں۔

2.4.4... ہم

جب نفس میں فعل یا عدم فعل کا منصوبہ ترجیح فعل کے ساتھ ہونے لگا، لیکن وہ ترجیح قوی نہیں، بلکہ مرجوح ہے۔ جیسا کہ وہم ہوتا ہے اس کو ہمّ کہتے ہیں اس پر ثواب بھی ہوتا ہے اگر وہ خیر میں ہے اور عتاب بھی ہوتا ہے اگر وہ شر میں ہے البتہ اس مرتبے میں آدمی کے واپس ہونے کا مکان زیادہ ہوتا ہے۔

2.4.5... عزم

پھر جب فعل کا رجحان قوی ہو گیا یہاں تک کہ جازم مصمم بن گیا اس کو عزم کہتے ہیں۔ اس پر بھی اس کے مطابق ثواب ہوتا ہے اگر خیر میں ہے اور عتاب ہوتا ہے اگر شر میں ہے۔

حاصل مطالعہ

ان امور کے تعارف سے اب پتا چل چکا ہو گا کہ یہ سب شریعت پر عمل کرنے کے لئے ہیں اور عوام میں جو یہ مشہور ہو گیا ہے کہ طریقت اور چیز ہے اور شریعت اور چیز، یہ اس حد تک تو ٹھیک ہے کہ ان کی محنت کے میدان الگ الگ ہیں کیونکہ شریعت تو جو کام کرنے کے ہیں اور جن چیزوں سے بچنا ہے، کا علم ہے اور طریقت اس پر عمل کرنے میں جو رکاوٹیں ہیں، ان کو دور کرنے کے طور طریقے ہیں۔ اخلاص کے بغیر شریعت ایسے ہی ہے جیسا کہ پھل کا چھلکا اور شریعت کے بغیر طریقت ایسے ہی ہے جیسا کہ فلسفہ اور جوگ۔ جب سلوک کی حقیقت معلوم ہوگئی تو اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس میں نہ تو کشف و کرامات ضروری ہیں نہ قیامت میں بخشوانے کی ذمہ داری ہے، نہ دنیا میں کاربر آری کا وعدہ ہے کہ تعویذ گنڈوں سے کام بن جائیں یا مقدمات دعا سے فتح ہو جائیں یا روزگار میں ترقی ہو یا جھاڑ پھونک تعویذات سے بیماری جاتی رہے یا ہونے والی بات بتا دی جایا کرے، نہ تصرفات لازم ہیں کہ پیر کی توجہ سے مرید کی از خود اصلاح ہو جائے۔ اس کو گناہ کا خیال بھی نہ آئے، خودبخود عبادت کے کام

ہوتے رہیں۔ مرید کو ارادہ نہ کرنا پڑے یا ذہن و حافظہ بڑھ جائے۔ نہ ایسی باطنی کیفیات پیدا ہونے کی ضمانت کہ عبادت کے وقت لذت سے سرشار رہے، عبادت میں کوئی خطرہ ہی نہ آئے یا یہ کہ خوب رونا آئے یا ایسی محویت ہو جائے کہ اپنی پرائی خبر نہ رہے، اور نہ ذکر و شغل میں انوار وغیرہ کا نظر آنا نہ کسی آواز کا سنائی دینا ضروری ہے۔ نہ اچھے خوابوں کا نظر آنا یا الہامات کا ہونا لازمی ہے۔ بس اصل مقصود حق تعالیٰ کی رضا ہے اسی کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے، جو ان کے نصیب میں ہوتی ہے جن کو خشیت حاصل ہوتی ہے۔ ان تمام کے حاصل کو اگر تقویٰ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا اور تقویٰ ایمان کے ساتھ جب جمع ہو تو اَلَا۔ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ جس کا ترجمہ ہے کہ آگاہ رہو کہ بیشک جو اللہ تعالیٰ کے دوست ہیں ان کو نہ خوف لاحق ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے، (یونس:63-62) اس کے مصداق ولایت کے حصول کا باعث ہوسکتا ہے پھر جتنا تقویٰ میں ترقی اتنی ولایت میں ترقی جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِندَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ" جس کا مفہوم یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ زیادہ مکرم ہے جو زیادہ متقی ہے۔ (الحجرات:13)

سالک کے لئے مفید کتب

کتب تفاسیر

"معارف القرآن" مؤلفہ حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ، "تفسیر عثمانی" اور "تفسیر مظہری"

کتب احادیث

"ریاض الصالحین" اور "معارف الحدیث" مؤلفہ مولانا منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

کتب فقہ

"بہشتی زیور" مؤلفہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور "تعلیم

الاسلام" مؤلفہ مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ

کتب تصوف

زیر نظر کتاب "فہم التصوف"، بندہ کی کتاب "تصوف کا خلاصہ"
حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے افادات پر مشتمل کتاب "شریعت و طریقت"
حضرت مولانا محمد اشرف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "سلوک سلیمانی" 3 جلدیں
اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے " مواعظ" اور "ملفوظات"

کتب فضائل

حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کی "فضائلِ اعمال"، " فضائلِ درود شریف" اور "فضائل حج"

ضروری غور طلب

اگر شرعی رکاوٹ نہ ہو تو اپنا حال بالمشافہ یا بذریعہ ٹیلیفون شیخ کو بتائے، نہیں تو خط کے ذریعے (خواتین کے لئے بالمشافہ رابطہ زیادہ مناسب نہیں ہے)

شیخ کی جو تحقیق ہو اس کو جاننے کے بعد اس پر پورا پورا عمل کرنے کی کوشش کی جائے اور اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آرہی ہو تو پھر پوچھ لیا جائے۔

اپنے شیخ کو کل عالم میں اپنے لئے سب سے بہتر سمجھیں۔ یہ نہیں کہ اس کو سب سے افضل سمجھیں کیونکہ اس کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ کو ہی ہے اور فقیر تو بہت گنہگار ہے اللہ تعالیٰ ستاری فرمائے۔ آمین

روحانی اصلاح کے لئے صرف اپنے شیخ سے تعلق رکھیں۔ کبھی کسی اور پر اپنا حال ظاہر نہ کریں اس سے بعض اوقات سخت نقصان ہوسکتا ہے۔ اسی کو توحیدِ مطلب کہتے ہیں۔ بقول حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

چار حق مرشد کے ہیں رکھ ان کو یاد   اطلاع و اتباع و اعتقاد و انقیاد

فقیر سے متعلق حضرات کے لئے ابتدائی ہدایات

بیعت کے وقت کی تعلیم میں جو کچھ بتایا گیا ہے اس کو فقیر کی طرف سے بھی سمجھا جائے۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل باتوں کا بھی خیال رکھا جائے۔

فقیر کے دیئے ہوئے ذکر کے ساتھ کلمہ سوم 100 بار، درود شریف 100 بار، استغفار 100 بار صبح شام ذکر کیا جائے۔ ہر نماز کے بعد 33 بار سبحان اللہ، 33 بار الحمدللہ، 34 بار اللہ اکبر۔ تین بار درود شریف پڑھیں۔ تین بار کلمہ طیبہ اور تین بار استغفار کا ذکر کیا جائے اور ایک بار آیت الکرسی کی تلاوت کی جائے۔

نوافل کا جو معمول ہو اس کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے اگر نہ ہو سکے تو فقیر کے ساتھ اس کے بارے میں مشورہ کیا جائے۔ خود سے اپنے لئے نوافل یا نفلی عبادت کا معمول مقرر نہ کیا جائے۔

جمعہ کے دن اور جمعہ کی رات درود شریف کی کثرت اور جمعہ کے روز سورۃ کہف کی تلاوت کا خاص خیال رکھا جائے اور جمعہ کے آخر وقت میں اپنے لئے، فقیر کے لئے اور پوری امت کے لئے دعائیں کرنے کی کوشش کی جائے۔

روزانہ کم از کم آدھا پارہ تلاوت کیا جائے۔ اگر قرأت نہ کرسکتا ہو تو جلد از جلد اس کو سیکھنے کی اور اگر مخارج درست نہ ہوں تو ان کی درستگی کا بندوبست کیا جائے۔

اپنے ہاتھ، زبان اور قلم کے شر سے ہر کسی کو بچائیں۔ جس چیز میں نہ دین کا فائدہ ہو نہ دنیا کا اس میں مشغول ہونے کو سب سے بڑی حماقت جانیں اور اس سے بچیں۔ کوشش کی جائے کہ بشرطِ تحمل ہر کسی کو فائدہ پہنچایا جائے اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرے اور خود کوشش بھی۔ خط کشیدہ بات کے لئے فقیر سے مشورہ مفید ہوگا۔

بیویوں اور بچوں کے بارے میں اس بات کی کوشش کی جائے کہ نہ تو ان پر ظلم ہو چاہے اس کے لئے کوئی بھی آمادہ کرے اور نہ ہی ان کے لئے کسی پر ظلم ہو۔ ان کو فتنہ کہا گیا ہے۔ اس لئے ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈریں۔

جس بات کی تحقیق نہ ہو اس کو آگے نہ پھیلائیں۔ بالخصوص جس میں کسی مسلمان کی تذلیل کا پہلو نکلتا ہو نیز مجلس میں یا کسی بھی موقع پر کسی کا مذاق اڑانا، اس کو برے نام سے پکارنا، اس کی نسل یا پیشے پر انگلی اٹھانا سخت ممنوع ہے۔

جو چیزیں اختیاری ہیں مثلاً نماز، روزہ یا شریعت میں مطلوب دوسرے اعمال، ان میں سستی نہ کریں اور جو چیزیں غیر اختیاری ہیں مثلاً مزہ، شوق و ذوق یا دوسرے احوال وغیرہ جو محض وہبی ہیں ان کی فکر نہ کریں پھر ان دونوں میں جو حاصل ہوں اس پر شکر کریں۔ اختیاری اعمال میں کوتاہی پر استغفار اور ندامت کے ساتھ آئندہ کوشش کا عزم ہو اور غیر اختیاری احوال میں جو محمود احوال حاصل نہ ہوں ان میں اپنے لئے خیر سمجھیں۔

گھر میں بہشتی زیور کا رکھنا بہت مفید رہتا ہے۔ اس میں اہلِ سنت و الجماعت کے عقائد لکھے گئے ہیں ان کے مطابق عقائد رکھے جائیں اور ضرورت کے وقت مسائل بھی معلوم ہوسکتے ہیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ اور ملفوظات کا مطالعہ روحانی ترقی کے لئے بہت مفید ہے۔

مرد متعلقین کو اپنی بیویوں کے حقوق واجبہ کا بہت خیال رکھنا چاہیے۔ جو اولاد والے ہیں ان کو اولاد کی تربیت کی طرف خوب توجہ کرنی چاہیے۔ جو شادی شدہ نہیں ان کو اپنی حفاظت کے لئے فقیر سے فوراً مشورہ کرنا چاہیے۔ اس طرح جن خواتین کا فقیر کے ساتھ اصلاح کا تعلق ہے اگر وہ شادی شدہ ہیں تو ان کو اپنے شوہروں کی دل سے خدمت کرنی چاہیے اور اولاد کی تربیت میں شوہر کی مدد کرنی چاہیے۔ اگر وہ شادی شدہ نہیں ہیں تو اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ اچھا وقت گزارنا چاہیے اور مناسب رشتہ ملے تو انکار نہیں کرنا چاہیے۔

1.1... اعمال

دو قسم کے ہیں

(1) سلبی اعمال یعنی اخلاقِ رذیلہ

(2) جلبی اعمال یعنی اخلاقِ حمیدہ

ان دونوں کے جاننے کے لئے پہلے اخلاق کا تعارف ضروری ہے کہ وہ کیا ہیں۔ اس لئے اس سے ابتدا کی جاتی ہے۔

اخلاق

اخلاق خُلق کی جمع ہے۔ خَلق اور خُلق دو جدا جدا لفظ ہیں۔ خَلق سے مراد صورتِ ظاہری ہے اور خُلق سے مراد صورتِ باطنی ہے۔ کیونکہ انسان جس طرح جسم سے ترکیب دیا گیا ہے اور ہاتھ پاؤں اور آنکھ کان وغیرہ اعضاء اس کو مرحمت ہوئے ہیں۔ جن کا قوتِ بصارت یعنی چہرے کی آنکھیں ادراک کر سکتی ہیں، اس طرح انسان روح اور نفس سے ترکیب دیا گیا ہے اور اس کا ادراک بصیرت یعنی دل کی آنکھ کرتی ہے۔ یہ ترکیب ان ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتی اور ان دونوں ترکیبوں میں حق تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو جدا جدا صورت اور قسم قسم کی شکلوں پر پیدا فرمایا ہے۔ کہ کوئی صورت اور سیرت حسین اور اچھی ہے اور کوئی سیرت اور صورت بری ہے بھونڈی ہے۔ ظاہری ہئیت اور شکل کو صورت کہتے ہیں اور باطنی شکل اور ہئیت کو سیرت کہتے ہیں۔ سیرت کا مرتبہ صورت سے بڑھا ہوا ہے کیونکہ اس کو حق تعالیٰ نے اپنی جانب منسوب کیا ہے چنانچہ "وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوحِىْ" یعنی آدم علیہ السلام کے پتلے میں میں نے اپنی روح کو پھونک دیا۔ (الحجر:29) اس آیت کریمہ میں روح کو اپنا کہہ کر ذکر فرمایا "قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّىْ" یعنی اے محمد ﷺ کہہ دیجئے کہ روح میرے پروردگار کا امر ہے۔ (الإسراء:85) اس میں اس امر کا اظہار فرمایا ہے کہ روح امرِ ربّی ہے اور جسم کی طرح سفلی اور خاکی نہیں ہے۔ کیونکہ جسم کی نسبت مٹی کی جانب فرمائی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے "اِنِّىْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ" میں ایک انسان مٹی سے بنانے

والا ہوں۔ (ص: 71) اس مقام پر روح سے مراد وہ شے ہے جو حق تعالیٰ کے الہام اور القاء سے اپنی اپنی استعداد کے موافق اشیاء کی معرفت اور ادراک حاصل کر سکتی ہے۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ زیادہ قابلِ لحاظ امرِ ربانی یعنی سیرتِ انسانی ہے کہ جب تک اس باطنی ترکیب کی شکل اور ہیئت میں حسن موجود نہ ہوگا اس وقت تک انسان کو خوب سیرت نہیں کہا جا سکتا اور چونکہ اس صورت کے اعضاء ہاتھ پاؤں کی طرح سیرت کو بھی اللہ تعالیٰ نے باطنی اعضاء مرحمت فرمائے ہیں جن کے نام قویٰ طبعیہ، قویٰ سبعیہ، قویٰ ادراکیہ ہیں جو بالترتیب نفس، قلب اور عقل سے ناشی ہیں۔ تحسینِ سیرت ان اعضاء کی حالت پر دو طرح منحصر ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ان سارے اعضاء میں اعتدال پایا جائے اور دوسرا ان میں کوئی بیماری نہ ہو۔ اب ان کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

1. قویٰ طبعیہ جو نفس سے ناشی ہیں

قرآن سے ثابت انسان کے نفس کی تین حالتیں ہیں۔ نفسِ امارہ، نفسِ لوامہ اور نفسِ مطمئنہ۔ نفسِ امارہ کی حالت بیماری کی ہے اور نفسِ مطمئنہ صحت کی حالت ہے اور نفسِ لوامہ اس کی درمیانی حالت ہے جس میں بیماری اور صحت ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ نفس کا کام چونکہ جسم کی ضروریات اور خواہشات ہیں۔ اس لئے اس کی تفریط یہ ہے کہ اس کی ضروریات بھی پوری نہ ہوں جس کے لئے فرمایا گیا ہے "اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا"(البخاري) اور اس کی افراط یہ ہے کہ نفس کو اپنی خواہشات پوری کرنے دیا جائے اور اس پر روک ٹوک نہ ہو جس سے قرآن میں وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا کے الفاظ میں ڈرایا گیا ہے اور حدیث شریف میں ایسے شخص کو بے وقوف فرمایا گیا ہے۔ اس کا اعتدال یہ ہے کہ اس کی ضروریات پوری کی جائیں اور ناجائز خواہشات کو پورا نہ ہونے دیا جائے۔

انسان کی طبعیت جن چیزوں کو پسند نہیں کرتی ان کو دور کرنا چاہتا ہے جس قوت سے یہ کام لیا جاتا ہے وہ قوت غضب ہے۔ اسکے اعتدال کا نام شجاعت ہے

اور یہی عنداللہ پسندیدہ ہے۔ کیونکہ اگر اس میں زیادتی ہوگی تو اس کا نام تہوّر اور بے باکی ہوگا۔ اور اگر کمی ہوگی تو بزدلی کہلائے گی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں حالتیں ناپسندیدہ ہیں۔ حالتِ اعتدال یعنی شجاعت سے لطف و کرم، دلیری و جودت و بردباری، استقلال، نرمی و ملاطفت اور غصہ کے ضبط کا مادہ نیز ہر کام میں دور اندیشی و وقار پیدا ہوتا ہے۔ اور اگر زیادتی ہوتی ہے تو ناعاقبت اندیشی، ڈینگ مارنا، شیخی بگھارنا، غصہ سے بھڑک اٹھنا، تکبر اور خود پسندی پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر اس میں کمی ہوتی ہے تو بزدلی و ذلت بے عزتی، کم ہمتی، خساست، کمینہ پن اور وہ حرکات ظاہر ہوتی ہیں جو چھچھورپن کہلاتی ہیں۔

انسان کو طبعاً جو چیزیں پسند ہوتی ہیں ان کو اپنانا چاہتا ہے۔ جو قوت اس میں کارفرما ہوتی ہے اس کو قوتِ شہوت کہتے ہیں۔ اس کی حالتِ اعتدال کا نام پارسائی ہے۔ اگر یہ اپنے حدِ اعتدال سے بڑھ جائے تو حرص و ہوا کہلائے گی اور گھٹ جائے تو بے کارِ محض ہو کر معاشرے کا عضوِ معطل ہو جاتا ہے۔ حالتِ معتدل یعنی پارسائی اللہ پاک کو پسند ہے اور اس سے جو فضائل پیدا ہوتے ہیں وہ سخاوت، حیا، صبر، قناعت و اتقاء کہلاتے ہیں۔ طمع کم ہو جاتی ہے۔ خوف و خشیت اور دوسروں کی مدد کرنے کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور اعتدال سے بڑھنے اور گھٹنے سے حرص و لالچ، خوشامد، چاپلوسی، امراء کے ساتھ تذلل، اور فقراء کو بنظرِ حقارت دیکھنا، بے حیائی، فضول خرچی، ریا، تنگ دلی، نامردانگی اور حسد وغیرہ خصائلِ بد پیدا ہوتے ہیں۔ نفس کے ان دونوں قسم کے رذائل پر عمل نہ کرنا اور اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا یہ تقوٰی ہے جو ان رذائل سے وجود میں آتا ہے گویا کہ فجور کے الہام کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے رد کر کے تقوٰی کے الہام کو اختیار کرتا ہے۔

2. قویٰ سبعیہ جو قلب سے ناشی ہیں

قرآن میں قلبِ سلیم کا لفظ ان آیات کریمہ يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُونَ اِلَّا مَنْ أَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ میں آیا ہے۔ یعنی صحت مند دل تو اسکا مطلب ہے بیمار دل بھی ہو گا جس کو سلیم بنایا گیا ہو گا۔ دل چونکہ جذبات، محبت، نفرت، ایمان

وکفر کی جگہ ہے اس لئے اس کی سب سے پہلی اصلاح تو ایمان کا حصول ہے۔ اس کے بعد اس کی بیماریوں کا علاج کیا جائے گا تو قلبِ سلیم بنے گا۔ اس کی سب سے بڑی بیماری دنیا کی محبت ہے اور اس کی سب سے اچھی حالت اللہ تعالیٰ کی محبت سے اس کا سرشار ہونا ہے۔ دنیا کی محبت حبِ جاہ کی صورت میں یا حبِ باہ اور حبِ مال کی شکل میں ہو بیماری ہے لیکن اس میں بھی حدود ہیں۔ مال سے اتنی بے اعتنائی کہ ضائع ہو، حبِ باہ کی اتنی کمی کہ حقِ زوجیت بھی ادا نہ کرسکے اور حبِ جاہ سے اتنی بے پرواہی کہ عزتِ نفس کی حفاظت بھی نہ ہو یہ ان کی تفریط کی حالت ہے جبکہ مال اور لذتوں کی اتنی طلب کہ جائز و ناجائز کی پرواہ نہ رہے، اور جاہ کی ایسی محبت کہ دوسروں کو حقیر سمجھیں یا اس کے حصول کے لئے غیر شرعی امور کا مرتکب اس کی افراط ہے اور ان کا اعتدال مال کی اتنی محبت کہ مال کو ضائع نہ کرے، لذتوں اور جاہ کے حصول میں شریعت کی حدود کا خیال رکھے۔

3. قویٰ ادراکیہ جو عقل سے ناشی ہیں

قرآن میں عقلمندوں کو اولوالباب کہا گیا ہے جو کھڑے بیٹھے لیٹے ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور مخلوقات میں غور کرتے ہیں۔ اس طرح ایمان کی دعوت کے لئے لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ کا لفظ آیا ہے اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ جس کو عقل نہیں اس کا دین نہیں۔ عقل کا کام سوچ بچار، تجزیہ، تقابل اور فیصلہ کرنا ہے۔ یہ حافظے میں معلومات رکھتی ہے اور اس کی بنیاد پر اپنا کام چلاتی ہے۔ اس کے ذریعے جذبات پر قابو پایا جاسکتا ہے اور تذکیر کے ذریعے اس کو اس کا اصل کام یاد دلایا جاسکتا ہے۔ یہ نفس اور جذبات سے متاثر ہو سکتی ہے لیکن یہ اس کی بیماری کی حالت ہے۔ اس کی صحت کی حالت یہ ہے کہ ایمان کی روشنی میں آفاقی تعلیمات سے متاثر ہو کر دنیا میں قلب کے جذبات کو اعتدال پر رکھنے کا اور نفس کو قلب کے ذریعے مجاہدے کے لئے تیار کر کے اس کو شریعت کا پابند بنائے۔ عقل کی تفریط کی حالت حماقت اور افراط کی حالت مکاری کہلاتی ہے اور اس کا اعتدال حکمت ہے جس کے لئے فرمایا گیا: وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ

خَیْراً کَثِیْراً" اور جسے سمجھ دی گئی تو اسے بڑی خوبی ملی۔ (البقرۃ:269)

اللہ تعالیٰ نے عقل کی نعمت انسان کو عطا فرمائی کہ اس کے ذریعے انسان اپنے علم سے کام لے سکتا ہے کیونکہ محض علم کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کے استعمال کے لئے عقل کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ معلومات تو کافی رکھتے ہیں لیکن ان کے استعمال کا ان کو سلیقہ نہیں ہوتا جس کی وجہ ان میں عقل کی کمی ہوتی ہے۔ کم عقل لوگوں پر جذبات زیادہ حاوی ہوتے ہیں اور عقلمند لوگ جذبات کے حاکم ہوتے ہیں۔ قوتِ عقل میں اگر اعتدال ہوتا ہے تو انسان مدبر، منتظم، ذکی اور سمجھ دار ہوتا ہے۔ اس کی رائے صائب (درست) ہوتی ہے اور ہر مضمون میں اس کی طبیعت چلتی ہے اور جودت دکھلاتی ہے اور اگر حدِ اعتدال سے بڑھ جائے تو دھوکہ بازی، فریب دہی اور مکاری کہلاتی ہے۔ اور اگر عقل کی قوت میں کسی قسم کا نقصان اور ضعف ہوگا تو کند ذہنی و حماقت اور بیوقوفی کہلائے گی۔ جس کا اثر یہ ہوگا کہ ایسا آدمی جلدی دوسرے کے دھوکے میں آجائے گا۔

حالتِ اعتدال کی اہمیت

جب انسان کے یہ تینوں قویٰ حالتِ اعتدال پر آجائیں تو اس کی حالت قابلِ اطمینان اور لائقِ تعریف ہو جاتی ہے۔ اس وقت انسان صاحبِ حسنِ خُلق اور خوب سیرت کہلائے گا۔ اصل میں یہ ان قویٰ کی تہذیب کی علامت ہے۔غرض جس وقت یہ ساری قوتیں حدِ اعتدال پر ہونگی تو اس وقت انسان کو خوب سیرت کہا جائے گا۔ کیونکہ اعتدال سے بڑھنا اور گھٹنا دونوں حالتیں حسن سے خارج ہیں۔ "خَیْرُ الْأُمُوْرِ أَوْسَطُھَا" نیز حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہمارے بندے وہ ہیں کہ نہ وہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل بلکہ اس کے بین بین حالت پر رہتے ہیں۔ جس طرح حسن ظاہری میں کمی و بیشی ہوتی ہے کہ کوئی زیادہ خوب صورت ہے اور کوئی کم اسی طرح حسنِ باطنی میں بھی لوگ متفاوت ہوتے ہیں۔ پس سب سے زیادہ حسین سیرت تو سرور عالم رسول مقبول ﷺ ہیں کہ آپ کی شان میں یہ

آیت کریمہ "وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ" (القلم:4) نازل ہوئی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اور بیشک آپ عظیم اخلاق پر فائز ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جس مسلمان کو آپ کے اخلاق کے ساتھ جتنی مناسبت ہوگی اسی قدر اس کو حسین سیرت کہیں گے اور ظاہر ہے کہ سیرت باطنی میں جس قدر بھی جس کو حسن حاصل ہوگا اسی قدر اس کو سعادت اخروی حاصل ہوگی۔ اخلاق سب فطری جبلی ہیں۔ اور درجہ فطرت میں کوئی خلق نہ مذموم ہے نہ محمود بلکہ مواقع استعمال سے ان میں مدح و ذم آجاتی ہے۔ "مَنْ أَعْطٰی لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيْمَانَ" (رواہ الترمذی)۔ یعنی جس نے اللہ ہی کی رضا کے لئے دیا، اور اللہ ہی کی رضا کے لئے روکا تو اس کا ایمان مکمل ہوا۔ اس میں أَعْطٰی اور مَنَعَ دونوں کے ساتھ لِلّٰهِ کی قید ہے جس سے معلوم ہوا کہ سخاوت مطلقاً محمود نہیں نہ بخل مطلقاً مذموم ہے۔ بلکہ اگر خدا کے لئے ہو تو دونوں محمود ہیں ورنہ دونوں مذموم ہیں۔ اخلاقِ ذمیمہ جن سے نفس کا تزکیہ کرانا ضروری ہے، یوں تو بہت ہیں مگر اصول یہی ہیں جن کا آئندہ ذکر آئے گا اِن شاءاللہ تعالیٰ اور ان میں باہم ایسا تعلق ہے کہ ایک کے ساتھ دوسرا اور دوسرے کے ساتھ تیسرا لگا ہوا ہے۔ اس لئے جب تک سب ہی سے نجات نہ ملے گی اس وقت تک نفس قابو میں نہ آئے گا۔ اور ایک کی اصلاح کرنا اور دوسرے سے بے پرواہ رہنا اس سے کچھ نفع نہ ہوگا، کیونکہ جو شخص دس بیماریوں میں گرفتار ہو وہ تندرست اس وقت کہلایا جا سکتا ہے جب کہ اس کی دسوں بیماریاں جاتی رہیں۔ جس طرح کوئی خوب صورت آدمی حسین اسی وقت کہلایا جا سکتا ہے جبکہ ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان غرض سارے اعضاء مناسب ہوں اور خوبصورت ہوں۔ اسی طرح انسان کو حسن خُلق اسی وقت حاصل ہوگا جبکہ اس کی تمام باطنی حالتیں قابلِ تعریف اور پسندیدہ ہوں۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ مسلمان وہی ہے جس کا خُلق کامل ہو اور مومنین میں افضل وہی ہے جس کا خلق سب سے بہتر ہو پس اسی اصل کا نام دین ہے۔ اور اسی کی تکمیل کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں تشریف لائے تھے۔

بعض لوگ اخلاق کو مروت کے معنیٰ میں لیتے ہیں جو کہ صرف اخلاق کا جزو ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتا ہے۔ بات چیت اچھی طرح کرتا ہے یا کسی کے کام کوئی آتا ہے تو کہتے ہیں کہ اس کے بہت اچھے اخلاق ہیں اور ملنسار ہے وغیرہ وغیرہ حالانکہ اوپر اخلاق کے بارے میں تفصیل جاننے سے پتا چلا کہ یہ صرف اخلاق کا جزو ہوسکتا ہے اور وہ بھی اس صورت میں جب یہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہو۔ اگر خدا کے لئے نہ ہو، اس سے کوئی دنیاوی مقصد وابستہ ہو تو پھر جزو بھی نہیں کاروبار ہے۔ اس سے کافروں کی یا کمزور مسلمانوں کی ان اچھی صفات کی نفی نہیں کیونکہ ان کو بھی یہ اللہ تعالیٰ نے ہی عطا کی ہوئی ہیں اس لئے وہ قابل تعریف تو پھر بھی ہیں جیسے حاتم طائی کی سخاوت کی آپ ﷺ نے تعریف فرمائی۔ پس اگر یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لئے نہ ہو تو اس کا صلہ ان کو دنیا میں تو مل جائے گا کہ لوگ ان کی تعریف کریں گے یا ان کے دوسرے دنیاوی کاموں میں لوگ ان کے ساتھ اچھا رویہ رکھیں گے لیکن آخرت میں ان کا کوئی حصّہ نہیں ہو گا۔ اور ظاہر ہے یہ کتنی بڑی محرومی ہے کہ عمل بھی کیا اور فائدہ بھی نہیں ہوا۔ دوسری طرف اگر کچھ ایسے دنیاوی مقاصد کے لئے استعمال کی جائیں جن کا حاصل کرنا ان کے لئے جائز نہیں تھا تو پھر یہ دھوکہ ہے فریب ہے۔ اخلاق کے پردے میں بد اخلاقی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے محفوظ فرمائے۔ آمین

رذائل اور فضائل

آپ ﷺ نے فرمایا "حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيئَة" (رواه حلية الأولياء وطبقات الأصفياء) جس کا مفہوم ہے کہ دنیا کی محبت ساری خطاؤں کی جڑ ہے اور قرآن پاک میں نفس کے بارے میں ارشادِ مبارک ہے "فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا" جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفس کو الہام کئے اس کے فجور اور اس کا تقویٰ۔ پس نفس جس کی تربیت نہ ہوچکی ہو میں جو فجور کے تقاضے ہیں اور قلب میں جو دنیا کی محبت کسی شکل میں بھی موجود ہے ان کی ملی بھگت سے

رذائل پیدا ہوتے ہیں اور عقل بھی اس نفس و قلب سے متاثر ہو کر ان کو دور نہیں کر رہی ہوتی بلکہ ان کا ساتھ دے رہی ہوتی ہے۔ چونکہ ہر شخص کا قلب و نفس مختلف حالت میں ہوتا ہے اس لئے ان کے باہمی امتزاج سے ہزاروں لاکھوں قسم کے رذائل کی صورتیں پیدا ہوسکتی ہیں جن میں بڑے بڑے رذائل جو گنے جاسکتے ہیں درج ذیل ہیں۔

حرص، غصہ، جھوٹ، غیبت، بخل، ریا، عجب، خود رائی، تکبر، حسد اور کینہ وغیرہ۔ ان کو اخلاقِ رذیلہ بھی کہتے ہیں۔قرآن و حدیث میں ان پر بڑی بڑی وعیدیں ہیں اس لئے ان کی اصلاح بہت ضروری ہوتی ہے۔ اصلاح کے بعد جو اخلاقِ حمیدہ پیدا ہوتے ہیں ان میں بڑے بڑے درج ذیل ہیں۔

توحید، اخلاص، توبہ، اللہ والوں اور شعائراللہ کی محبت، شوق، انس، خوف، خشیت، رجا، زہد، توکل، قناعت اور حلم وغیرہ۔

نظام ہدایت

چونکہ انسان ان رذائل کی موجودگی میں اپنی اصلاح کی تدبیر وضع کرنے سے قاصر تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے جن و انس کی ہدایت کے لئے دو عظیم سلسلے جاری فرمائے ہیں ایک اپنی کتابوں و صحف کا سلسلہ جو قرآن پر مکمل ہوتا ہے دوسرا انبیائے کرام کا سلسلہ جو خاتم النبیین آپ ﷺ پر مکمل ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "میں تم میں دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں ان کے ہوتے کبھی گمراہ نہ ہو گے اللہ کی کتاب اور میری سنت" (حاکم 1/93 ح 318 نیز دیکھئے "الحدیث" 14 ص 40)۔ یہ وہ روشنی ہے جس کے بغیر ہمیں حق نظر نہیں آسکتا۔ اس کے علم کو علم نافع کہتے ہیں لیکن اس سے عملِ صالح وجود میں آئے اس کے لئے تربیت کی ضرورت ہے۔

نظام تربیت

حکمت کا اصول ہے کہ علاج اتنے ضد سے کیا جاتا ہے کہ اس سے اعتدال

حاصل ہوجائے۔ پس غیر تربیت یافتہ شخص کا نفس چونکہ اپنی خواہشات پوری کرنا چاہتا ہے تو اس کا علاج اس سے ہوگا کہ اس کی مخالفت کی جائے تاکہ اس کا خواہشات پوری کرنے کا تقاضا دب جائے اور صرف ضروریات پوری کرنے پر اکتفا کرنے کے لئے تیار ہوجائے۔ اس طرح جو بیمار دل ہوتا ہے اس میں دنیا کی محبت بھری ہوتی ہے اس کو نکالنے کے لئے اس میں اللہ تعالیٰ کی محبت ڈالی جاتی ہے جس کے لئے ذکر کرایا جاتا ہے جس سے دل کو اسم کے ذریعے مسمیٰ کے ساتھ محبت کرنے کا راستہ مل جاتا ہے کیونکہ جسم میں آنے سے پہلے روح اللہ تعالیٰ کی عاشق تھی جس کا اللہ تعالیٰ نے اس انداز میں ذکر فرمایا ہے اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوۡمًا جَھُوۡلًا (سورة الأحزاب:72) کیونکہ اپنے مفادات سے بیگانہ اور جان کی بازی لگانا کوئی عاشق ہی کرسکتا ہے۔ حدیث شریف میں بھی دل کی اصلاح کے ذکر کا فرمایا گیا ہے۔ ایسے ہی دنیاوی نظام میں غلطاں و پیچاں عقل نفس کی خواہشات کو یاد رکھتی ہے اور ان کو پورا کرنے کی تدبیروں میں ہر وقت لگی رہتی ہے۔ اس کا علاج ذکر اور آخرت کی تیاری کی فکر کے ذریعے کیا جاتا ہے کیونکہ دنیاوی چیزوں کی یاد کا توڑ اللہ تعالیٰ کی یاد میں ہے اور دنیاوی تفکرات کا علاج آخرت کی فکر ہے جس سے آخرت پر یقین درجہ بدرجہ بڑھتے بڑھتے حق الیقین تک پہنچ جاتا ہے۔ اس لئے نفس کی تربیت کے لئے مجاہدہ ہے، دل کے لئے ذکر اللہ ہے۔ آقائے نامدار جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"إِنَّ لِكُلِّ شَیْءٍ صِقَالَةً وَإِنَّ صِقَالَةَ الْقُلُوْبِ ذِكْرُ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ" (رواه الدعوات الكبير)۔ ہر چیز کو صاف کرنے والی چیزیں ہوتی ہیں اور دلوں کو صاف کرنے والا اللہ کا ذکر ہے۔ اور عقل کی اصلاح کے لئے ذکر فکر ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّأُولِی الْأَلْبَابِ ، الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ بے شک آسمان اور زمین کے بنانے اور رات اور دن کے آنے جانے میں البتہ عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ وہ جو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور کروٹ پر

لیٹے یاد کرتے ہیں اور آسمان اور زمین کی پیدائش میں فکر کرتے ہیں، (کہتے ہیں) اے ہمارے رب تو نے یہ بے فائدہ نہیں بنایا تو سب عیبوں سے پاک ہے سو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ (آلِ عمران:191-190)

چونکہ یہ علاج ہے اور علاج بغیر معالج کے نہیں ہوتا اس لئے اس کا معالج یعنی شیخ اپنے مرید کے نفس و قلب و عقل کا علاج ان ذرائع سے کرے گا۔ یہ نظامِ تربیت ہے جس کو عرف عام میں پیری مریدی کہتے ہیں۔

اس کے بعد سلوک طے کرنے کے لئے اخلاق رذیلہ اور اخلاق حمیدہ کا نسبتاً تفصیلی تعارف دیا جاتا ہے تاکہ سالک ان امور سے آگاہ ہو جن سے بچنا ہے اور ان امور سے بھی جن کو حاصل کرنا اور ان سے متعلقہ تفصیلات سے بھی وہ آگاہ ہوسکے۔

1.1.1... سلبی اعمال (اخلاقِ رذیلہ)

اللہ تعالیٰ نے انسان سے صحتمند دل اور رذائل سے پاک نفس کا مطالبہ فرمایا ہے۔ اگر دل نفس کی بری خواہشات سے آلودہ ہوکر روحانی طور پر بیمار ہو جائے تو انسان پھر انسان نہیں رہتا اس سے کچھ بھی سرزد ہوسکتا ہے۔ ان ہی روحانی بیماریوں کو رذائل بھی کہتے ہیں۔ جب تک دل میں برے جذبات اور نفس کی بری خواہشات موجود ہوں انسان خطرے میں ہوتا ہے کہ مبادا کس مرض سے روحانی ہلاکت ہو جائے اس لئے جلد از جلد ان بیماریوں سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اگر چہ ان ساری بیماریوں کو ختم کرنا مقصود ہے لیکن ان کے علاج میں ترتیب شیخ کی اجتہادی بصیرت پر موقوف ہوتی ہے۔ مرید کا کام اپنے احوال کی اطلاع کرنا ہوتا ہے اور شیخ اس سے اندازہ لگاتا ہے کہ کونسی بیماری اس اطلاع سے معلوم ہو رہی ہے یا کس مرض کی صحت یابی کے بارے میں پتا چل رہا ہے۔ پھر اس کے دل میں اللہ تعالیٰ جو ڈال دیتا ہے اس کے مطابق وہ مرید کو بتاتا ہے اس طرح شدہ شدہ ان بیماریوں کا علاج ہو رہا ہوتا ہے یہاں تک کہ کبھی مکمل صحت ہو جاتی ہے پھر اس صحت کو برقرار رکھنا مقصود ہوتا ہے۔

روحانی بیماری اور جسمانی بیماری میں جو سب سے موٹا فرق ہے وہ یہ ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ جو جسمانی عوارض خودبخود آتے ہیں کہ ہر شخص نے ایک دن اس دارِ فانی سے جانا ہوتا ہے اس سے مکمل چھٹکارا معالج کے بس میں نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات آدمی ارذل العمر کو جب پہنچتا ہے تو معالج کی یہ بڑی کامیابی سمجھی جاتی ہے کہ مزید بیماریوں سے صرف جتنا ممکن ہو بچانا مقصود ہوتا ہے موجودہ بیماریوں کے ساتھ تو سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کے برخلاف جب روحانی صحت حاصل ہو جاتی ہے یعنی ان امراض سے چھٹکارا مل جاتا ہے تو پھر روحانی قوت میں اضافہ شروع ہو جاتا ہے یہاں تک آخری عمر میں بعض مشائخ کی روحانی قوت اتنی زیادہ ہو جاتی ہے جو الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتا کیونکہ روح کا میدان اور ہے اور جسم کا اور۔ جسم فانی ہے اور روح باقی۔ آنے والے صفحات میں روحانی امراض کی

ضروری تفصیل دی جاتی ہے جو صرف تعارف ہے اس کی تفصیل اس مختصر کتاب میں نہ سما سکتی ہے نہ اس کا بیان کرنا مقصود ہے کیونکہ یہ مشائخ کا کام ہے کہ ہر مرض کی ضروری تفصیل معلوم کریں ہر کس و ناکس کا نہیں۔

حبِ دنیا

اخلاقِ رذیلہ کی جڑ حبِ دنیا سے نکلی ہے جو کہ تین قسم کی محبتوں پر مشتمل ہوتی ہے وہ تین مندرجہ ذیل ہیں:

(1) حُبِ جاہ

(2) حُبِ باہ

(3) حُبِ مال

سب سے پہلے حبِ دنیا کو بیان کیا جاتا ہے پھر اس کے بعد اس کی تفصیل یعنی یہ تینوں محبتیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ" اور دنیا کی زندگی سوائے دھوکے کی پونجی کے اور کچھ نہیں۔ (آلِ عمران:185) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "الدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ یعنی دنیا مؤمن کا قیدخانہ ہے اور کافر کے لئے جنت ہے۔ (رواہ المسلم)

نفس کی جو خواہش شریعت کے مقابلے میں آئے، دنیا ہے۔ نفسِ امارہ شریعت کی پابندی سے تنگ ہوتا ہے اس سے خلاصی چاہتا ہے مآل پر نظر کرتے ہوئے عقلمند اس کو شریعت پر عمل کے لئے خوگر بناتا ہے۔ اس سے یہ دنیا مؤمن کے لئے قیدخانہ بن جاتی ہے اور کافر جو نفس کو آزاد چھوڑتا ہے جو چاہے کرے چاہے آخر میں اس کو نقصان ہی ہو تو یہ اس کی جھوٹی جنت ہے کیونکہ اس کی سزا عنقریب بھگتے گا۔ بعض علماء نے اس کی تشریح یوں فرمائی ہے کہ مؤمن کے لئے وہاں جنت ہے جہاں تمام خواہشات پوری کی جائیں گی اس لئے اس دنیا میں جس میں چند خواہشات ہی جائز طریقے سے پوری ہوسکتی ہیں باقی کی قربانی دینی پڑتی ہے یہ قیدخانہ ہی ہے۔ اس طرح کافر کے لئے وہاں دوزخ ہے جہاں ان کی کوئی خواہش پوری نہیں ہوگی اس کے مقابلے میں دنیا جہاں ان کی چند خواہشات پوری

ہوسکتی ہیں یہ جنت ہی تو ہے۔

حقیقتِ دنیا

جس چیز میں فی الحال حظِ نفس ہو اور آخرت میں اس کا کوئی نیک ثمرہ مرتب نہ ہو وہ دنیا ہے۔

تشریح

ہر چند ہمارے اندر مختلف امراض پائے جاتے ہیں لیکن حسبِ فرمانِ نبی اکرم ﷺ تمام امراض کی جڑ صرف ایک ہی چیز حبِ دنیا ہے۔ جو کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "حبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيئَة" (رواه شعب الإيمان) یعنی دنیا کی محبت تمام خرابیوں کی جڑ ہے اور جڑ یعنی اصل مرض ہی بقیہ امراض کا سبب ہوا کرتی ہے۔ اور اصل کا علاج کرنے سے جملہ امراض خود ہی دفع ہو جائیں گے۔ جس میں حبِ دنیا ہوگی اس کو آخرت کا اہتمام ہی نہ ہوگا۔ اور جب آخرت کا اہتمام ہی نہ ہوگا تو وہ شخص نہ تو اعمالِ حسنہ کو انجام دے گا اور نہ برائیوں سے بچے گا۔ اور اس کے برعکس جب آخرت کی فکر ہوتی ہے تو جرائم صادر نہیں ہوتے کیونکہ حبِ دنیا میں فکرِ دین کم ہوتی ہے۔ جس درجہ کی حبِ دنیا ہوگی اسی درجہ فکرِ دین کم ہوگی۔ اگر کامل درجہ کی حبِ دنیا ہوگی تو کامل درجہ کی دین سے بے فکری ہوگی جیسی کہ کفار میں ہے اور مسلمانوں میں جس درجہ کی حبِ دنیا ہوگی اسی درجہ کی دین سے بے فکری ہوگی۔ مگر یہ بات اچھی طرح سے سمجھ لینی چاہئے کہ حقیقت میں دنیا مال و دولت زن و فرزند کا نام نہیں۔ بلکہ دنیا کسی ذی اختیار کے ایسے مذموم فعل یا حالت کا نام ہے جو اللہ سے غافل کرا دے خواہ کچھ بھی ہو، اسی کو کہا ہے کہ

غافل کرے جو رب سے وہی اصل میں دنیا ہے
اس سیم و زر و آل کو دنیا نہیں کہتے

جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ حبِ دنیا کے تین شعبے ہیں، حبِ مال، حبِ باہ اور

حبِ جاہ۔ ان کی تفصیل عنقریب آرہی ہے۔ طلبِ دنیا یعنی دنیا کمانا تو بری بات نہیں البتہ اگر اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے احکامات کو پسِ پشت ڈالے تو یہ واقعی جرم ہے، مال مثل پانی کے ہے اور قلب مثل کشتی کے ہے۔ اسی کو کہا ہے۔

کشتی میں آئے پانی تو وہ موت ہے اس کی نیچے ہو یہی پانی تو ہے اس کی زندگی

یعنی پانی کشتی کا معین بھی ہے اور اس کو ڈبونے والا بھی ہے اس طرح کہ کشتی سے باہر اور نیچے رہے تو معین اور مددگار ہوتا ہے اور اگر کہیں پانی کشتی کے اندر آجائے تو کشتی کو ڈبو دیتا ہے۔ اسی طرح مال ہے کہ اگر قلب سے باہر صرف ہاتھ میں ہے تو معین ہے اور اگر قلب کے اندر اس کی محبت ہے تو مہلک ہے جیسا کہ کہا گیا ہے کہ

واسطے ہو دین کے اچھا مال قبول مال صالح لصالح گفتِ رسول

کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ "نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ" (رواہ الآداب للبیہقي) یعنی نیک آدمی کے لئے مال حلال بہت ہی اچھا ہے چونکہ مؤمن صالح اس مال میں سے اقارب کو دے گا، ضروریات دین میں چندہ دے گا، لوگوں کی مدد کرے گا اور اگر دل میں مال کی محبت ہے تو اوروں کے حقوق دبا دے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے جب فارس کا خزانہ آیا تو آپ نے یہ آیت کریمہ پڑھی "زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ" لوگوں کو مرغوب چیزوں کی محبت نے فریفتہ کیا ہوا ہے۔ (آلِ عمران:14) اور فرمایا اے اللہ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے اندر اس کی رغبت تو پیدا کی گئی ہے تو اس کا تو ازالہ نہیں چاہتے مگر یہ دعا ہے کہ مال تیری محبت میں معین ہو جائے اور وہ دنیائے مذموم جو آخرت سے غافل کرے اس کی مثال سانپ کی سی ہے جس کا ظاہر تو اچھا ہے اور نقش و نگار سے آراستہ ہے مگر اندر زہر بھرا ہوا ہے۔ اسی کو کہا ہے کہ اگر کسی بچے کے سامنے کوئی زہریلا سانپ چھوڑ دیا جائے تو وہ اس کی ظاہری خوبصورتی کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے اور اس کو پکڑ لیتا ہے، چونکہ اس کو یہ خبر نہیں کہ اس

کے اندر زہر بھرا ہوا ہے اور اس کا انجام کیا ہو گا؟ ہماری حالت بھی اس بچے کی سی ہے کہ ہم دنیا کی ظاہری آب و تاب، نقش و نگار اور رنگ و روپ پر فریفتہ ہیں اور اندر کی خبر نہیں اور یہ بھی تجربہ ہے کہ سانپ جس قدر خوب صورت ہوتا ہے اسی قدر زہریلا ہوتا ہے۔ اسی لئے حقیقت شناس اس کی طرف رغبت نہیں کرتے۔ دنیا کی حقیقت معلوم نہ ہونے سے لوگ اس پر فریفتہ ہو رہے ہیں اگر اس کی حقیقت معلوم ہو جائے تو سخت نفرت ہو جائے۔

چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ "لَوْ کَانَتِ الدُّنْیَا تَعْدِلُ عِنْدَاللّٰہِ جَنَاحَ بَعُوْضَۃٍ مَّا سَقٰی کَافِراً مِّنْھَا شَرْبَۃَ مَآءٍ" (رواہ المستدرك علی الصحیحین للحاکم) یعنی اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا کی قدر مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو اللہ تعالیٰ کافر کو ایک گھونٹ پانی کا بھی نہ دیتے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی قدر کچھ بھی نہیں ہے اس لئے مبغوض شے اپنے دشمنوں کو دیتے ہیں اور حقیقت شناس آدمی ہمیشہ ایسی چیز سے گھبراتا ہے۔ جو خدا تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہو، نیز جناب رسول اللہ ﷺ نے دنیا کو ایک مثال میں بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ بیان فرماتے ہیں کہ "مَالِیْ وَلِلدُّنْیَا إِنَّمَا مَثَلِیْ وَمَثَلُ الدُّنْیَا کَمَثَلِ رَاکِبٍ قَالَ - أَیْ نَامَ - فِیْ ظِلِّ شَجَرَۃٍ فِیْ یَوْمٍ صَایِفٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَکَھَا" (رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَأَحْمَدُ وَھُوَ صَحِیْحٌ) یعنی مجھ کو دنیا سے کیا علاقہ ہے میری مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی سوار سخت گرمی کے دن راستے میں جا رہا ہو اور کسی درخت کے سائے میں ستانے کے لئے ٹھہر جائے اور ستا کر اپنی راہ لے۔

حبِ دنیا کا علاج

موت کو کثرت سے یاد کرتے رہنا اور مدتوں کے لئے منصوبے اور سامان نہ کرنا اور نہ سوچنا اس کا علاج ہے جیسا کہ ارشاد ہے "مُوتُوا قَبْلَ أَنْ تَمُوتُوا" یعنی مر جانے سے پہلے مر جاؤ جس کا مطلب ہے کہ مرنے سے پہلے اپنے میں مرنے والوں کے اوصاف پیدا کرو۔

حُبِ جاہ

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيْدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۚ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ" یعنی وہ جو دارالآخرت ہے ہم اس کو انہی لوگوں کے لئے کریں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ اودھم مچاتے ہیں اور انجام کار متقیوں ہی کے لئے ہے۔ (القصص:83) اور فرمایا رسول اللہ ﷺ نے "مَا ذِئْبَانِ جَائِعَانِ أُرْسِلَا فِي غَنَمٍ بِأَفْسَدَ لَهَا مِنْ حِرْصِ الْمَرْءِ عَلَى الْمَالِ وَالشَّرَفِ لِدِينِهِ" (رواه الترمذي) یعنی دو بھوکے بھیڑیے بکریوں کے گلے میں چھوڑ دیئے جائیں تو وہ اس گلہ کو اتنا تباہ نہیں کرتے جتنا آدمی کی حرص مال و جاہ پر اس کے دین کو تباہ کر دیتی ہے۔

حقیقتِ حبِ جاہ

دل میں دوسروں سے اپنی تعظیم کا خواہشمند ہونا حبِ جاہ کی حقیقت ہے۔

تشریح

حبِ جاہ ایسا مرض ہے کہ اس کا پتا چلنا مشکل ہے۔ جب کوئی واقعہ پیش آئے جس کی وجہ حبِ جاہ ہو تب پتا چلتا ہے کہ میرے اندر حبِ جاہ کا مرض ہے۔ یہ مرض محض وہمی ہے اور محض دوسرے کے خیال سے قائم ہے۔ کیونکہ جاہ دوسرے کی نظر میں معزز ہونے کا نام ہے۔ جس کا مدار دوسرے کے خیال پر ہے۔ وہ جب چاہے اپنا خیال بدل دے پس ساری جاہ خاک میں مل جاتی ہے۔ مگر اس کے باوجود طالبِ جاہ خوش ہے کہ آہا لوگ مجھے اچھا کہتے ہیں۔ واضح رہے کہ معزز ہونا بیماری نہیں کیونکہ یہ تو فی الحقیقت دوسروں کا فعل ہے جس میں ضروری نہیں کہ اس معزز شخص نے اس کی طلب کی ہو۔ بہت سارے لوگ ہیں جو کہ اپنی نگاہوں میں گرے ہوئے ہوتے ہیں اور اپنے میں کوئی کمال نہیں پاتے لیکن لوگوں کے دلوں میں ان کے لئے اللہ تعالیٰ عزت ڈالتے ہیں۔ ناپسندیدہ جاہ وہ ہے جس کی طلب اور خواہش میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پرواہ نہ کی جائے اور ظاہر

ہے یہ وہ بلا ہے جو دین و دنیا دونوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔ دینی نقصان تو یہ ہے کہ جب آدمی دیکھتا ہے کہ دنیا مجھ پر فدا ہے تو اس میں عجب و کبر پیدا ہو جاتا ہے۔ آخر کار اس عجب و کبر کی وجہ سے برباد ہو جاتا ہے۔ بہت سے لوگ آکر اس میں ہلاک ہو گئے۔ یہ تو دین کا نقصان ہوا اور دنیا کا نقصان یہ ہے کہ مشہور آدمی کے حاسد پیدا ہو جاتے ہیں۔ پس صاحبِ جاہ کا دین بھی خطرے میں رہتا ہے اور دنیوی خطروں کا بھی اندیشہ لگا رہتا ہے پس حق تعالیٰ کی طرف سے طلب کے بغیر جاہ حاصل ہو وہ تو نعمت ہے لیکن خود سے اس کا اپنے آپ کو مستحق سمجھنا اور اپنے کمالات کی طرف اس کی نسبت کرنا مذموم ہے۔ ایک اور بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ مال کی طرح انسان جاہ کا بھی بقدرِ ضرورت محتاج ہے۔ تاکہ اس کی وجہ سے مخلوق کے ظلم و تعدی سے محفوظ اور بے خوف ہو کر با اطمینانِ قلب عبادت میں مشغول رہ سکے جیسا کہ حدیث شریف میں یہ دعا منقول ہے: "اللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ فِيْ عَيْنِيْ صَغِيْرًا وَّفِيْ أَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيْرًا." (رواه البزار والهيثمي في مجمع الزوائد.) یعنی اے اللہ مجھے اپنی نگاہوں میں گرا دے اور دوسروں کی نگاہوں میں معزز کر دے۔

اس میں یہی جاہ مطلوب ہے اور لوگوں کی نظروں میں بڑا ہونے کا توڑ اس میں موجود ہے کہ اپنی نظروں میں آدمی چھوٹا ہو۔ لہٰذا اتنی طلب جاہ میں بھی مضائقہ نہیں۔ اس لئے قاعدہ یہ ہوا کہ خود سے جو جاہ حاصل ہو اور عمل شریعت کے مطابق ہو تو یہ خدا کی طرف سے انعام ہے۔ عمل شریعت کے مطابق نہ ہو اور خود سے جاہ حاصل ہو تو یہ خدا کا امتحان ہے اور آزمائش ہے۔ جاہ کی ایسی طلب کہ لوگوں کو اپنا مطیع بنانے کا جذبہ ہو اس میں بھی دو صورتیں ہو سکتی ہیں کہ

(1) لوگوں سے اپنی اطاعت ان کو خیر پہنچانے کے لئے ہو جیسے حاکم عادل، استاد مربی شیخ وغیرہ یہ جائز اور بعض اوقات ضروری ہے۔

(2) لوگوں کو صرف اپنی انا کی تسکین کے لئے مطیع کرنا چاہتا ہو یہ نہ صرف ناجائز بلکہ اکثر بیماریوں کی جڑ ہے۔

خلاصہ یہ کہ جاہ شریعت سے ہٹا دے چاہے طلب میں یا نتیجے میں اس سے باز آنا چاہیے اور جو شریعت پر چلنے میں مدد کرے وہ اللہ تعالیٰ کا کرم اور احسان ہے۔ مختصراً آدمی اس جاہ کا طالب بنے کہ جو منجانب اللہ ایسی عطا ہو کہ اس میں اپنے کمال پر نظر نہ جائے۔

حبِ جاہ کا علاج

یوں سوچے کہ اس وہمی کمال سے کیا حاصل جو پائدار نہیں۔ اس کی بجائے اس کمال کو حاصل کرنا چاہیے جو پائدار ہو یعنی آخرت میں اللہ تعالیٰ کرم فرما کر عزتمند بنا دے اور اس کے لئے چونکہ اپنے آپ کو چھوٹا سمجھنا ضروری ہے اس لئے ہر اس تدبیر کو اختیار کرنا جس سے آدمی اپنے آپ کو چھوٹا سمجھے مثلاً اپنے نقائص پر نظر رکھنا۔ جو لوگ اپنے اوپر تنقید کرنے والے ہوں ان کی باتیں غور سے سننا کہ مبادا کوئی کام کی بات اس میں نکل آئے۔ تکبر کے بارے میں وعیدوں کو پیشِ نظر رکھنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سوچنا کہ نہ تعظیم و اطاعت کرنے والے رہیں گے اور نہ میں رہوں گا پھر ایسی موہوم اور فانی چیز پر خوش ہونا نادانی ہے، اس سے بھی فائدہ ہو جاتا ہے۔

حبِ باہ

ویسے تو باہ ایک خاص قسم کی جنسی لذت کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن یہاں تمام لذاتِ دنیاوی کی محبت حبِ باہ کہلاتی ہے۔ نفس لذت کا طالب ہوتا ہے اس لئے وہ چاہتا ہے کہ ساری لذات کو اپنے لئے جمع کرے۔ اس کے لئے وہ پرواہ نہیں کرتا کہ وہ جائز طریقے سے حاصل کی جائیں یا ناجائز طریقے سے۔ حبِ باہ بھی چونکہ ایک وقتی جذبہ ہوتا ہے اس لئے اس کی وجہ سے جو گناہ ہوتے ہیں اس پر بعد میں انسان نادم ہوتا ہے لیکن ان کا چھوڑنا بھی آسان نہیں ہوتا کیونکہ لذات کا خوگر نفس مجاہدہ کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اس میں بڑی برائی یہ بھی ہے کہ ان لذات کی طلب بڑھتی رہتی ہے اور ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ

عام طریقوں سے ان لذات سے بدکار نفس مطمئن ہی نہیں ہوتا۔ اس وقت انسان مجسم شیطان بن جاتا ہے اور اس سے ایسی ایسی حرکات سرزد ہوتی ہیں کہ انسان کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ اس کو انگریزی میں (Perversion) کہتے ہیں اور دنیائے طب میں اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اس کا علاج دنیائے لذات میں منہمک معالجین کیا جانیں؟ اس لئے یورپ اور امریکا میں بظاہر بہت ہشیار لوگ بھی اس معاملے میں بالکل بے وقوف بن جاتے ہیں اور اس کو بعض اوقات مرض ہی نہیں سمجھتے۔

جاہ کی طرح اگر باہ کی تسکین منجانب اللہ جائز طریقے سے نصیب ہو جائے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر کرنا چاہیے۔ اس لئے کہ لذات سے بالکل منہ موڑنا مطلوب نہیں لیکن ان میں اتنا انہماک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ٹوٹ جائے مذموم ہے۔ روزہ میں خواہشِ نفس کی مخالفت کرائی جاتی ہے لیکن افطار میں جب وقت ہو جائے، جلدی مستحب ہے اور اس کو فرحت فرمایا گیا۔ اس طرح عید کی خوشی، ولیمے کی خوشی وغیرہ وغیرہ۔ نیز شادی میں باکرہ کے ساتھ شادی کی پسندیدگی، چار تک شادیوں کی اجازت وغیرہ سب تسکین باہ ہی کے جائز ذرائع ہی تو ہیں۔ اسلام میں نہ تو رہبانیت ہے کہ خود کو اذیت دینا ہی دین ٹھہرے اور نہ ہی اباحیت ہے کہ ہر چیز جائز ہو جائے بلکہ ان کے درمیان اعتدال کا ایک راستہ ہے جس پر چلنا مطلوب ہے اور اس کا تعین سوائے وحی کے ممکن نہیں تھا اس لئے اس کے بارے میں وحی سے استفادہ کرنا ہی نجات کا باعث ہوسکتا ہے۔

حبِ باہ کا علاج

اس کا علاج مجاہدہ ہے کہ نفس کو روکا جائے۔ روزہ رکھنا اور شرعی قیود مثلاً غضِ بصر یعنی نیچے نگاہ رکھنا وغیرہ اس کا علاج ہے۔ موت کی یاد ان لذات کا مؤثر توڑ ہے۔ ایسی محفلوں سے بچنا جن میں لذاتِ نفس کے لئے ترغیب ہو بہترین پرہیز ہے۔ اپنے نفس پر ہر وقت بد گمان رہنا چاہیے اور دل میں یہ سوچا جائے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں اگر اس وقت میری موت واقع ہو جائے تو کیا ہوگا۔

بعض لوگ ایسے حالات میں مر جاتے ہیں یا مارے جاتے ہیں کہ دنیا و آخرت دونوں تباہ ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ایسی عبرتناک موت کا سوچ کر ایسی چیزوں کے قریب بھی نہیں جانا چاہیے جس میں اتنے خطرات ہوں۔

حبِ مال

مال کا جمع کرنا ایک علیحدہ بیماری ہے اور بعض دفعہ یہ بیماری اتنی بڑھ جاتی ہے کہ جس چیز کے لئے مال مطلوب ہوتا ہے یعنی عزت اور آرام اس کو بھی مال کے لئے قربان کیا جائے جیسے ڈوم اس کے لئے عزت قربان کرتے ہیں اور بنیے آرام اور لذات۔ مثل مشہور ہے "چمڑی جائے پر دمڑی نہ جائے" ایسے موقع کے لئے ہے۔ مال کا جمع کرنا فی نفسہٖ مطلوب ہے کیونکہ اس کے ساتھ بہت سارے نفع وابستہ ہیں لیکن اس کے ساتھ دل نہیں لگانا چاہیے۔ اس کا امتحان یہ ہے کہ مال ہو لیکن کارِ خیر میں اس کے خرچ سے دل مانع نہ ہو تو یہ مال کی محبت نہیں ہے۔ بخل اسی حبِ مال ہی کا اثر ہے۔ اس کی باقی تفصیل حبِ دنیا میں گزر گئی ہے وہیں دیکھی جائے۔

حقیقتِ حبِ مال

مال کی ایسی محبت کہ اس کو حاصل کرنے کے لئے جائز و ناجائز کی تمیز نہ رہے حبِ مال کی حقیقت ہے۔

حبِ مال کا علاج

کارِ خیر میں نفس پر جبر کر کے مال کو خرچ کرنا اس کا علاج ہے۔ کم از کم زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ کی ادائیگی کا التزام ہونا چاہیے۔ کبھی کبھی نیک لوگوں کی دعوت کرنا بھی فائدہ مند ہوتا ہے۔

اخلاقِ رذیلہ کی قسمیں اور ان کا علاج

جیسا کہ اخلاق کے باب میں حرص، غصہ، جھوٹ، غیبت، بخل، ریا، عجب، خود رائی، تکبر، حسد اور کینہ وغیرہ کا ذکر کیا گیا تھا کہ ان کو اخلاقِ رذیلہ یا اخلاقِ ذمیمہ کہتے ہیں۔ تزکیہ رذائل کے دور کرنے کے عمل کو کہتے ہیں۔ فقہ کا قاعدہ بھی ہے کہ دفع مضرت جلبِ منفعت سے زیادہ ضروری ہے نیز یہ اخلاقِ ذمیمہ ایسے ہیں کہ ان کو جب دور کیا جاتا ہے تو زیادہ تر اخلاقِ حمیدہ خودبخود حاصل ہوجاتے ہیں باقیوں کے لئے بہت تھوڑی سی کوشش بھی کافی ہوتی ہے اس لئے پہلے اخلاقِ ذمیمہ کی قدرے تفصیل دی جاتی ہے۔ جہاں تک ان کے علاج کا تعلق ہے وہ دو قسم کا ہے۔

(1) اصل علاج جس سے ان رذائل کی جڑ کٹ جائے

(2) اور ان کا فوری علاج

فوری علاج ان کا مختلف ہے اور وہ وقتی ہوتا ہے۔ اس سے مرض کا ازالہ یا مکمل علاج نہیں ہو پاتا لیکن وقتی طور پر اس کے ذریعے اس مرض کے شر سے خود کو بچایا جاسکتا ہے جبکہ ان کا جو اصل علاج ہے تو وہ تفصیلی سلوک طے کرنے اور جذبِ منتہی کے ذریعے ممکن ہے۔ سلوک طے کرنا کسبی ہے اور جذبِ منتہی وہبی ہے۔ سالک کا کام کسبی میں کوشش کرنا ہے، وہبی فیوض کا فیصلہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو ہم کو ہم سے زیادہ جانتا ہے اور ہم پر ہم سے زیادہ مہربان ہے۔ دو باتوں کا فیصلہ البتہ واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ نیک امید کسبی ہے کیونکہ اس کا مطالبہ ہے اور جب بندہ اس طرح کرے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے "أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِي" (البخاري) اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے کبھی بھی خلاف نہیں فرماتے تو پھر ڈر کس بات کا؟ جہاں تک نقشبندی طریقے کے جذبِ مکتسب یعنی جذبِ مبتدی کا تعلق ہے وہ بقول حضرت مجدد الف ثانیؒ کے شوق کو بڑھانے کے لئے ہے کہ سلوک طے کرنے پر نفس کو قلب راضی کرسکے۔ جب سلوک طے کرنے کے لئے قلب و نفس تیار ہوگئے تو اس کے بعد پھر سب طریقوں کا ایک ہی نظام

ہے جس میں اکابر کی تحقیقات کی وجہ سے فرق آسکتا ہے کیونکہ یہ فن تجرباتی ہے اور ہر سالک کے لئے بھی تھوڑا تھوڑا فرق پڑسکتا ہے کیونکہ ہر سالک کی طبعیت اور حالات مختلف ہوتے ہیں اس لئے اس میں سالک کے لئے خصوصی طور پر کونسا طریقہ مناسب ہے یہ شیخ کے اجتہاد اور بصیرت پر چھوڑا جاتا ہے کیونکہ ہر شیخ طبیب کی طرح مجتہد ہے۔ اب ترتیب کے ساتھ اخلاقِ ذمیمہ کا تعارف کیا جاتا ہے اور ان کا فوری مگر وقتی علاج بھی بتایا جاتا ہے۔

1.1.1.1... حرص

ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ "وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِۦٓ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا" اپنی آنکھیں اس چیز کی طرف مت بڑھاؤ جس سے ہم نے نفع دیا ان کافروں کے مختلف گروہوں کو دنیاوی زندگی کی آرائش کا۔(طه:131) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "يَهْرَمُ ابْنُ آدَمَ وَيَشِبُّ مِنْهُ اثْنَانِ: الْحِرْصُ عَلَى الْمَالِ وَالْحِرْصُ عَلَى الْعُمُرِ" (رواہ المسلم:1047) یعنی آدمی بوڑھا ہوتا رہتا ہے اور اس کی دو چیزیں بڑھتی رہتی ہیں۔ مال پر حرص کرنا اور عمر پر حرص کرنا۔

حقیقتِ حرص

حرص حبِ دنیا کا تقاضا ہے۔ دل کا اپنے مفادات کے ساتھ ہمہ وقت مشغول ہونا حرص کی حقیقت ہے۔

تشریح

جیسا کہ حبِ دنیا تمام روحانی بیماریوں کی جڑ ہے اس طرح حرص تمام بیماریوں کی جڑ ہے۔ یہ ایسا مرض ہے کہ اس کو اُم الامراض کہنا چاہئے کیونکہ اس کی وجہ سے جھگڑے فساد ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ سے مقدمہ بازیاں ہوتی ہیں۔ اگر لوگوں میں حرص مال نہ ہو تو کوئی بھی کسی کا حق نہ دبائے۔ بدکاری کا منشاء بھی لذت کی حرص ہے۔ اخلاقِ رذیلہ کی جڑ بھی یہی حرص ہے۔ کیونکہ عارفین کا قول ہے کہ

"تمام اخلاقِ رذیلہ کی اصل کبر ہے اور کبر جاہ کی حرص ہے۔" پس کبر بھی حرص سے ہوا۔ انسان کا طبعی خاصہ ہے کہ اگر اس کے پاس مال کے دو جنگل بھی ہوں جن میں سونا یا چاندی پانی کی طرح بہتے ہوں پھر بھی وہ تیسرے کا طالب ہو گا۔ جتنا ہوس کو پورا کرو گے اتنا ہی بڑھے گی جیسا کہ خارش والا جتنا کھجلاتا ہے اتنی ہی خارش بڑھتی جاتی ہے۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "أَمْ لِلْإِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى" پھر کیا انسان کو وہی مل جاتا ہے جس کی تمنا کرتا ہے۔ (النجم:24) یعنی بھلا انسان کی ہر آرزو پوری ہو سکتی ہے؟ یعنی کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ حریص کو کبھی راحت نہیں مل سکتی۔ اس کی ہوس کے پیٹ کو مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھر سکتی کیونکہ ایک آرزو ختم نہیں ہوتی کہ دوسری شروع ہو جاتی ہے اور جب تقدیر پر راضی ہی نہ ہو تو ہر کام میں یوں دل چاہتا ہے کہ یہ بھی ہو جائے اور وہ بھی ہو جائے اور سب امیدوں کا پورا ہونا دشوار ہے اس لئے اس کا نتیجہ پریشانی ہی پریشانی ہے۔ گو ظاہر میں اولاد اور مال سب کچھ ہو مگر حریص کا دل ہمیشہ پریشان رہتا ہے۔

حرص کا علاج

یہ سوچے کہ حرص انسان اس لئے کرتا ہے کہ مزے میں رہے اور آرام پائے جبکہ حرص کے ساتھ ان دو چیزوں کا حاصل کرنا ممکن نہیں۔ پس جس چیز سے آرام اور مزہ ختم ہو اس کو آرام و مزے کے لئے کیوں کیا جائے؟ تقدیر پر قانع رہے۔ ضروریات کے لئے اسباب کو اختیار کرنے میں حرج نہیں لیکن جو فیصلہ پھر رب کی طرف سے ہو اس پر راضی رہے۔ خرچ کو گھٹائے تاکہ زیادہ آمدنی کی فکر نہ ہو اور آئندہ کی فکر نہ کرے کہ کیا ہوگا اور یہ سوچے کہ حریص و طمع کرنے والا ہمیشہ ذلیل و خوار رہتا ہے۔ جنت کے مزوں کو سوچے اور یہ کہ اگر میں نے ان لذتوں کو غلط طریقے سے حاصل کیا تو جنت کی لذتوں کو کیونکر حاصل کروں گا۔ اس طرح یہاں کی حرص وہاں کی حرص میں بدل جائے گی۔ اعمال کے فضائل کا مطالعہ کرے تاکہ اعمال کی حرص پیدا ہو اور وہ یہاں کی حرص کا توڑ

کرے۔ نیز اللہ تعالیٰ کی محبت کو بڑھائے تا کہ لذتوں کی محبت مغلوب ہو۔ موت کو کثرت کے ساتھ یاد کرے کہ وہ لذات کو توڑنے والی چیز ہے اور آخرت کی طرف راغب کرنے والی ہے۔

عشقِ فانی تو پائدار نہیں حیٌّ و قیوم کا عاشق بن جا

1.1.1.2... شہوت

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے "وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى" اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کے خوف سے اپنے نفس کو خواہشات سے روکا پس تحقیق اس کے لئے جنت کا ٹھکانہ ہے۔ (النازعات:41-40) اور آپ ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے کہ "وَأَمَّا الْمُهْلِكَاتُ: فَهَوًى مُتَّبَعٌ" (رواه البيهقي) رہے مہلکات سو وہ خواہش ہے جس کی پیروی کی جائے۔ خواہشِ نفسانی کا نام شہوت ہے اس کو ہوا بھی کہتے ہیں۔ اس کا اعلیٰ درجہ کفر و شرک ہے۔ وہ تو اسلام ہی سے خارج کر دیتا ہے اور جو ادنیٰ درجہ ہے وہ کمالِ اتباع سے ڈگمگا دیتا ہے۔ ہر خواہشِ نفس میں یہ خاصیت ہے کہ راہ مستقیم سے ہٹا دیتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ "وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ" اور نفسانی خواہشات کی پیروی مت کرنا اگر ایسا کرو گے تو وہ اللہ کے رستہ سے تم کو ہٹا دے گی۔ (ص:26) اور ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ "وَالْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَه هَوَاهَا وَتَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ" (المستدرك للحاكم:7639) یعنی عاجز وہ ہے جو اپنی خواہشات کی اتباع کرے اور پھر خدا سے نیک اجر کی امید رکھے۔ خواہشِ نفسانی ایسی بری چیز ہے کہ دنیا کی بھی خرابی اور دین کی بھی صد ہا معصیتیں ہیں۔ انسان نفس کی فوری خواہش کی تسکین کے لئے اسی نفس ہی کے مستقبل کی خواہشات کو داؤ پر لگا دیتا ہے نیز اسی فوری خواہش کے لئے دوسروں کے نقصان کے درپے ہو جاتا ہے۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر لادین حکومتیں بھی قوانین بنانے پر مجبور ہوتی ہیں کیونکہ اس کے بغیر اجتماعی مفادات کا حصول ممکن نہیں۔ اس سے یہ پتا چلا کہ نفس کو اگر قابو نہیں کیا گیا تو یہ نہ صرف ملک دشمن،

قوم دشمن ہے بلکہ خود اپنا بھی دشمن ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے مصالح کو ہم سے زیادہ جانتا ہے اس لئے دونوں جہاں میں ہمیں خیر پہنچانے کے لئے کچھ قوانین جن کو شریعت کہا جاتا ہے پر عمل کرنے کے لئے حکم دیتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کا کوئی فائدہ نہیں فائدہ ہمارا اپنا ہے اس لئے شریعت پر بلا چون و چرا عمل کرنا ہی عقلمندی ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں "فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ" یعنی شریعت کا اتباع کیجیے اور ان جاہلوں کی خواہشوں کا اتباع نہ کریں۔ کیونکہ یہ لوگ اپنے فائدہ و نقصان سے غافل ہیں۔ (الجاثية:18) اس لئے ان کی خواہشات کا اتباع کرنے میں سراسر نقصان ہے۔ اس کے مقابلے میں اس علیم و خبیر کے احکامات پر عمل کرنا جو غنی بھی ہے اور ہمارا خیر خواہ بھی نہایت ہی سودمند ہے۔

طریق کار

نبی کریم ﷺ کا ارشاد پاک ہے کہ "لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ" (الجامع الصغیر) یعنی کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہوتا جب تک اس کی خواہش اس چیز کے تابع نہ ہو جائے جس کو میں حق تعالیٰ کے پاس سے لایا ہوں یعنی شریعت۔ مرض کا علاج یہی ہوتا ہے کہ اس کے مادہ اور سبب کو قطع کیا جائے پس جو کام کیا جائے سوچ کر کیا جائے کہ کہیں یہ شریعت کے خلاف تو نہیں۔

شہوت کا علاج

مجاہدہ کرنا ہے، یعنی جائز اُمور میں بھی تربیتاً اپنے نفس کو روکے تو ناجائز اُمور میں نفس کو روکنا آسان ہو جائے جیسے روزہ میں نفس کی تربیت کی جاتی ہے اور مجاہدہ نام ہے نفس کے تقاضوں کو روکنا بتکلف ہو یا بلا تکلف۔

1.1.1.3... غصہ

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "وَالْكٰظِمِيْنَ الغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ" یعنی اور غصہ کو ضبط کرنے والے اور لوگوں کی تقصیرات سے در گذر کرنے والے اور اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکاروں کو محبوب رکھتا ہے۔ (آلِ عمران:134) اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا "لَا تَغْضَبْ" (رواه البخاري) یعنی غصہ مت کر۔

حقیقت غصہ

بدلہ لینے کے لئے دل کے خون کا جوش مارنا غصّہ کی حقیقت ہے۔

تشریح

پہلوان وہ نہیں ہے جو کشتی لڑنے میں غالب ہو جائے بلکہ اصلی پہلوان تو وہ ہے جو غصہ کی حالت میں اپنے آپ پر قابو پائے بے قابو نہ ہو جائے (رواه البخاري) یعنی اصل میں قوی وہ ہے جو غصے کا مالک ہو یعنی غصے پر غالب ہو، یہ نہ ہو کہ غصہ کے منشاء کے مطابق فوراً عمل کرے بلکہ اس کو شریعت کی تعلیم کے مطابق استعمال کرے اس لئے کہ غصہ میں جوش پیدا ہونا طبعی امر ہے۔ اس میں ملامت نہیں مگر انسان کو خدا تعالیٰ نے اختیار بھی دیا ہے اس لئے اس کو روکنا چاہئے۔ اس اختیار کو صرف نہ کرنا انسانیت کے خلاف ہے۔ غصہ کو بھی حق تعالیٰ نے بہت سی مصلحتوں سے انسان کی سرشت میں داخل کیا ہے۔ اس سے بہت سے کام نکلتے ہیں۔ لیکن اختیار کو بھی ساتھ ساتھ رکھ دیا ہے کہ جس جگہ غصہ کا کام ہو وہاں کام لے اور جو جگہ غصہ کے کام کی نہیں وہاں کام نہ لے۔

غصہ فی نفسہٖ غیر اختیاری ہے لیکن اس کے اقتضاء پر عمل کرنا اختیاری ہے، اس لئے اس کا ترک بھی اختیاری ہے، اور اختیاری کا علاج بجز استعمالِ اختیار کے کچھ نہیں۔ گو اس میں کچھ تکلف و مشقت بھی ہو اسی استعمال کی تکرار اور مداومت سے اس کا تقاضا ضعیف ہو جاتا ہے۔ اور اس کے ترک میں زیادہ تکلف

نہیں ہوتا البتہ اس کے اختیار کے استعمال میں کبھی قدرے تکلف ہوتا ہے۔ اسی لئے حدیث شریف میں ہے کہ "لاَ يَقْضِيَنَّ حَكَمٌ بَيْنَ اثْنَيْنِ وَ هُوَ غَضْبَانُ" (صحيح البخاري:7158)

مطلب یہ ہے کہ حاکم کو چاہئے کہ غصہ کی حالت میں فیصلہ کبھی نہ کرے۔ بلکہ اس وقت مقدمہ ملتوی کر دے اور تاریخ بڑھا دے۔ یہاں حاکم سے مراد ہر وہ شخص ہے جس کی دو آدمیوں پر حکومت ہو اس میں معلم استاد اور گھر کا مالک بھی شامل ہے۔ لہٰذا غصہ کی حالت میں بچوں یا دیگر ماتحتوں اور کمزوروں کو کسی جرم میں بھی سزا دینے میں جلدی نہ کریں۔ بلکہ غصہ ختم ہونے کے بعد سوچ سمجھ کر سزا دی جائے۔ اور یاد رکھیں کہ جس حق کا مطالبہ کرنے والا کوئی نہ ہو اس کا مطالبہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہوگا۔ یہاں تک کہ اگر کافر ذمی پر کوئی حاکم ظلم کرے تو حدیث میں آیا ہے کہ "سنو! جس نے کسی ذمی پر ظلم کیا یا اس کا کوئی حق چھینا یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ ڈالا یا اس کی کوئی چیز بغیر اس کی مرضی کے لے لی تو قیامت کے دن میں اس کی طرف سے وکیل ہوں گا" (سنن أبي داود)۔ لہٰذا سزا دینے کے وقت احتیاط لازمی ہے اور اگر طبعی طور پر غصہ زیادہ ہو اور ذرا سی بات پر حد سے زیادہ غصہ آجاتا ہو کہ اس وقت عقل نہ رہتی ہو تو جس پر غصہ کیا جائے غصہ ختم ہو جانے کے بعد مجمع میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑیں، پاؤں پکڑیں بلکہ اس کے جوتے اپنے سر پر رکھ لیں، ایک دو بار ایسا کرنے سے نفس کو عقل آجائے گی۔ قول یا فعل میں ہرگز جلدی نہ کریں، بتکلف اس تقاضے کی مخالفت کریں۔ جب کوتاہی ہو جائے استغفار کریں، اور اگر کسی شخص کے حق میں زیادتی و حدود شرعیہ سے تجاوز ہو گیا ہو تو اس سے معاف کرائیں، زبان سے "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيم" پڑھیں۔ اگر کھڑے ہوں تو بیٹھ جائیں اور اگر بیٹھے ہوں تو لیٹ جائیں اور ٹھنڈے پانی سے وضو کر ڈالیں۔ یا ٹھنڈا پانی پی لیں۔ فوراً کسی ایسے جائز کام میں لگ جائیں جو دل کو جلدی مشغول کرے مثلاً مطالعۂ کتب میں مصروف ہو جائیں۔ اگر اس سے بھی غصہ نہ جائے تو اس شخص سے علیٰحدہ ہو جائیں یا اس کو علیٰحدہ کر دیں، جیسا موقع ہو۔

غصہ کا علاج

یہ یاد کریں کہ اللہ تعالیٰ کو مجھ پر زیادہ قدرت ہے اور میں اس کی نافرمانی بھی کرتا ہوں، اگر وہ بھی مجھ سے یہ معاملہ کرے تو کیا ہو اور یہ سوچیں کہ خدا کے ارادہ کے بغیر کچھ واقع نہیں ہوتا، سو میں کیا چیز ہوں کہ مشیتِ الٰہی سے مزاحمت کروں۔ اگر اس وقت میں صبر کروں تو اللہ تعالیٰ مجھے اس پر اجر دے گا میں کیوں اجر کے اس موقع کو ضائع کردوں اور یہ حقیقت ہے کہ جس کو جلدی جلدی غصّہ آتا ہو اور وہ اس پر قابو پانے پر قادر ہو جائے تو اس کے لئے یہ اجر اتنا زیادہ ہے کہ اس کے لئے ہزارہا نوافل پڑھنے کے اجر سے زیادہ نافع ہوگا بس تھوڑی سی فکر اور سمجھ کی ضرورت ہے۔

1.1.1.4... جھوٹ

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ" اور جھوٹی بات سے کنارہ کش رہو (الحج:30)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ وَإِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ" (متفق علیہ) یعنی ہمیشہ سچ بولو، جھوٹ مت بولو۔

جھوٹ کی حقیقت

خلاف واقعہ بات کہنا جھوٹ ہے۔ آدمی کے جھوٹے ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ جو بات سنے بیان کر دے، بلا تحقیق بات کو نقل کر دے۔

تشریح

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جھوٹ بولنے سے بچو کہ جھوٹ اور فجور ساتھ ساتھ ہیں اور یہ دونوں جہنم میں ہیں اور فرمایا کہ "جھوٹی گواہی اللہ کے ساتھ شرک کرنے کے برابر ہے۔" یہ جملہ آپ ﷺ نے تین بار دہرایا (ابوداود) نیز بخاری شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ کہ ایک شخص تو بیٹھا ہوا ہے اور ایک شخص کھڑا ہے اور اس کے ہاتھ میں (امام

بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ) ہمارے بعض اصحاب نے (غالباً عباس بن فضیل اسقاطی نے موسیٰ بن اسماعیل سے یوں روایت کیا ہے) لوہے کا آنکس تھا جسے وہ بیٹھنے والے کے جبڑے میں ڈال کر اس کے سر کے پیچھے تک چیر دیتا پھر دوسرے جبڑے کے ساتھ بھی اسی طرح کرتا تھا۔ اس دوران میں اس کا پہلا جبڑا صحیح اور اپنی اصلی حالت پر آ جاتا اور پھر پہلے کی طرح وہ اسے دوبارہ چیرتا۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ بعد میں انہوں نے فرمایا کہ وہ جھوٹا آدمی تھا جو جھوٹی باتیں بیان کیا کرتا تھا۔ اس سے وہ جھوٹی باتیں دوسرے لوگ سنتے۔ اس طرح ایک جھوٹی بات دور دور تک پھیل جایا کرتی تھی۔ اسے قیامت تک یہی عذاب ہوتا رہے گا۔

جھوٹ کا علاج

کلام میں احتیاط ہو، بے سوچے کوئی کلام نہ کرے۔ استحضار قبل از وقت، ہمت در عین وقت، تدارک بعد الوقت، اس کا علاج ہے یعنی وقت پر اس کا استحضار ہو کہ میں نے جھوٹ نہیں بولنا۔ اس کے لئے کوئی نشانی مقرر کرے مثلاً کوئی چیز ہاتھ کے ساتھ باندھ لے جس سے یاد آئے کہ جھوٹ نہیں بولنا اور اگر جھوٹ بولنا شروع ہوا چاہتا ہو تو ہمت کر کے اس سے رکے۔ اگر ہو جائے تو اپنے دوستوں کو بتائے کہ میری فلاں بات جھوٹی ہے اور اپنے نفس پر کچھ جرمانہ کرے اگر نفس کو نفلوں سے زیادہ تکلیف ہو تو نفل پڑھے اور اگر پیسے کے ساتھ محبت ہو تو کچھ خیرات کر دے۔ اگر کوئی بات کبھی منہ سے خلاف شریعت نکل جائے تو فوراً خوب توبہ بھی کر لے کہ جھوٹ بولنا اللہ تعالیٰ کا حق بھی ضائع کرنا ہے۔

1.1.1.5... غیبت

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "وَلاَ يَغْتَبْ بَّعْضُكُم بَعْضاً" یعنی تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ (الحجرات:12) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے، "الْغِيبَةُ أَشَدُّ مِنَ الزِّنَا" (مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح) یعنی غیبت زنا سے بھی سخت تر ہے۔ کیونکہ غیبت گناہ جاہی ہے یعنی غیبت جاہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد

ندامت نہیں ہوتی بلکہ فخر کرتا ہے اور زنا پر ندامت ہوتی ہے اس پر کوئی فخر نہیں کرتا۔ اس لئے غیبت زنا سے بدتر ہوتی ہے۔

حقیقتِ غیبت

کسی کی پیٹھ پیچھے ایسی بات کرنا کہ اگر وہ سنے تو اس کو ناگوار ہو، اگرچہ وہ بات اس کے اندر موجود ہی ہو اور اگر وہ بات اس میں نہیں تو وہ بہتان ہے۔

تشریح

جس طرح غیبت کرنا حرام ہے، اسی طرح غیبت سننا بھی حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس کے سامنے اس کے مسلمان بھائی کی غیبت ہوتی ہو اور وہ اس کی حمایت پر قادر ہو اور اس کی حمایت کرے تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی حمایت فرمائیں گے اور اگر اس کی حمایت پر قادر ہوتے ہوئے اس کی حمایت نہ کی تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس پر گرفت فرمائیں گے۔" (شرح السنۃ)۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ "تم میں سے ہر شخص اپنے مسلمان بھائی کا آئینہ ہے پس اگر اس میں کوئی گندی بات دیکھے تو اسے اس سے دور کر دے۔" (ترمذی) یعنی جس طرح آئینہ چہرہ کے داغ دھبے کو صرف عیب والے پر ظاہر کرتا ہے اور کسی پر ظاہر نہیں کرتا اسی طرح اس شخص کو چاہئے کہ اپنے بھائی کی خفیہ طور پر اصلاح کر دے اس کو رسوا نہ کرے۔ زبان اور کان کے گناہوں میں غیبت کرنا اور سننا ایسا گناہ کبیرہ ہے کہ شاید ہی کوئی طبقہ اس سے بچا ہوا ہو۔ اِلَّاماشاءاللہ۔ اس سے بچنے کا بہت ہی اہتمام کرنا چاہئے اور اگر غیبت ہو جائے تو جس کی غیبت کی ہے اس کو علم بھی ہو جائے تو اس سے معافی مانگنا ضروری ہے اور اگر اس کو علم نہ ہو تو کثرت سے استغفار کرے، اور جس کی غیبت کی ہے اس کے لئے دعائے مغفرت کرے۔

غیبت کا علاج

بات کرنے سے قبل تھوڑی دیر تامل کرے اور سوچے کہ اس بات سے اللہ

تعالیٰ جو سمیع و بصیر ہیں ناخوش تو نہیں ہونگے؟ اِن شاء اللہ کوئی بات منہ سے گناہ کی نہ نکلے گی۔ غیبت صرف زبان کو ہی تو کنٹرول کرنا ہے پس اگر ذرا سی ہمت سے انسان اتنے بڑے گناہ سے بچ سکے تو ہمت کیوں نہ کی جائے؟ اس کو سوچ اور ہمت سے کام لے کر غیبت سے رکے۔ یہ سوچ کہ جس کی میں غیبت کر رہا ہوں اس کو اپنی نیکیاں دے رہا ہوں گویا کہ میں اس شخص کو فائدہ پہنچا رہا ہوں جو مجھے پسند نہیں۔ جب بھی کسی کی غیبت کرنے کو جی چاہے تو فوراً اس کے لئے دعا کرے کہ یا اللہ تو اس پر قادر ہے کہ اس شخص سے ان عیوب کو دور کر سکتا ہے اس لئے اس سے ان عیوب کو دور فرما اور مجھے غیبت سے بچا۔ اس پر ہمت کے ساتھ چند روز بھی عمل ہو تو شیطان کسی کی غیبت کا خیال ہی نہ آنے دے۔

1.1.1.6... حسد

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ "وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ" یعنی تم کہو میں حاسد کے شر سے جب وہ حسد کرے پناہ مانگتا ہوں۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "لَا تَحَاسَدُوْا" (رواه البخاري) یعنی آپس میں حسد نہ کرو۔

حقیقتِ حسد

کسی شخص کی اچھی حالت کا ناگوار گذرنا اور یہ آرزو کرنا کہ یہ اچھی حالت اس کی زائل ہو جائے یہ حسد ہے۔

تشریح

حسد کے ساتھ تین باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ایک کیفیتِ انسانیہ ہے، جس میں انسان معذور ہے۔ ایک اس کے مقتضاء پر عمل ہے۔ اس میں انسان مازور یعنی گنہگار ہے۔ ایک اس کے مقتضاء کی مخالفت ہے اس میں انسان ماجور ہے یعنی ثواب پانے والا ہے۔ حسد کا باعث عموماً تکبر و غرور ہوتا ہے یا خبثِ باطن اور نیچ پن کہ بلا وجہ خدا تعالیٰ کی نعمت میں بخل کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ جس طرح میں

کسی کو کچھ نہیں دیتا حق تعالیٰ بھی دوسرے کو کچھ نہ دے۔ البتہ دوسرے کو نعمت میں دیکھ کر حرص کرنا اور یہ چاہنا کہ اس کے پاس بھی یہ نعمت رہے اور مجھے بھی ایسی ہی نعمت حاصل ہو جائے تو یہ غبطہ اور رشک کہلاتا ہے اور غبطہ شرعاً جائز ہے۔ حسد قلبی مرض ہے اس میں دین کا بھی نقصان ہے اور دنیا کا بھی۔ دین کا نقصان تو یہ ہے کہ اس کے کئے ہوئے نیک اعمال ساقط ہو جاتے ہیں، نیکیاں چلی جاتی ہیں اور حق تعالیٰ کے غصے کا نشان بن جاتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو، اور صدقہ و خیرات گناہوں کو اسی طرح بجھاتا ہے جس طرح پانی آگ کو، نماز مومن کا نور ہے اور روزہ آگ سے ڈھال ہے"۔ (رواہ سنن ابن ماجه)

اور دنیا کا نقصان یہ ہے کہ حاسد ہمیشہ رنج و غم میں مبتلا رہتا ہے اور اسی غم میں گھلتا رہتا ہے کہ کسی طرح فلاں شخص کو ذلت و افلاس نصیب ہو۔ اسی طرح عذاب آخرت میں بھی اپنے سر کو رکھا اور اپنی قناعت و آرام کی زندگی رخصت کر کے ہر وقت کی خلش اور دنیوی کوفت خریدی۔ اسی کو کسی نے کہا ہے۔

حاسد کو ایک دم نہیں راحت جہان میں
رنجِ حسد ہے جان ہے جب تک کہ جان میں

حسد کا علاج

گو باتکلف سہی اس شخص کی خوب تعریف کیا کرو اور اس کے ساتھ خوب احسان و سلوک و تواضع سے پیش آؤ اور اپنے آپ کو یہ سمجھاؤ کہ اے ظالم یہ نعمت فلاں کو اللہ تعالیٰ نے دی ہے اگر اللہ تعالیٰ مجھ سے پوچھے کہ میرے کام پر اعتراض کیوں کیا؟ تو میں کیا جواب دوں گا۔ ایسے لوگوں کے لئے جن کے ساتھ حسد ہو ان کے لئے بتکلف مزید نعمتوں کی دعا کرو اور ساتھ یہ دعا بھی کرو کہ یہ نعمتیں (اگر جائز ہوں) مجھے بھی عنایت فرمائی جائیں۔

1.1.1.7... بخل

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ "وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ" یعنی اور جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ سے بخل کرتا ہے۔ (محمد:38) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "وَالْبَخِيْلُ بَعِيْدٌ مِّنَ اللّٰهِ بَعِيْدٌ مِّنَ الْجَنَّةِ بَعِيْدٌ مِّنَ النَّاسِ قَرِيْبٌ مِّنَ النَّارِ" (رواه الترمذي) یعنی کنجوس اللہ تعالیٰ سے دور ہے، جنت سے دور ہے، لوگوں سے دور ہے، دوزخ کے قریب ہے۔

حقیقتِ بخل

جس چیز کا خرچ کرنا شرعاً یا مروتاً ضروری ہو اس میں تنگ دلی کرنا بخل ہے۔

بخل اور شح میں فرق

شح اور بخل میں یہ فرق ہے کہ کسی چیز کی شدید حرص کرنا اس کی طلب میں نہایت کوشش و مبالغہ کرنا اسے حاصل کرنے میں انتہائی قوت صرف کر دینا اور ٹوٹ مرنا شح کہلاتا ہے اور کوئی چیز حاصل ہو جانے پر خرچ نہ کرنا اس سے محبت رکھنا اور بند رکھنا بخل کہلاتا ہے تو بخیل مال حاصل ہونے سے پہلے "شحیح" (شح والا) ہوتا ہے اور حصول کے بعد بخیل تو بخل شح کا ثمرہ ہے اور شح سے ہی بخل پیدا ہوتا ہے۔ جو طبیعت میں چھپی ہوتی ہے، لہٰذا جس نے بخل کیا اس نے شح کی اطاعت کی اور جس نے بخل نہ کیا تو اس نے شح کی نافرمانی کر کے اپنے نفس کو اس کے شر سے بچا لیا اور یہی شخص فلاح یاب ہے عزو جل کا ارشاد ہے:وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ "جو لوگ نفس کی بخیلی سے بچا لیے گئے تو وہ فلاح پائیں گے" (سورۃ حشر:9، سورۃ التغابن:16)

تشریح

بخل کے دو درجے ہیں۔ ایک شریعت کے تقاضے کی مخالفت ہے اور یہ معصیت ہے اور دوسرا مروت کے تقاضے کی مخالفت ہے وہ معصیت نہیں ہے لیکن

خلافِ اولیٰ ہے۔ فضیلت تو یہ ہے کہ یہ بھی نہ ہو نیز جو ضرورتیں اتفاقیہ طور پر پیش آجائیں، ان کو پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ جس مال کے ذریعے سے آدمی اپنی آبرو کو بچائے وہ بھی صدقہ ہے۔ مثلاً کسی مال دار کو یہ اندیشہ ہو کہ یہ شاعر یا ڈوم یا ہیجڑا یا بہروپیا تیری ہجو کرے گا اور اگر اس کو کچھ میں دے دوں گا تو اس کا منہ بند ہو جائے گا اور باوجود اس علم کے اگر اس کو کچھ نہ دے تو وہ شخص بخیل سمجھا جائے گا۔ کیونکہ اس نے اپنی آبرو محفوظ رکھنے کی تدبیر نہ کی اور بد گو کو بدگوئی کا موقع دیا۔ بخل بہت بڑا مرض ہے اس لئے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اپنے آپ کو شح سے بچاؤ کہ اس نے پہلی امتوں کو ہلاک کر دیا۔ پس مسلمان کو شایان نہیں کہ بخل کرے اور جہنم میں جائے اور چونکہ بخل درحقیقت مال کی محبت ہے اور مال کی محبت دنیا کی طرف متوجہ کر دیتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی محبت کا علاقہ ضعیف اور کمزور ہو جاتا ہے اور بخیل مرتے وقت حسرت بھری نظروں سے اپنا جمع کیا ہوا محبوب مال دیکھتا اور جبراً و قہراً آخرت کا سفر کرتا ہے اس لئے اس کو خالق جل جلالہ کی ملاقات محبوب نہیں ہوتی۔ ایک حدیث شریف میں آیا ہے کہ "جو شخص اللہ سے ملنے کو محبوب رکھتا ہے، اللہ بھی اس سے ملنے کو محبوب رکھتا ہے اور جو اللہ سے ملنے کو پسند نہیں کرتا ہے اللہ بھی اس سے ملنے کو پسند نہیں کرتا۔" (بخاری)

بخل کا علاج

مال کی محبت کو موت کی یاد کی کثرت سے دل سے نکالنا اس کا علاج ہے۔ مال کو حسنات کے لئے استعمال کرنے کی فضیلتیں سننا یعنی فضائلِ صدقات۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب فضائلِ صدقات اس میں مطالعہ کرنا بہت خوب ہے۔ سخی لوگوں کے واقعات پڑھنا، بتکلف لوگوں پر جائز طریقے سے خرچ کرنا چاہے دعوت کی صورت میں ہو یا کسی اور صورت میں اور اپنے رشتہ داروں پر خرچ کرنا زیادہ مفید ہے۔

1.1.1.8... رِیا

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ "یُرَآءُوْنَ النَّاسَ" یعنی وہ لوگوں کو دکھلاتے ہیں۔ (النساء:142) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "إِنَّ يَسِيْرَالرِّيَاءِشِرْكٌ" (رواہ ابن ماجہ) یعنی بے شک تھوڑی ریا بھی شرک ہے۔

حقیقتِ ریا

اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں لوگوں کی پسند اور ناپسند پر نظر ہونا ریا کی حقیقت ہے۔

تشریح

ریا کی اصلیت یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اپنی عبادت اور عملِ خیر کے ذریعے سے وقعت اور منزلت کا خواہاں ہو۔ اور یہ عبادت کے مقصود کے بالکل خلاف ہے کیونکہ عبادت سے مقصود حق تعالیٰ کی رضامندی ہے اور اب چونکہ اس مقصد میں دوسرا شریک ہو گیا یعنی مخلوق کی رضا اور حصولِ منزلت کی نیت ہے، لہٰذا اس کا نام شرکِ اصغر ہے۔ نیز آیت کریمہ "فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا" جو کوئی اپنے رب سے ملنے کی امید رکھے تو اسے چاہیے کہ اچھے کام کرے۔ (الکھف:110) میں مفسرین نے "وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ أَحَدًا" اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔ (الکھف:110) کی تفسیر ریا نہ کرنے سے فرمائی ہے۔ چنانچہ قاضی ثناءُاللہ صاحب پانی پتی قدس سرہ تفسیر مظہری میں اس آیت کریمہ کے تحت لکھتے ہیں "اَی لَا يُرَاءِ بِعَمَلِهٖ وَلَا يَطْلُبُ عَلَى عَمَلِهٖ أَجْراً مِّنْ أَحَدٍ غَيْرِهٖ تَعَالٰى جَزَاءً وَّلَا ثَنَاءً" یعنی اپنے عمل کو دکھلاوے کے لئے نہ کرے اور نہ اپنے عمل پر خدا تعالیٰ کے سوا کسی سے کسی قسم کے بدلے یا تعریف کا طلبگار ہو۔ نیز حدیث شریف میں آیا ہے کہ "قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ بندوں کو جزا اور سزا اور انعامات عطا فرمائے گا تو ریاکاروں کو حکم دے گا کہ انہی کے پاس جاؤ جن کے دکھلانے کو تم نمازیں پڑھتے تھے اور عبادتیں کیا کرتے تھے، اپنی عبادتوں کا ثواب اور طاعت کا صلہ بھی انہی سے لو اور

دیکھو کیا دیتے ہیں؟" (مسند أحمد)

بخاری شریف کی ایک حدیث شریف میں آیا ہے کہ "پہلے قیامت میں جس کا فیصلہ ہو گا وہ ایک شخص ہو گا۔ جو شہید ہوا۔ جب اس کو اللہ کے پاس لائیں گے تو اللہ اپنی نعمت اس کو بتلا دے گا وہ پہچانے گا، اللہ تعالیٰ پوچھے گا: تو نے اس کے لیے کیا عمل کیا ہے؟ وہ بولے گا: میں لڑا تیری راہ میں یہاں تک کہ شہید ہوا۔ اللہ تعالیٰ فرما دے گا: تو نے جھوٹ کہا تو لڑا تھا اس لیے کہ لوگ بہادر کہیں اور تجھے بہادر کہا گیا، پھر حکم ہو گا اس کو اوندھے منہ گھسیٹتے ہوئے جہنم میں ڈال دیں گے۔ اور ایک شخص ہو گا جس نے دین کا علم سیکھا اور سکھلایا اور قرآن پڑھا۔ اس کو اللہ تعالیٰ کے پاس لائیں گے وہ اپنی نعمتیں دکھلائے گا وہ شخص پہچان لے گا تب کہا جائے گا تو نے اس کے لیے عمل کیا ہے؟ وہ کہے گا: میں نے علم پڑھا اور پڑھایا اور قرآن پڑھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو جھوٹ بولتا ہے تو نے اس لیے علم پڑھا تھا کہ لوگ تجھے عالم کہیں اور قرآن اس لیے پڑھا تھا کہ لوگ قاری کہیں تجھ کو عالم اور قاری دنیا میں کہا گیا پھر حکم ہو گا، اس کو منہ کے بل گھسیٹتے ہوئے جہنم میں ڈال دیں گے۔ اور ایک شخص ہو گا جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا تھا اور سب طرح کے مال دیئے تھے وہ اللہ تعالیٰ کے پاس لایا جائے گا اللہ تعالیٰ اس کو اپنی نعمتیں دکھلائے گا وہ پہچان لے گا اللہ تعالیٰ پوچھے گا: تو نے اس کے لیے کیا عمل کیے وہ کہے گا: میں نے کوئی راہ مال خرچنے کی جس میں خرچ کرنا پسند کرتا تھا نہیں چھوڑی تیرے واسطے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو جھوٹا ہے تو نے اس لیے خرچا کہ لوگ سخی کہیں تو تجھے لوگوں نے سخی کہہ دیا دنیا میں، پھر حکم ہو گا، منہ کے بل کھینچ کر جہنم میں ڈال دیں گے۔"

مسلم شریف کی ایک حدیث قدسی میں ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں تمام شریکوں سے بڑھ کر شرک سے بیزار ہوں۔ جس کسی نے کوئی (دین کا) عمل کیا اس میں میرے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کیا تو میں اسے، اس کے عمل اور اس کے شریک کو چھوڑ دیتا ہوں۔ اس ارشاد پاک کو گوش بگوش سنو اور عبرت پکڑو۔ لہٰذا کسی عمل میں نہ اظہار کا قصد کریں نہ اخفاء کا، اپنے کام سے کام

رکھیں۔ اپنے اختیار سے ہر کام میں رضاء حق کا قصد ہو اور اپنے اختیار سے رضاء خلق کا قصد نہ کریں بِلا قصد اگر رضاء خلق کا وسوسہ یا خیال آئے تو اس کی مطلق پرواہ نہ کریں اور عمل سے پہلے مراقبہ و محاسبہ کرتے رہیں کہ اس میں میرا کیا قصد ہے آیا رضاء حق ہے یا رضاء خلق، اور نیت کو خالص کر کے عمل کیا کریں۔ ریا اختیاری عمل ہے اس لئے اگر کوئی اپنے اختیار سے کرتا ہے تو گنہگار ہے اور اگر اس کو صرف ریا کا وسوسہ آتا ہے تو اس پر کوئی گرفت نہیں۔ اس کو خوب سمجھ لیا جائے کیونکہ اس میں بہت سارے غلطی کرتے ہیں۔

ریا کا علاج

حبِ جاہ کو دل سے نکالیں، کیونکہ ریا اسی کا ایک شعبہ ہے اور عبادت پوشیدہ کیا کریں یعنی وہ عبادت جو جماعت سے نہیں ہے اور جس عبادت کا اظہار ضروری ہے اس کے اندر ازالۂ ریا کے لئے ازالۂ حبِ جاہ کافی ہے۔ اور طریق معالجے کا یہ ہے کہ جس عبادت میں ریا ہو اس کو کثرت سے کریں، پھر نہ کوئی التفات کرے گا نہ اس کو یہ خیال رہے گا۔ چند روز میں ریا سے عادت پھر عادت سے عبادت اور اخلاص بن جائے گی۔

1.1.1.9... عُجب

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "اِذْاَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ (الآیۃ)" یعنی جبکہ تم کو تمہارا زیادہ ہونا بھلا معلوم ہوا۔ (التوبہ:25) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "وَأَمَّا الْمُهْلِكَاتُ فَهَوًى مُتَّبَعٌ وَ شُحٌّ مُطَاعٌ وَإِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهٖ وَهِيَ أَشَدُّهُنَّ" (رواہ البیہقی) یعنی رہے مہلکات، سو وہ خواہش ہے جس کی پیروی کی جائے اور بخل ہے جس کے موافق عمل کیا جائے اور آدمی کا اپنے آپ کو اچھا سمجھنا اور یہ سب سے بڑھ کر ہے۔

حقیقتِ عُجب

اپنے کمال کی نسبت اپنی طرف کرنا اور اس کا خوف نہ ہونا کہ شاید سلب ہو

جائے۔ یہ عُجب ہے۔

تشریح

عجب کی حقیقت یہ ہے کہ نفس کی ایک چال ہے کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ ممتاز ہو کر رہے اور اس میں اس کو مزا آتا ہے۔ سو یہ عجب ہے اور عجب ایسی بری چیز ہے کہ جس وقت کوئی شخص اپنی نظر میں پسندیدہ ہو جاتا ہے اس وقت اللہ کی نظر میں ناپسندیدہ ہوتا ہے۔ البتہ اگر اللہ کی نعمت پر خوش ہو اور اس کے چھن جانے کا خوف بھی دل میں رکھے اور اتنا ہی سمجھے کہ یہ نعمت حق تعالیٰ نے فلاں علم یا عمل کے سبب مجھ کو مرحمت فرما دی ہے اور وہ مالک و مختار ہے جس وقت چاہے اس کو مجھ سے لے لے تو یہ خودپسندی اور عجب نہیں ہے۔ کیونکہ خودپسند شخص نعمت کا منعم حقیقی (اصل انعام کرنے والا) کی جانب منسوب کرنا ہی بھول جاتا ہے اور جملہ نعمتوں کو اپنا حق سمجھنے لگتا ہے۔ عجب میں صرف ایک قید کم ہے یعنی اس میں دوسروں کو چھوٹا سمجھنا نہیں صرف اپنے آپ کو بڑا سمجھنا ہے باقی سب اجزاء وہی ہیں جو تکبر کے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ "جو شخص اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے اور اتراتا ہوا چلتا ہے وہ قیامت کے روز خدا تعالیٰ سے ایسی حالت میں ملاقات کرے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر سخت غضب ناک ہو گا۔" (مسند احمد)

عُجب کا علاج

اس کمال کو عطائے خداوندی سمجھے اور اس کی قدرت کو یاد کر کے ڈرے کہ شاید سلب ہو جائے دوسرا علاج یہ ہے کہ کمال کا اعلیٰ درجہ پیشِ نظر رکھ کر غور سے اپنی لغزش اور کوتاہی ظاہری و باطنی دیکھے تاکہ اپنی بزرگی اور کمال کا گمان پیدا نہ ہو۔ اس کا بھی اصل علاج اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرنا ہے۔ شیطان کے دل میں بھی چونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں تھی اس لئے سب کمالات کی نسبت اپنی طرف کی۔ جو عاشق ہوتا ہے وہ محبوب میں فنا ہو جاتا ہے اور اس کو سب چیزوں

میں اپنا محبوب نظر آتا ہے اس لئے اس کے لئے اپنے کمالات محبوب تک پہنچنے کا باعث ہوتے ہیں۔ جب کسی کو اپنے اندر عجب محسوس ہونے لگے تو فوراً اپنے آپ سے کہے کہ چونکہ عجب رذیلہ ہے اس کے ہوتے میں کیسے بزرگ ہو سکتا ہوں۔

1.1.1.10... خود رائی

جب کوئی شخص کسی خوبی کا سن کر اس کو اپنے میں سمجھنا شروع کرے تو سمجھ لو کہ یہ خود رائی میں مبتلا ہے۔ یہ بھی بڑا عیب ہے۔ اس کی وجہ سے انسان کی نظر اپنے عیوب سے اور دوسروں کے محاسن سے اٹھ جاتی ہے۔ وہ صرف اپنی ذات میں مگن رہتا ہے۔ اپنے منہ میاں مٹھو بنا رہتا ہے۔ جب بھی کسی کی کوئی خوبی سنتا ہے تو بجائے اس کے اس کی تحسین کرے کوشش کرتا ہے کہ اس وقت اپنی کوئی خوبی چاہے وہ واقعی ہو یا من گھڑت سامنے لانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ لوگ دوسرے کی تعریف کی بجائے اس کی تعریف کریں۔ اللہ تعالیٰ اس بیماری سے ہر ایک کو بچائے، آمین۔ یہ اصلاح کے راستے میں بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے کیونکہ اس کا مریض اپنی اصلاح کے لئے محنت نہیں کرتا اور ان محاسن کو جن کے حاصل کرنے کا حکم ہے اپنے میں موجود سمجھ کر اس سے غافل ہوتا ہے نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ یہ عجب کی بھی ماں ہے کیونکہ عجب میں تو انسان اپنے محاسن پر ناز کرتا ہے یہاں تو عیوب کو بھی محاسن سمجھنے لگتا ہے۔ یہ دونوں سراب ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو ان سے بچائے۔ آمین

خودرائی کا علاج

اس کی وجہ بھی دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور محبت کا نہ ہونا ہے۔ اس لئے ایسے شخص کو چاہیے کہ جلد از جلد اللہ تعالیٰ کی محبت کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے لئے اہل اللہ کی صحبت میں بیٹھنا جاری رکھے۔ شیخ کی صحبت میسر ہو تو وہ تو نور علیٰ نور ہے۔ یہ مراقبہ بھی اس کے لئے مفید ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے میرے اعمال پیش کئے جا رہے ہیں اور جیسا کہ ظاہر ہے کہ

اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز چھپائی نہیں جاسکتی اس لئے بندہ حیران و پریشان ہے کہ اپنے اعمال میں جو عیوب ہیں ان کو کیسے چھپائے بس یہی بات دل کو لگے گی کہ اپنے اعمال کو انتہائی کمزور سمجھ کر اللہ تعالیٰ سے معافی کا خواستگار ہو اور جب تک زندہ ہے اپنی اصلاح کی فکر لگی ہو۔ اس مراقبہ سے دل کی گرہیں کھلیں گی۔ اپنے محاسن بھی عیوب نظر آئیں گے اور حقیقی توبہ کی دولت نصیب ہو جائے گی۔ اِن شاء اللہ۔

ایک دفعہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید نے خط میں ذکر کیا کہ میں کیا کروں مجھے اپنے عیوب نظر نہیں آرہے ہیں۔ حضرت نے جواب میں لکھا کہ اگر یہ بات ہے تو تم لاعلاج ہو۔یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ مجھے اپنا منہ نہ دکھاؤ۔ بے وقوف ذرا یہ مراقبہ تو کرو (جو اوپر ذکر کیا گیا) پھر دیکھو تیرے اعمال کی کیا حقیقت ہے۔ اس شخص نے جب اس پر عمل کیا تو لکھا کہ حضرت میرا دماغ درست ہوگیا۔ اب مجھے کوئی عمل بھی ایسا نظر نہیں آتا جو رب کے حضور پیش کروں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے میرا دل ایک صندوق ہے جس پر اوپر سے خوشنما کاغذ اور پھول سجے ہوئے ہیں لیکن اندر جب کھول کر دیکھا تو اس میں گوہ اور گوہ (بول براز) ہی جما ہوا ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں لکھا مبارک ہو حقیقت تک رسائی ہوئی اب اِن شاء اللہ اس بول براز سے کھاد کا کام لیا جائے اور دل میں ایسے خوشنما پھول اور پھل لگیں گے کہ دل خوش ہو جائے گا۔ پس خود رائی کا یہ مراقبہ مؤثر علاج ہے۔

1.1.1.11... تکبّر

ارشادِ خداوندی ہے کہ "اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَکْبِرِیْنَ" تحقیق اپنی بڑائی کرنے والوں کو اللہ پسند نہیں کرتا۔ (النحل:23) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "لَایَدْخُلُ الْجَنَّةَ أَحَدٌ فِي قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّن كِبْرٍ" (مسلم) یعنی جس کے دل میں رائی کے برابر بھی تکبر ہو وہ جنت میں نہیں جائے گا۔

حقیقتِ کبر

اپنے آپ کو صفاتِ کمال میں دوسرے سے بڑھ کر سمجھنا یا دوسروں کو کسی بھی وجہ سے حقارت سے دیکھنا۔

تشریح

تکبر کی قسمیں بہت ہیں اور اکثر ان میں بہت باریک اور مخفی ہیں کہ کسی کی نظر سوائے شیخ کامل کے وہاں تک نہیں پہنچتی اور اس میں علماء ظاہر کو بھی کسی محقق کی تقلید کرنی پڑتی ہے۔ تکبر کا حاصل یہ ہے کہ کسی کمالِ دینی یا دنیوی میں اپنے آپ کو با اختیارِ خود دوسرے سے اس طرح افضل سمجھنا کہ اپنے مقابلے میں دوسرے کو حقیر سمجھے تو اس میں دو جزو ہوں گے۔ اول اپنے آپ کو بڑا سمجھنا، دوم دوسرے کو اپنے سے حقیر سمجھنا۔ یہ تکبر کی حقیقت ہے جو حرام اور معصیت ہے اور ایک تکبر کی صورت ہے کہ اس میں سب اجزاء ہیں، بجز ایک جزو اختیار کے یعنی بلا اختیار ان اجزاء کا خیال آگیا۔ یہاں تک تو معصیت نہیں لیکن اگر اس کے بعد اس خیال کو با اختیارِ خود اچھا سمجھا یا باوجود اچھا نہ سمجھنے کے با اختیارِ خود اس کو باقی رکھا تو یہ حقیقت کبر کی ہو جائے گی اور معصیت ہو گی۔ اور جو قید لگائی گئی ہے کہ دوسرے کو حقیر سمجھے یہ اس لئے ہے کہ اگر وہ واقعی کوئی بڑائی چھوٹائی کا اس طرح معتقد ہو کہ دوسرے کو ذلیل نہ سمجھے تو وہ تکبر نہیں ہے جیسا کہ ایک بیس برس کی عمر والا دو برس کے بچے کو سمجھے کہ یہ عمر میں مجھ سے چھوٹا ہے مگر اس کو حقیر نہیں سمجھتا تو یہ کبر نہیں۔ الغرض جو شخص با اختیارِ خود اپنے آپ کو دوسروں سے اچھا سمجھتا ہے اس کا نفس پھول جاتا ہے اور پھر اس کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں مثلاً دوسروں کو نظرِ حقارت سے دیکھنا یا اگر کوئی سلام کرنے میں پیش قدمی نہ کرے تو اس پر غصہ ہونا، کوئی اگر تعظیم نہ کرے تو ناراض ہونا، کوئی اگر نصیحت کرے تو ناک بھوں چڑھانا، حق بات کے معلوم ہونے کے بعد بھی اس کو نہ ماننا اور عوام الناس کو ایسی نظر سے دیکھنا جس طرح گدھوں کو دیکھتے ہیں۔

تکبر سے اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں رکھے یہ بہت برا مرض ہے اور تمام امراض

کی جڑ ہے۔ تکبر ہی سے کفر پیدا ہوتا ہے۔ تکبر ہی سے شیطان گمراہ ہوا۔ اس لئے حدیث میں اس پر سخت وعیدیں آئیں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ عزوجل کا فرمان ہے: بڑائی (کبریائی) میری چادر ہے اور عظمت میرا تہ بند، تو جو کوئی ان دونوں چیزوں میں کسی کو مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گا میں اسے جہنم میں ڈال دوں گا" (ابوداود) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جنت میں نہ جائے گا وہ شخص جس کے دل میں رتی برابر بھی غرور اور گھمنڈ ہو گا۔" ایک شخص بولا: ہر ایک آدمی چاہتا ہے اس کا جوتا اچھا ہو اور کپڑے اچھے ہوں (اوروں سے) تو کیا یہ بھی غرور اور گھمنڈ ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اللہ جمیل ہے، دوست رکھتا ہے جمال کو۔ غرور گھمنڈ یہ ہے کہ انسان حق کو ناحق کرے (یعنی اپنی بات کی پچ یا نفسانیت سے ایک بات واجبی ہو اور صحیح ہو اس کو رد کرے اور نہ مانے) اور لوگوں کو حقیر سمجھے (مسلم شریف)۔ اور فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص تکبر کی وجہ سے تہبند گھسیٹتا ہوا چلے گا تو اللہ پاک اس کی طرف قیامت کے دن نظر بھی نہیں کرے گا۔" ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے تہمد کا ایک حصہ کبھی لٹک جاتا ہے مگر یہ کہ خاص طور سے اس کا خیال رکھا کروں۔ آپ ﷺ نے فرمایا "تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو ایسا تکبر سے کرتے ہیں۔" (بخاری) اور فرمایا "میرے نزدیک تم میں سے (دنیا میں) سب سے زیادہ محبوب اور قیامت کے دن مجھ سے سب سے زیادہ قریب بیٹھنے والے وہ لوگ ہیں جو تم میں بہترین اخلاق والے ہیں، اور میرے نزدیک تم میں (دنیا میں) سب سے زیادہ قابل نفرت اور قیامت کے دن مجھ سے دور بیٹھنے والے وہ لوگ ہیں جو ثرثارون، متشدقون، اور مُتَفَيْهِقُون ہیں"، صحابہؓ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! ہم نے ثرثارون (باتونی) اور متشدقون (بلااحتیاط بولنے والے) کو تو جان لیا لیکن مُتَفَيْهِقُون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا: "تکبر کرنے والے" اور فرمایا: "جنت اور دوزخ نے جھگڑا کیا۔ دوزخ نے کہا: مجھ میں بڑے بڑے زوردار مغرور لوگ آئیں گے اور جنت نے کہا: مجھ میں ناتواں مسکین لوگ آئیں گے۔ اللہ جل جلالہ نے دوزخ سے فرمایا: تو میرا عذاب ہے میں جس کو چاہوں گا تجھ

سے عذاب کروں گا اور جنت سے فرمایا: تو میری رحمت ہے جس پر چاہوں گا تجھ سے رحم کروں گا اور تم دونوں بھری جاؤ گی۔"

کبر کا علاج

اللہ تعالیٰ کی عظمت کو یاد کرے تاکہ اپنے کمالات ہیچ نظر آئیں، اور جس شخص سے اپنے آپ کو بہتر سمجھتا ہے اس کے ساتھ تواضع اور تعظیم سے پیش آئے تاکہ عادی ہو جائے۔ ذہن میں بات جما دے کہ مجھے یہ ساری نعمتیں اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہیں اور ان کی بقا بھی اس کے حکم سے ہے۔ اگر وہ نہ چاہے تو یہ نعمتیں آن کی آن میں چھن سکتی ہیں۔ اگر کسی کے اعمال اپنے سے کم نظر آئیں تو یہ سوچے کہ ممکن ہے میرے اعمال اس سے زیادہ ہوں لیکن کامیابی زیادہ اعمال پر نہیں بلکہ اس کے فضل پر ہے نیز جیسے آگ تمام چیزوں کو آن کی آن میں خاکستر کرتی ہے یا زہر تمام غذاؤں کے اثر کو آنِ واحد میں تباہ کر سکتا ہے اس طرح میرے اس تکبر سے ممکن ہے میرے تمام اعمال ہیچ ہو جائیں اور اس کے پاس جو تھوڑے بہت اعمال ہیں وہ اس کی عاجزی کے سبب قبول ہو جائیں۔ یا یہ نہ ہو تو آخر کا کسے پتا کہ خاتمہ کیسے ہو ممکن ہے میں مارا جاؤں اور وہ کامیاب ہو۔

1.1.1.12... کینہ

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ" یعنی اختیار کرو معاف کر دینے کو اور حکم کرو اچھی بات کا اور منہ موڑ لو جاہلوں سے۔ (الأعراف:199) اور فرمایا رسول اللہ ﷺ نے "وَلَا تَبَاغَضُوْا" (رواه البخاري) یعنی آپس میں بغض نہ رکھو۔

حقیقتِ کینہ

جب غصہ میں بدلہ لینے کی قوت نہیں ہوتی تو اس کے ضبط کرنے سے اس شخص کی طرف سے دل پر ایک قسم کی گرانی کا ہو جانا جس کے سبب سے اس کو

کسی تکلیف دینے کے درپے ہونا۔

تشریح

کینہ صرف ایک عیب نہیں بلکہ بہت سے گناہوں کا بیج ہے، جب غصہ نہیں نکلتا تو اس کا خمار دل میں بھرا رہتا ہے اور بات بڑھتی اور رنجیدگیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ کینہ یہ ہے کہ اپنے اختیار اور قصد سے کسی کی برائی یا بدخواہی دل میں رکھی جائے اور اس کو ایذا پہنچانے کی تدبیر بھی کرے۔ اگر کسی سے رنج کی کوئی بات بھی پیش آئے اور طبیعت اس سے ملنے کو نہ چاہے تو یہ کینہ نہیں بلکہ انقباضِ طبعی ہے جو گناہ نہیں۔ کینہ کے متعلق حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں پیر اور جمعرات کے دن، پھر ہر ایک بندہ کی مغفرت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہیں کرتا مگر وہ شخص جو کینہ رکھتا ہے اپنے بھائی سے اس کی مغفرت نہیں ہوتی اور حکم ہوتا ہے ان دونوں کو دیکھتے رہو جب تک مل جائیں، ان دونوں کو دیکھتے رہو جب تک مل جائیں" (جب مل جائیں ان کی مغفرت ہو) (رواہ مسلم)۔ نیز فرمایا کہ ان دو آدمیوں کی مغفرت نہیں ہوتی جن کے درمیان عداوت و کینہ ہو۔یہاں پر عداوت سے مراد وہ عداوت ہے جس کا معنیٰ ناحق اُمور ہوں۔ اسی لئے اگر کسی مسلمان کو کسی سے دین کے متعلق خدا تعالیٰ کے واسطے دشمنی ہو تو یہ عداوت مستحسن اور قابلِ اجر ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں " اَلْحُبُّ لِلّٰہِ وَالْبُغْضُ لِلّٰہِ" کا امر ہے۔

کینہ کا علاج

جس شخص سے کینہ ہو اس شخص کا قصور معاف کر دینا اور اس سے میل جول شروع کر دینا گو بتکلف ہی ہو۔ کینہ میں چونکہ مخفی طور پر غصّہ شامل ہے بس فرق یہ ہے کہ غصّہ وقتی طور پر ہوتا ہے اور اس میں سوچ کا عنصر کم ہوتا ہے جبکہ کینہ مستقبل کے لئے ہوتا ہے اور اس میں سوچ کا عنصر شامل ہوتا ہے اس

لئے روحانی طور پر کینہ زیادہ قابل مذمت ہے۔ سوچ کا علاج سوچ ہے اس لئے اپنے آپ کو رب کا قصوروار سمجھ کر یہ سوچا جائے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ حساب کیا تو میں کیسے بچ سکتا ہوں؟ پس مجھے بھی اس کی مخلوق کو معاف کرنا چاہیے تاکہ وہ میرے اوپر رحم فرمائے۔ ترمذی شریف کی ایک حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم کرتا ہے، تم لوگ زمین والوں پر رحم کرو تم پر آسمان والا رحم کرے گا، رحم رحمٰن سے مشتق (نکلا) ہے، جس نے اس کو جوڑا اللہ اس کو (اپنی رحمت سے) جوڑے گا اور جس نے اس کو توڑا اللہ اس کو اپنی رحمت سے کاٹ دے گا۔

1.1.2... جلبی اعمال (اخلاقِ حمیدہ)

اخلاقِ حمیدہ اخلاقِ رذیلہ کا ضد ہے اس لئے جہاں رذائل کے بالمقابل ضد والے اخلاقِ حمیدہ حاصل کرنے ہوں تو اس رذیلے کی اصلاح ہی اس کے بالمقابل اچھے اخلاق کا حصول ہے مثلاً اخلاص ریا کا ضد ہے پس اگر ریا ختم ہو جائے تو اخلاص حاصل ہو جائے۔ البتہ ایک بات کی تحقیق اس میں ضروری ہے کہ جیسے اعداد منفی، صفر اور مثبت ہوتے ہیں اس لئے منفی نہ ہونا ہر وقت مثبت ہونے کی علامت نہیں ہے کیونکہ وہ صفر بھی ہو سکتا ہے جو نہ منفی ہے نہ مثبت مثلاً اسی مثال میں بعض دفعہ ایک آدمی کوئی کام نہ تو اللہ تعالیٰ کے لئے کرتا ہے اور نہ کسی مخلوق کے لئے بس صرف اس سے اپنی کوئی ذاتی منفعت وابستہ ہوتی ہے۔ اس لئے وہ ریا تو نہیں کہ اس کو گناہ ہو البتہ اس کو اس عمل کا آخرت میں کوئی فائدہ بھی حاصل نہیں ہوتا مثلاً کوئی داڑھی اس لئے رکھے کہ اس سے خوبصورت لگتا ہے تو وہ خوبصورت تو لگے گا اور داڑھی نہ رکھنے کا گناہ بھی نہیں ہوگا لیکن اس کو سنت کا ثواب نہیں ملے گا۔ اب اخلاقِ حمیدہ کی تفصیل دی جاتی ہے اور ان کے حصول کا فوری طریقہ بھی کیونکہ یہ بھی حقیقی معنوں میں تب حاصل ہوتے ہیں جب فنا اور بقا کی کیفیت حاصل ہو جاتی ہے اور عبدیتِ تامہ سالک کا خاصہ بن جاتا ہے۔

1.1.2.1... توحید

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ "وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْن" اور اللہ ہی نے تم کو اور تمہارے اعمال کو پیدا کیا ہے۔ (الصّافات:96) نیز ارشاد ہے کہ "وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ" اور تمہارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے جب تک اللہ نہ چاہے۔ (التکویر:29) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، "وَاعْلَمْ أَنَّ الأُمَّةَ لَواجْتَمَعَتْ عَلى أَن يَّنْفَعُوْكَ لَمْ يَنْفَعُوْكَ اِلَّا بِشَيْئٍ قَدْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكَ وَلَواجْتَمَعُوا عَلى أَن يَضُرُّوْكَ لَمْ يَضُرُّوْكَ اِلَّا بِشَيْئٍ قَدْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْكَ" (رواه احمد و الترمذي) یعنی جان لو کہ اگر سب متفق ہو جائیں اس پر کہ تجھ کو کچھ نفع

پہنچا دیں، ہر گز نہیں پہنچا سکتے۔ مگر اس چیز کا جو اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے، اور اگر سب متفق ہو جائیں کہ تم کو نقصان پہنچائیں ہر گز نقصان نہ پہنچا سکیں گے مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقدر میں لکھ دیا ہے۔

توحید کیا ہے؟

یہ یقین کر لینا کہ خدا کے ارادے کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا توحید کہلاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہر گز نہیں کہ خدا کے بغیر کوئی دوسرا موجود نہیں جیسا کہ جو لوگ وحدت الوجود کا دعویٰ کرنے والے کہتے ہیں کیونکہ خدا کو اس کی تمام صفات کے ساتھ ماننا پڑتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ایک صفت خلق بھی ہے اور خالق کوئی تب ہی ہو سکتا ہے جب اس نے مخلوق تخلیق کی ہو اس لئے مخلوق کی موجودگی ماننا خالق کا ماننا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کا ایسا ادراک کسی کو ہو جائے کہ مخلوق کی موجودگی اس کو محسوس ہی نہ ہو جیسے سورج کی موجودگی میں ستارے نظر نہیں آتے لیکن یہ جانتا ہے کہ ستارے بھی موجود ہیں۔ اسی کو وحدت الشہود کہتے ہیں۔

توحید کو توہینِ مقربین میں بدلنا ٹھیک نہیں۔ توحید کے مقابلے میں شرک ہے جس کو اللہ تعالیٰ نہیں بخشتے اس لئے توحید کا حاصل کرنا اور شرک سے بچنا سب کے لئے انتہائی ضروری ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے جن مقربین کو عزت عطا فرمائی ہے چاہے وہ انبیاء علیہم السلام ہوں یا امتی ہر دو صورتوں میں توحید کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ ان کی توہین کی جائے۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہے تو اس سے بچنا بہت ضروری ہے ورنہ بے ادبی کے جرم میں سب کچھ ضائع ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوبین کے بارے میں بہت غیور ہے اس لئے جو ان کی شان میں بے ادبی کرنے کا مرتکب ہوتے ہیں وہ مردود ہو جاتے ہیں۔ ان کے سارے اعمال ضائع ہو سکتے ہیں۔"لَا تَرۡفَعُوۡا اَصۡوَاتَکُمۡ فَوۡقَ صَوۡتِ النَّبِیِّ" اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند نہ کیا کرو۔ (الحجرات:2) میں اس کی تعلیم موجود ہے نیز اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں جو میرے کسی ولی کو تکلیف پہنچاتا ہے میرا اس کے ساتھ اعلانِ جنگ ہے۔

(مسلم شریف) پس نہ تو شرک میں مبتلا ہونا چاہیے کہ یہ جرم ناقابل معافی ہے اور نہ بے ادبی کا مرتکب کہ اس کا انجام بھی تباہی ہے۔ توحید کا مطلب مقربین کی بے ادبی نہیں اور ادب کو شرک نہیں بنانا چاہیے۔

توحید حاصل کرنے کا طریقہ

مخلوق کے عجز اور خالق کی قدرت کو یاد رکھنا اور سوچنا۔ سورۃ فاتحہ میں اس کا بہترین علاج موجود ہے۔ "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" میں شرک سے بچنے کا انتظام ہے اور "صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" میں بے ادبی سے بچنے کا انتظام ان دونوں کو جمع کرنا ہدایت ہے اور ان دونوں میں سے کسی سے اعراض غضبِ الٰہی کو دعوت دینا اور گمراہی ہے۔ ان آیاتِ مبارکہ کی تلاوت کے دوران اِن کا مفہوم ذہن میں رکھنا اور صحابہ کرام (رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) کی زندگی کا مطالعہ بہت فائدہ پہنچاتا ہے۔

1.1.2.2... اخلاص

اخلاص توحید کا لازمی نتیجہ ہے۔ جو بھی صحیح معنوں میں موحد ہوگا وہ مخلص بھی ہوگا کیونکہ خدا کو ہم سے اخلاص مطلوب ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ "وَمَآ اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوْا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ" اور انہیں یہی حکم دیا گیا تھا کہ عبادت کریں اللہ تعالیٰ کی دین کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے ایسی حالت میں کہ ہر طرف سے یکسو ہوں۔ (البینة:5) اور جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلٰى صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَّنْظُرُ إِلٰى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ" (رواہ المسلم:34) یعنی حق تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کی طرف نظر نہیں فرماتے بلکہ تمہاری نیتوں اور اعمال پر نظر فرماتے ہیں۔

اخلاص کیا ہے؟

اپنی اطاعت میں صرف اور صرف اللہ کی خوشنودی کا ارادہ کرنا اور مخلوق

کی خوشنودی اور رضامندی یا اپنی کسی نفسانی و مالی و جاہی خواہش کے ارادے سے اپنے آپ کو بچانا اخلاص کہلاتا ہے۔ یہ ریا کی ضد ہے اس لئے ریا کا ہونا اخلاص کی غیر موجودگی کی ہی دلیل ہے البتہ بعض دفعہ ایک آدمی کوئی کام نہ تو اللہ تعالیٰ کے لئے کرتا ہے اور نہ کسی مخلوق کے لئے بس صرف اس سے اپنی کوئی ذاتی منفعت وابستہ ہوتی ہے۔ اس لئے وہ ریا تو نہیں کہ اس کو گناہ ہو البتہ اس کو اس عمل کا آخرت میں کوئی فائدہ بھی حاصل نہیں ہوتا مثلاً جیسے کوئی داڑھی اس لئے رکھے کہ اس سے خوبصورت لگتا ہے تو وہ خوبصورت تو لگے گا اور داڑھی نہ رکھنے کا گناہ بھی نہیں ہوگا لیکن اس کو سنت کا ثواب نہیں ملے گا۔ اگر مخلوق کی رضا یا خوشنودی کے لئے کوئی دینی کام کیا جائے گا تو وہ ریا ہے۔ اس سے بچنا فرض ہے ورنہ وہی عمل جہنم میں لے جاسکتا ہے جیسا کہ عالم، سخی اور شہید والی حدیث میں ہے۔

اخلاص حاصل کرنے کا طریقہ

اخلاص ارادے کے ساتھ وابستہ ہے اس لئے اپنی نیت کو درست کرنے سے یہ حاصل ہو جاتا ہے۔ ریا کے باب کو تفصیل سے پڑھ کر اس سے بچنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ کسی شیخ کامل کی اتباع سے ہی ریا کا سدباب ہوسکتا ہے کیونکہ یہ بہت مخفی طریقے سے داخل ہوتی ہے۔ مخلصین کی صحبت کا التزام کرنا چاہیے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے"وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ" تو ان لوگوں کی صحبت میں رہ جو صبح اور شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اسی کی رضامندی چاہتے ہیں۔ (الکھف:28) جس میں مخلصین کے ساتھ بیٹھنے کا امر ہے اور دنیاداروں کے پاس بیٹھنے کی ممانعت ہے۔

اخلاص کے فائدے

چاہے کیسا ہی نیک کام ہو، بڑا ہو یا چھوٹا مگر خلوص کے ساتھ ہو تو اس میں برکت ہوتی ہے۔ چاہے اس کا کوئی بھی معاون نہ ہو، جس قدر اخلاص زیادہ ہو گا

اسی قدر ثواب بڑھتا جائے گا۔ بخاری شریف میں حدیث شریف میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "میرے اصحاب کو برا بھلا مت کہو۔ اگر کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر بھی سونا (اللہ کی راہ میں) خرچ کر ڈالے تو ان کے ایک مد غلہ کے برابر بھی نہیں ہو سکتا اور نہ ان کے آدھے مد کے برابر۔" (رواه البخاري) بات یہ ہے کہ ان حضرات کے اندر خلوص اور محبت اس قدر تھی کہ اوروں کے اندر اتنی نہیں اسی لئے ان حضرات کے صدقات و حسنات بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اخلاص کا اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ محض خدا کے لئے کام کرے۔ مخلوق کا اس میں تعلق ہی نہ ہو۔ اس سے کم یہ ہے کہ مخلوق کو راضی کرنے کے لئے کام کرے مگر کوئی دنیوی غرض مطلوب نہ ہو۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ کچھ نیت نہ ہو، نہ دنیا ہو نہ دین۔ یوں ہی خالی الذہن ہو کر کام کر لیا۔ یہ بھی اخلاص (یعنی ریا کا نہ ہونا) ہے۔

ایک قابل توجہ بات

یہاں اس ضمن میں ایک بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ صرف اخلاص پر بخشش نہیں ہوگی بلکہ اس کے ساتھ حضور ﷺ کے طریقے پر عمل بھی ہو کوئی شخص چاہے کتنے ہی اخلاص کے ساتھ نماز میں ایک رکعت میں تین سجدے کر لے تو اس کی نماز قبول نہیں ہوگی کیونکہ اس نے حضور ﷺ کے طریقے پر نماز نہیں پڑھی۔ یہیں سے بدعت اور سنت میں فرق بھی سمجھنا چاہیے۔ اہلِ بدعت بدعت کو دین سمجھ کر کرتے ہیں اس لئے عین ممکن ہے کہ وہ اخلاص کے ساتھ اس کو کر رہے ہوں لیکن بدعت کے بارے میں آپ ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے "كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ" (متفق الیه) یعنی ہر بدعت گمراہی ہے۔ پس آپ ﷺ کا طریقہ سیکھنا اور اس کے مطابق اخلاص کے ساتھ عمل کرنا لازمی ہے۔ ان دو میں سے کوئی ایک چیز بھی رہ گئی تو تباہی کا اندیشہ ہے۔ اس لئے یہ کوشش کرنی چاہیے کہ اپنے عمل کا علمی اور قلبی جائزہ لینا چاہیے کہ کہیں کوئی بات آپ ﷺ کے طریقے کے خلاف تو نہیں ہو رہی ہے؟ یا طریقہ تو آپ ﷺ کا ہو لیکن کہیں نیت

میں کھوٹ تو نہیں آئی۔ اپنا احتساب روزانہ کرنا چاہیے اور اس کی فکر کرنی چاہیے۔

اس میں ایک بات البتہ سمجھ لینی چاہیے کہ جو مخلصین ہوتے ہیں ان کے لئے اللہ تعالیٰ سمجھنے کا راستہ بنا ہی دیتا ہے جس سے ان کے اخلاص کا بھی امتحان ہو جاتا ہے۔ پس اگر کوئی مخلص شخص بدعات یا جہالت کی کسی بات میں مبتلا ہو تو اس کے فوراً درپے نہیں ہونا چاہیے بلکہ احسن طریقے سے اس پر حضور ﷺ کا طریقہ پیش کرنا چاہیے۔ اگر وہ مخلص ہو گا تو وہ اس کو ضرور لے گا۔ اس سے اس حدیث شریف کا مطلب بھی سمجھ میں آگیا کہ اللہ تعالیٰ ہماری صورتوں اور مال کو نہیں دیکھتے بلکہ ہماری نیتوں اور اعمال کو دیکھتے ہیں پس اگر صرف نیت کافی ہوتی تو اعمال کا یہاں تذکرہ نہ ہوتا۔ اس لئے نیت کا درست ہونا اور عمل کا صحیح ہونا دونوں لازمی قرار پائے۔ اخلاص نہ صرف قبولیت کے لئے ضروری ہے بلکہ ثواب کے درجات و مراتب بھی اخلاص کے مطابق ہوتے ہیں۔ ہر انسان عمل کرتا ہے تو جن کے اعمال درست ہیں ان کے اجر میں فرق ان کے اخلاص میں فرق کی وجہ سے ہو گا۔ جس کے عمل میں اخلاص زیادہ ہو گا وہ زیادہ اجر کا مستحق ہو گا۔

1.1.2.3... توبہ

ہم اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اور اس کی بندگی کرنا ہمارا فرض ہے۔ اس فرض میں جب کوتاہی ہو جاتی ہے اور شیطان کے اغوا سے یا نفس کی شرارت سے آدمی سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس کا اللہ تعالیٰ سے ابھی رشتہ نہیں ٹوٹا یہ بندہ اب بھی اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے روئے گڑگڑائے۔ اپنی خطا کا اعتراف کرے اور اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کر کے اپنا قصور معاف کرائے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ: "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا" یعنی اے ایمان والو اللہ تعالیٰ کی طرف خالص توبہ کرو۔ (التحریم:8) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "یَآأَیُّھَاالنَّاسُ تُوبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَصُوحًا" (رواہ مسلم) یعنی اے لوگو اللہ کی طرف خالص توبہ کرو۔

توبہ کی حقیقت

خطا کو یاد کر کے اس پر نادم ہونا۔ اس گناہ کا ترک کر دینا اور آئندہ کے لئے پختہ ارادہ کرنا کہ اب نہ کروں گا اور خواہش کے وقت نفس کو روکنا توبہ کہلاتی ہے۔

تشریح

توبہ کے معنٰی رجوع کرنے اور بُعد سے قرب کی جانب لوٹ آنے کے ہیں۔ مگر اس کے لئے بھی ایک ابتدا ہے اور ایک انتہا ہے۔ ابتدا تو یہ ہے کہ قلب پر نورِ معرفت کی شعاعیں پھیل جائیں اور دل کو مضمون کی آگاہی حاصل ہو جائے کہ گناہ سُمِ قاتل ہے اور تباہ کر دینے والی شے ہے اور پھر خوف و ندامت پیدا ہو کر گناہ کی تلافی کرنے کی سچی اور خالص رغبت اتنی پیدا ہو جائے کہ جس گناہ میں مبتلا تھا اس کو فوراً چھوڑ دے اور آئندہ کے لئے اس گناہ سے بچنے اور پرہیز کرنے کا مصمم قصد کرے اور اس کے ساتھ ہی جہاں تک ہوسکے گذشتہ تقصیر و کوتاہی کا تدارک کرے جب ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں کے متعلق توبہ کا یہ ثمرہ پیدا ہو جائے گا تو گویا توبہ کا وہ کمال حاصل ہو گیا جس کا نام توبہ کی انتہا ہے۔

ضرورتِ توبہ

توبہ کے معنی اور حقیقت سمجھنے کے بعد یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ توبہ ہر شخص پر واجب ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ تمام مسلمانوں کو مخاطب بنا کر فرماتے ہیں "یَآاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا" یعنی اے ایمان والو اللہ تعالیٰ کی طرف خالص توبہ کرو، (سورۃ التّحریم:8) چونکہ توبہ کی حقیقت یہی ہے کہ گناہوں کو اخروی زندگی کے لئے سُمِ قاتل اور مہلک سمجھے اور ان کے چھوڑنے کا عزم کرلے اور اتنا مضمون ایمان کا جز ہے اس لئے ہر مومن پر اس کا واجب اور ضروری ہونا تو ظاہر ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِہٖ وَأَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰہَ یَتُوْبُ عَلَیْہِ" پھر جس نے اپنے ظلم کے بعد توبہ کی

اور اصلاح کرلی تو اللہ اس کی توبہ قبول کر لے گا، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (المائدۃ:39) مطلب اس آیت کریمہ کا یہ ہے کہ جو شخص قاعدہ شریعت کے موافق اپنی اس زیادتی یعنی گناہ کرنے کے بعد توبہ کرے اور آئندہ کے لئے اعمال کی درستی رکھے، یعنی تمام برائیوں کو چھوڑ دے، شریعت کے مطابق کام کرے اور اپنی توبہ پر قائم رہے تو بے شک اللہ تعالیٰ اس کے حال پر رحم کے ساتھ توجہ فرمائیں گے کہ توبہ سے پچھلے گناہ معاف فرما دیں گے اور توبہ پر استقامت عطا فرما کر مزید اعانت فرما دیں گے۔

ترمذی شریف کی ایک حدیث شریف کا حصہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے "اے آدم کے بیٹے! جب تک تو مجھ سے دعائیں کرتا رہے گا اور مجھ سے اپنی امیدیں اور توقعات وابستہ رکھے گا میں تجھے بخشتا رہوں گا، چاہے تیرے گناہ کسی بھی درجے پر پہنچے ہوئے ہوں، مجھے کسی بات کی پرواہ و ڈر نہیں ہے، اے آدم کے بیٹے! اگر تیرے گناہ آسمان کو چھونے لگیں پھر تو مجھ سے مغفرت طلب کرنے لگے تو میں تجھے بخش دوں گا اور مجھے کسی بات کی پرواہ نہ ہو گی۔ اے آدم کے بیٹے! اگر تو زمین برابر بھی گناہ کر بیٹھے اور پھر مجھ سے (مغفرت طلب کرنے کے لیے) ملے لیکن میرے ساتھ کسی طرح کا شرک نہ کیا ہو تو میں تیرے پاس اس کے برابر مغفرت لے کر آؤں گا اور تجھے بخش دوں گا" نیز دوسری حدیث میں ہے "اَلتَّآئِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ" (ابنِ ماجہ) یعنی گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا وہ شخص جس نے کوئی گناہ کیا ہی نہ ہو۔ نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اِنِّی لَأَسْتَغْفِرُاللّٰهَ فِیْ كُلِّ یَوْمٍ سَبْعِیْنَ مَرَّةً" (عمل الیوم والیلة لابن السني:367) یعنی بے شک میں ہر روز ستر دفعہ استغفار کرتا ہوں۔ عصمتِ انبیاء یعنی انبیاء علیہم السلام کا گناہوں سے پاک ہونا ایک مسلّم مسئلہ ہے۔ پھر بھی آپ استغفار فرما رہے ہیں۔ یہ انبیاء علیہم السلام اور اکابرین کی حالت ہے تو ہم پھر کس شمار میں ہیں۔ اس کی پرواہ نہ کریں کہ توبہ ٹوٹ جائے گی۔ جب توبہ ٹوٹ جائے تو دوبارہ توبہ کر لے مگر شرط یہ ہے کہ توبہ دل سے ہو یعنی توبہ کے وقت یہ عزم پختہ ہو کہ اب یہ گناہ نہیں

کروں گا۔ اس طرح توبہ کر کے اگر سو مرتبہ بھی توبہ ٹوٹے تو کچھ پرواہ نہیں۔ ہر دفعہ پھر توبہ کرتے رہیں۔ خدا تعالیٰ کے مقبول اور اہلِ طاعت میں شمار ہونگے۔

باز آ اے بندے میرے باز آ — شرک و کفر و ہر گناہ سے باز آ
میرے در پر کوئی مایوسی نہیں — بار بار توبہ بھی توڑے باز آ

حق تعالیٰ کی وسعتِ رحمت ہے کہ ہر حالت میں اجازت دے دی کہ ہم سے باتیں کر لو ہمارا نام لے لو، ہر حالت میں سماعت ہوگی۔

توبہ کا طریقہ

گذشتہ گناہوں پر ندامت اور معذرت ظاہر کرے۔ جو حقوق العباد واجب الادا ہیں فی الحال ان کے ادا کا عزم کرے اور پھر ان کے ادا کا اہتمام کرے یا اہلِ حقوق سے معاف کرائے۔ اگر پھر گناہ صادر ہو جائے تو فوراً دو رکعت نماز توبہ کی نیت سے پڑھ کر پھر توبہ کرے، زبان سے بھی توبہ کرے اور رونے کی شکل بنا کر خدا تعالیٰ سے خوب معافی مانگے۔ توبہ کے لئے تو گناہوں کو یاد کرے، اس کے بعد جی بھر کے توبہ کرے مگر ان کو بلاوجہ بار بار یاد نہ کرے کہ اس سے بندہ اور خدا تعالیٰ کے درمیان ایک حجاب سا معلوم ہونے لگتا ہے، جو محبت اور ترقی سے مانع ہے، جس کا اثر یہ ہوگا کہ وہاں سے بھی عطا میں کمی ہوگی کیونکہ جزا اور ثمرات کا ترتب عمل پر ہوتا ہے۔ سچی توبہ کے بعد اگر از خود پرانے گناہ یاد آ جائیں تو پھر تجدیدِ توبہ کر کے کام میں لگ جائے اس سے زیادہ کاوش کرنا غلو ہے۔ نیز استغفار اور توبہ کے وقت معاصی کے تذکرے اور استحضار میں ایک قسم کا توسط ہونا چاہیئے یہ ضروری نہیں کہ سب گناہوں کی پوری فہرست پڑھنے بیٹھ جائے۔ صرف اجمالی طور پر سب گناہوں سے توبہ کر لے۔ ہر گناہ کا نام لینا ضروری نہیں۔

حدیث میں ہے "اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي مَا قَدَّمْتُ وَمَا أَخَّرْتُ وَمَا أَسْرَرْتُ وَمَا أَعْلَنْتُ وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّي " (متفق عليه:البخاري، كتاب الدعوات، باب قول النبي ﷺ برقم 6398) جس میں یہ ہے کہ اور اس گناہ سے بھی توبہ کرتا ہوں جس

کو آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں اور فرمایا رسول اللہ ﷺ نے "وَأَتُوْبُ إِلَيْهِ مِنَ الذَّنْبِ الَّذِيْ أَعْلَمُ وَمِنَ الذَّنْبِ الَّذِيْ لآ أَعْلَمُ" (پانچواں کلمہ) اور اس کی طرف اس گناہ سے توبہ کرتا ہوں جس کو میں جانتا ہوں اور اس گناہ سے بھی جس کو میں نہیں جانتا۔ اس سے بھی یہی بات نکلتی ہے کہ اس میں سب گناہ آگئے اگرچہ یاد نہ آئیں، کیونکہ اس سوچ میں وقت ضائع کرنا مطالعہ محبوب سے غافل ہونا ہے۔ البتہ جو از خود یاد آ جائیں ان سے بالخصوص توبہ کریں، خوامخواہ کرید کرید کر تلاش کرنا یہ خود ایک ایسا مشغلہ ہے جو حضور سے مانع ہے۔ بس سب گناہوں سے توبہ کر کے اپنے کاموں میں لگیں، کیونکہ مقصود بالذات خدا تعالیٰ کی یاد ہے، نہ کہ گناہوں کی یاد اور نہ ہی طاعت کی یاد مقصود ہے۔ گناہوں کی یاد سے توبہ مقصود ہے جب وہ حاصل ہے تو پھر قصداً گناہ کو یاد کر کے اس کی یاد کو مقصود بالذات نہ بنائیں اور اگر یاد آ جائے تو پھر توبہ و استغفار کر لیں، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ مصیبت خودبخود یاد آ جائے تو "اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" ہم تو اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ (البقرة:156) پڑھ لیں کہ اس وقت "اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن" پڑھنے کا وہی ثواب ہو گا جو عین مصیبت کے وقت پڑھنے کا ثواب تھا۔ شیخ اکبر کا قول ہے کہ معصیت کی یاد کو مقصود بالذات نہ بنائیں، کیونکہ اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ مجھ سے ناراض ہیں اور یہ خیال خطرناک ہے۔

توبہ کا محرک

قرآن و حدیث میں جو وعید گناہوں پر آئی ہے ان کو یاد کرے اور سوچے کہ ایک دن اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے گناہوں کا حساب دینا ہو گا نیز اللہ تعالیٰ کے جو ہمارے اوپر احسانات ہیں اور جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں ان کو یاد کر کے سوچے کہ ہم کتنے کمینے ہیں کہ ایسے رب کو جو ہمیں ہمارے فائدے کیلئے گناہوں سے روکتا ہے اور ہم ہر حالت میں اس کے محتاج ہیں اس کو تو ناراض

کرتے ہیں اور اپنے دشمن جس نے ہماری دشمنی میں اپنا سب کچھ کھویا ہے یعنی شیطان اس کی بات مانتے ہیں۔ اس سے گناہ پر دل میں سوزش اور ندامت پیدا ہوگی، یہی توبہ ہے۔

1.1.2.4... محبت

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ" اور اللہ تعالیٰ ان کو چاہتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کو چاہتے ہیں۔ (المائدۃ:54) نیز ارشاد ہے کہ "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا أَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ" یعنی جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ تعالیٰ سے محبت میں بہت مضبوط ہیں۔ (البقرۃ:165) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ أَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ وَمَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللّٰهِ كَرِهَ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ" (متفق علیہ) یعنی جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو پسند کرتا ہے۔ اور جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے۔

حقیقتِ محبت

طبیعت کا ایسی چیز کی طرف مائل ہونا جس سے لذّت حاصل ہو محبت کہتے ہیں، یہی میلان اگر قوی ہو جاتا ہے تو اس کو عشق کہتے ہیں۔

تشریح

محبت کی دو قسمیں ہیں۔ محبتِ طبعی اور محبتِ عقلی۔ محبتِ طبعی اختیاری نہیں ہے، اس کا ہو جانا اور اسکی بقا بالکل غیر اختیاری ہے اور غیر اختیاری کام بعض اوقات پائدار نہیں ہوتا لہٰذا محبتِ طبعی مامور بہ نہیں ہے جبکہ محبتِ عقلی کا حاصل کرنا اور اس کی بقا اختیاری ہے تو یہ پائدار بھی ہوتی ہے، اس لئے محبتِ عقلی مامور بہ ہے اور یہی افضل اور راجح ہے، چونکہ محبتِ طبعی کا منشا جوشِ طبیعت ہے اور جوش ہمیشہ نہیں رہا کرتا۔

اسبابِ محبت

محبت کے تین سبب ہوا کرتے ہیں۔ یا تو یہ کہ کوئی ہم پر احسان کرتا ہو اور اس کے احسان کی وجہ سے ہمیں اس سے محبت ہو یا کہ وہ نہایت حسین و جمیل ہو اور اس کے حسن و جمال کی وجہ سے اس کی طرف دل کا میلان ہو یا اس میں کوئی کمال پایا جاتا ہو اور وہ کمال باعثِ محبت ہو۔

سو انعام و نوال و حسن و جمال و فضل و کمال علی وجہ الکمال خدا تعالیٰ ہی میں پائے جاتے ہیں۔ تو جب تک یہ کمالات باقی ہیں اس وقت تک محبت بھی رہے گی اور محبوبِ حقیقی کے کمالات ختم نہیں ہو سکتے اور ان کی محبت بھی ختم نہ ہوگی اور چونکہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی میں بھی بالذات کمالات نہیں اس لئے کاملین کو خدا تعالیٰ کے سوا کسی سے محبتِ عقلی نہیں ہو سکتی، ہاں حبِ طبعی یعنی عشق غیر خدا سے بھی ہو سکتا ہے اور خدا تعالیٰ کے ساتھ جس محبت کا امر ہے وہ حبِ عقلی ہے نہ کہ طبعی۔ اس کے لئے نصوص میں حبِ طبعی یعنی عشق کا عنوان کہیں مذکور نہیں۔ بلکہ جا بجا حب کا ذکر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حبِ طبعی مطلوب نہیں بلکہ حبِ عقلی مطلوب ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ حبِ عقلی والوں یعنی کاملین میں حبِ طبعی نہیں ہوتی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ غلبہ حبِ عقلی کو ہوتا ہے، باقی جن پر حبِ عقلی کا غلبہ ہوتا ہے بعض اوقات ان میں محبتِ طبعی بھی ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے جن پر محبتِ طبعی کا غلبہ ہے مگر وہاں محبتِ طبعی پر حبِ عقلی غالب ہوتی ہے اسلئے جوش دبا رہتا ہے لیکن گاہے گاہے کاملین پر بھی حبِ طبعی کا غلبہ ہوتا ہے۔

بہر حال کاملین حبِ طبعی اور حبِ عقلی دونوں کے جامع ہوتے ہیں مگر ان میں غلبہ حبِ عقلی کو ہوتا ہے اور ناقصین میں حبِ طبعی کا غلبہ ہوتا ہے۔ یہ کمال گو مطلوب نہیں مگر محمود ضرور ہے اور جو دونوں سے کورا ہے وہ خطرہ میں ہے، پس محبت کا ہونا ضروری ہے۔ بغیر محبت کے صرف طاعات و عبادات کافی نہیں کیونکہ ان کا بھروسا کچھ نہیں۔

خدا کی محبت کو حاصل کرنے کا طریقہ

اللہ تعالیٰ کے کمالات و اوصاف و انعامات کو یاد کرے اور سوچے۔ احکام شرعیہ کی بجا آوری کرے اور کثرتِ ذکر اللہ سے غیر اللہ کی محبت دل سے نکال کر اللہ کی محبت کو دل میں داخل کرے۔ اتباعِ سنت اللہ تعالیٰ کی محبت بلکہ محبوبیت کا باعث ہوتی ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ" کہہ دو اگر تم اللہ کی محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو تاکہ تم سے اللہ محبت کرے۔ (آلِ عمران:31) اس میں ان لوگوں کے لئے جو اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنا چاہتے ہیں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ وہ اتباعِ سنت کریں تو ان کو محبوب بنا دیا جائے گا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ فرمایا کہ میں آپ کو کامیابی کا طریقہ بتا دوں۔ لوگوں نے کہا ضرور تو حضرت نے فرمایا کہ محبت کی پڑیا کھا لو لوگوں نے پوچھا محبت کی پڑیا کہاں سے ملے گی۔ حضرت نے فرمایا محبت کی دکانوں سے۔ قصہ مختصر حضرت کا مطلب یہ تھا کہ محبت پر کامیابی کا اصل مدار ہے جس کا حصول اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کے در پر ہوتا ہے پس اہل اللہ کے ساتھ تعلق جوڑنے سے یہ نعمت حاصل ہوسکتی ہے۔ محبت ایک طاقت ہے۔ محبت ہی عمل میں قوت پیدا کرتی ہے۔ سلوک میں اعمال اور محبت کو جمع کیا جاتا ہے تو اس سے کامیابی ہوتی ہے مثلاً ایک ریل گاڑی کے پہیے ہیں اور لائن پر کھڑی ہے لیکن انجن میں بھاپ نہیں تو اس انجن کو صرف دھکے کے ذریعے کہاں تک چلایا جاسکتا ہے اس میں لائن شریعت کی مثال ہے اور پہیے دوسرے ذرائع ہیں اور بھاپ محبت کی طرح ہے پس اگر محبت ہو تو دوسرے ذرائع راستہ کو طے کرنے میں کافی مدد دیں گے۔ اس صورت میں گاڑی اگر لائن پر ہو تو مسافت بہت جلد قطع ہوگی اور اگر لائن پر نہ ہو تو زبردست تباہی کا ذریعہ بنے گی پس اگر محبت ہو اور شریعت کا پاس نہ ہو تو انسان گمراہ ہو کر نصاریٰ کی طرح گمراہیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ختم ہوسکتا ہے۔ محبت قاطع وساوس ہے۔ محبت میں انسان محبوب میں فنا ہو جاتا ہے اس لئے اس کو اپنا ہوش ہی نہیں ہوتا۔ اس

کو صرف اس سے سروکار ہوتا ہے کہ میرا محبوب مجھ سے خوش ہے یا نہیں پس وہ اپنے محبوب کو خوش رکھنے میں اتنا مگن ہوتا ہے کہ اس کو راستے کی مشکلات پریشان نہیں کر سکتیں۔

محبت کو حاصل کرنے کا طریقہ

محبتِ طبعی کا حاصل ہونا غیر اختیاری ہے اور محبتِ عقلی کا حاصل کرنا اختیاری ہے۔ اس لئے محبتِ عقلی کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ غیر اختیاری چیزوں کے درپے ہونے سے پریشانی کے علاوہ اور کچھ نہیں حاصل ہوتا پھر جب محبتِ عقلی ہو جائے تو یہ بعض اوقات محبتِ طبعی میں بھی بدل جاتی ہے یا اس کی شدت اتنی ہوتی ہے کہ اس پر محبتِ طبعی کا گمان ہونے لگتا ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشادِ مبارک ہے کہ محبتِ طبعی میں سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن اس میں انتظام نہیں ہوتا۔ بعض حضرات سے جب محبت میں ایسے کام ہوجاتے ہیں کہ شریعت جن کی عام حالات میں اجازت نہیں دیتی اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ اس صورت میں ایمان کی محافظت ہو اور عقائد پر زد نہ پڑتی ہو تو بعض اُمور میں ایسے لوگوں کو معذور سمجھ کر ان سے صرفِ نظر کرنے کا حکم دیا جاتا ہے کہ نہ تو دین پر حرف آئے نہ بزرگوں سے بدگمانی ہو۔ محبتِ عقلی کو حاصل کرنے کا طریقہ اہلِ محبت کی مجالس میں شرکت اور ان کی عدم موجودگی میں ان کے واقعات کا مطالعہ یا سننا، علاجی ذکر، شغل اور مراقبہ کا کرنا ہے۔ اس سے دل سے دنیا کی محبت نکل جاتی ہے اور خدا کی محبت آجاتی ہے۔ یہ تصور کرنا کہ خدا مجھ سے محبت کر رہا ہے اور اس کے ساتھ اللہ کا ذکر کرنا اس کے لئے بہت مفید ہے۔ اعمال میں جو راحت کی جائز صورت ہو اس کو اختیار کرنا بھی اس کے لئے ذریعہ ہے۔ شریعت کا علم حاصل کرنا سالک کے لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر محبت میں خطرات بہت ہیں۔

درکفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہوسنا کے نداند جام و سندان باختن

ایک ہاتھ جامِ شریعت ایک ہاتھ سندانِ عشق
جام و سندان ساتھ ہوں دونوں ہر کسی کا منہ نہیں

1.1.2.5... شوق

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے "مَن كَانَ يَرۡجُوۡا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ أَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ" یعنی جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا امیدوار ہے تو وہ جان لے اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ ساعت (یعنی موت) تو آنے والی ہے۔ (العَنكبوت:5) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "أَسۡأَلُكَ لَذَّةَ النَّظَرِ اِلٰى وَجۡهِكَ، وَالشَّوۡقَ اِلٰى لِقَاۗئِكَ" (رواه النسائي) یعنی تجھ سے تیرے رخ مبارک کی زیارت اور تیری ملاقات کا شوق مانگتا ہوں۔

حقیقتِ شوق

کسی محبوب چیز کو حاصل کرنے یا کسی محبوب کا قرب حاصل کرنے کے لئے دل کا بے قرار ہونا شوق کہلاتا ہے۔ شوق ایک جذبہ ہے اور اس میں ایک کیفیت مغلوبیت کی ہوتی ہے۔

تشریح

ابتداء میں محبت شوق کے رنگ میں ہوتی ہے اور بعد میں انس کا رنگ غالب ہوتا ہے اس وقت وہ کیفیتیں نہیں رہتیں جو شوق کے وقت ہوا کرتی ہیں۔ مثلاً بات بات پر رونا اور استغراق کا غلبہ ہونا وغیرہ مگر لوگ انہی آثار کو مقصود سمجھتے ہیں اور انس کی حالت میں جب یہ آثار کم ہو جاتے ہیں۔ تو پریشانی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ مقصود نہیں کہ ہر وقت شوق غالب رہے اور تقاضائے طبعی مرغوباتِ نفسانیہ کا کبھی نہ ہو۔ نہ یہ مقصود ہے کہ دل میں حرکت پیدا ہو جائے۔ آنحضرت ﷺ نے شوق کی ایک حد بیان فرمائی ہے۔ "أَسۡئَلُكَ الشَّوۡقَ اِلٰى لِقَاۗئِكَ فِيۡ غَيۡرِ ضَرَّاءَ مُضِرَّةٍ، وَفِتۡنَةٍ مُضِلَّةٍ" (رواه الإمام أحمد في مسنده وابن حبان والحاكم في صحيحيهما) یعنی اے اللہ! میں آپ سے آپ کی ملاقات کا شوق

بغیر کسی تنگی میں پڑنے کے جو نقصان دینے والی ہو اور بغیر کسی گمراہ کن آزمائش میں مبتلا ہونے کے طلب کرتا ہوں۔ چونکہ شوق اور عشق کا غلبہ کبھی ہلاکت اور مضرت کا باعث بھی بن سکتا ہے جس سے اعمال میں خلل پڑتا ہے اور اصل مقصود اور ذرائع قربِ اعمال اور احکامات کی پابندی ہے اور کبھی غلبہ شوق میں آدمی ادب کا پاس نہیں رکھتا اور بے ادبی کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ جیسا کہ اکثر عشاق غلبۂ حال میں کرتے ہیں اور یہ بے ادبی دین کے نقصان کی وجہ بن سکتی ہے گو غلبہ کی حالت میں معاف ہے مگر کمال نہیں اور آنحضرت ﷺ ادب، اطاعت اور محبت کے جامع ہیں اسلئے یہ مذکورہ بالا دعا فرمائی ہے۔

شوق حاصل کرنے کا طریقہ

محبت الٰہی کے ساتھ شوق خودبخود پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ محبت کے لئے شوق لازم ہے۔

1.1.2.6... اُنس

جب آدمی کا دل کسی چیز کے ساتھ اس طرح وابستہ ہو جاتا ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے تو اسکا تعلق اتنا محسوس نہیں ہوتا لیکن جب وہ نہیں ہوتا تو اس کی جدائی برداشت نہیں ہوتی تو کہتے ہیں کہ اس آدمی کو اس چیز کے ساتھ انس ہوگیا۔ شوق کیساتھ عاشق پر جب حقائق کا انکشاف ہوتا ہے اور محبوب کی پسند و ناپسند کا اندازہ ہو جاتا ہے تو شوق مبدل بہ انس ہو جاتا ہے جو شوق کی طرح ظاہر تو نہیں ہوتا لیکن دیرپا اور مؤثر ہوتا ہے۔ اس وقت عاشق اپنی محبت کا حق ایک طریقے سے ادا کر رہا ہوتا ہے لیکن نیا عاشق اس کو عشق سے خالی سمجھتا ہے مثلاً صاحبِ شوق تو محبوب کے لئے جان دے دے گا لیکن جو محبوب کو مطلوب ہے ضروری نہیں کہ وہ یہ کر گزرے جب کہ صاحبِ انس محبوب کے لئے اپنی جان کی حفاظت بھی کرے گا اور جان کو اس کے لئے استعمال بھی کرے گا۔

اُنس حاصل کرنے کا طریقہ

صاحبِ شوق اگر شیخ کامل کے ہاتھوں میں ہے تو اس کے احکامات پر بے چون و چرا عمل کرے کہ جس کی برکت سے یہ نعمت ملی ہے وہ میرا خیر خواہ ہے۔ شدہ شدہ شوق مبدل بہ انس ہو جائے گا یعنی دل محبوب کے ساتھ مانوس ہو جائے گا۔ چونکہ یہ بھی آثارِ محبت میں سے ہے اس لئے اس کی تحصیل کے لئے کوئی جداگانہ طریقہ نہیں ہے محبت کے ساتھ ہی حاصل ہو جاتا ہے۔

1.1.2.7... خوف

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ "وَاخْشَوْنِيْ" اور مجھ سے ڈرو (البقرة:150) اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے "مَنْ خَافَ أَدْلَجَ وَمَنْ أَدْلَجَ بَلَغَ الْمَنْزِلَ أَلاَ إِنَّ سِلْعَةَ اللهِ غَالِيَةٌ أَلاَ إِنَّ سِلْعَةَ اللهِ الْجَنَّةُ" (رواه الترمذي) یعنی جو ڈرتا ہے وہ منہ اندھیرے چلتا ہے اور جو منہ اندھیرے چلتا ہے وہ منزل پر پہنچ جاتا ہے سن لو اللہ تعالیٰ کا سودا مہنگا ہے سن لو اللہ تعالیٰ کا سودا جنت ہے۔

حقیقتِ خوف

ناگوار طبع چیز کے خیال اور اس کے واقع ہونے کے اندیشے سے قلب کا ڈرنا۔

تشریح

یہ احتمال کہ کہیں مجھے عذاب نہ ہو جائے خوف کی حقیقت ہے اور یہ احتمال مسلمانوں میں ہر شخص کو ہے اور یہی مامور بہ ہے۔ اور اسی کا بندہ مکلف کیا گیا ہے۔ یہ تو شرطِ ایمان ہے اور اس کا نام خوفِ عقلی ہے کہ تقاضائے معصیت کے وقت وعید اور عذابِ خداوندی کو یاد کر کے سوچ سوچ کے گناہوں سے بچا جائے۔ یہ درجہ فرض ہے اور اس کے نہ ہونے سے گناہ ہو گا۔ اور یہی حق تعالیٰ کا خوف جملہ نیک کاموں میں رغبت کرنے اور تمام گناہوں سے بچنے کا ذریعہ ہے

خوف کرنے والوں کی شان میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت، رحمت، علم اور رضا کی محمود خصلتیں جمع فرمائی ہیں جو شخص خدا سے ڈرتا ہے اس سے ہر چیز ڈرنے لگتی ہے۔
رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: "دو آنکھوں کو جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی: ایک وہ آنکھ جو اللہ کے ڈر سے تر ہوئی ہو اور ایک وہ آنکھ جس نے راہ جہاد میں پہرہ دیتے ہوئے رات گزاری ہو" (ترمذی)۔ مشکوٰۃ شریف کی ایک حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر دوزخ کی آگ حرام کر دیتا ہے۔ ترمذی شریف میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ ایک نوجوان کے پاس آئے اور وہ سکرات کے عالم میں تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "تم اپنے کو کیسا پا رہے ہو؟" اس نے عرض کیا: اللہ کی قسم، اللہ کے رسول! مجھے اللہ سے امید ہے اور اپنے گناہوں سے ڈر بھی رہا ہوں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "یہ دونوں چیزیں اس جیسے وقت میں جس بندے کے دل میں جمع ہو جاتی ہیں تو اللہ اسے وہ چیز عطا کر دیتا ہے جس کی وہ اس سے امید رکھتا ہے اور اسے اس چیز سے محفوظ رکھتا ہے جس سے وہ ڈر رہا ہوتا ہے۔ الغرض خشیت مؤمن کے لئے لازم ہے اور اس کی دو وجہ ہیں مآل میں احتمال کہ شاید کوئی اختیاری کوتاہی ہو جائے دوسرے یہ کہ شاید کوئی اختیاری کوتاہی فی الحال ہوگئی ہو جس کا علم بھی التفات سے ہو سکتا تھا اور التفات میں کوتاہی ہوئی کہ یہ بھی اختیاری ہے دیکھو ڈاکو سزا کے خوف سے ڈاکہ نہیں ڈالتا، بچہ پٹنے کے خوف سے شرارت سے رکتا ہے۔ جرمانے کے خوف سے لوگ جرائم سے باز رہتے ہیں آدمی سبکی کے خوف سے محفل میں تہذیب سے بیٹھتا ہے۔ خوف ہی تو اٹھ جاتا ہے جو ملک میں امن نہیں رہتا گویا کہ خوف جملہ برائیوں کی جڑ کاٹنے والا اور خوف ہی جملہ طاعات کا ذریعہ ہے۔
ایک خوف یہ بھی ہے کہ عاشق اپنے محبوب کے ناراض ہونے سے ڈرتا ہے اس لئے اپنے آپ کو ہر وقت خطرے میں محسوس کرتا ہے۔ جن کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ہو ان کا ڈر سب سے زیادہ سخت ہوتا ہے کیونکہ وہ اس سے ڈرتے ہیں کہ کہیں اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض نہ ہو جائے۔ خدا کا خوف اس طرح نہیں ہوتا جیسا سانپ بچھو سے ہوتا ہے۔ ان سے تو طبعی خوف ہوتا ہے۔ اس کے برعکس

اللہ تعالیٰ کا خوف عقلی خوف ہے جو انبیاء علیہم السلام کو سب سے زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ بخاری شریف کی ایک روایت میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے تم سب سے زیادہ ڈرنے والا ہوں۔ دنیا میں جن چیزوں سے ہم ڈرتے ہیں وہ نہ صرف طبعی ہوتی ہیں بلکہ ان سے رحم کی امید بھی نہیں ہوتی اس لئے یہ ڈر زیادہ محسوس ہوتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ سے رحمت کی امید بھی ہوتی ہے اس لئے یہ خوف زیادہ محسوس نہیں ہوتا لیکن وقت پر اس کا پتا چلتا ہے۔

خوف حاصل کرنے کا طریقہ

اللہ تعالیٰ کے قہر و عذاب کو یاد کیا کرے اور سوچا کرے۔ قرآن و حدیث میں آخرت کے جو عذاب بیان کئے گئے ہیں ان کے بارے میں سوچا جائے کہ کہیں شامتِ اعمال سے میں ان عذابوں کا مستحق ہوا تو پھر کیا ہوگا؟

1.1.2.8... رجا

جس طرح اللہ تعالیٰ کا خوف ضروری ہے کیونکہ وہ مالک ہے کسی بھی وقت گرفت فرما سکتا ہے۔ اس کی رحیمی پر جرأت کرنا حماقت ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ سے عفو کی امید بھی نہیں ٹوٹنی چاہیے کہ وہ رحیم ہے، ستار ہے، غفار ہے اور سب سے بڑھ کر ہمارا رب ہے جس نے ہمیں سب کچھ بغیر ہمارے استحقاق کے عطا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے "لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ" یعنی اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ (الزمر:53) اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔ "لَوْ يَعْلَمُ الكَافِرُ مَا عِنْدَاللهِ مِنَ الرَّحْمَةِ مَا قَنَطَ مِنْ جَنَّتِهٖ أَحَدٌ" (متفق علیہ) یعنی اگر کافر بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کا حال جان لے تو اس کی جنت سے نا امید نہ ہو۔

رجا کی حقیقت

اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا اور اس امید پر عمل کیے جانا کہ اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی سے کوئی بعید نہیں کہ ہمارے ٹوٹے پھوٹے اعمال کو قبول

فرما لیں۔ جس طرح شیطان انسان کو اللہ تعالیٰ سے غافل کر کے اور بے خوف کر کے جہنم کا مستحق بنانے کی کوشش کرتا ہے اسی طرح اس کی یہ بھی کوشش ہوتی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو کر عمل چھوڑ دے۔ اگر غور کیا جائے تو بے خوفی اور مایوسی دونوں انسان کو عمل سے محروم کر دیتی ہیں۔ حضرت وحشی رضی اللہ عنہ جب مسلمان نہیں ہوئے تھے تو ان کو جب حالتِ کفر کے اپنے ظلم یاد آتے تھے تو اس کی وجہ سے اپنی مغفرت سے مایوس ہوگئے تھے۔ ان کی تسلی کے لئے قرآن میں یہ آیت اتری "لَا تَقْنَطُواْ مِن رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا" یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ (جب چاہیں) تو تمام گناہوں کو بخش دیتے ہیں۔

اس سے ہمت پا کر حضرت وحشی رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے اور صحابیت کا شرف پایا۔ اس لئے اگر اپنے گناہوں کے خیال سے مایوسی طاری ہونے لگے تو اس آیت کو سامنے رکھ کر اللہ تعالیٰ سے رحمت کی امید کرنی چاہیے اور عمل کی کوشش کرنی چاہیے نہ کہ رحمت کی باتیں کر کے اللہ تعالیٰ سے بے خوف ہو جائے۔ ایمان خوف اور رجا کے درمیان ہے یعنی ان دونوں میں اعتدال ہونا چاہیے۔ اس اعتدال سے کسی طرف بھی جھکاؤ خطرے سے خالی نہیں۔ عارفین فرماتے ہیں کہ جوانی میں خوف غالب ہونا چاہیے اور بڑھاپے میں رجا۔ جو شخص رحمت اور جنت کا منتظر رہے اور اس کے حاصل کرنے کے اسباب یعنی عملِ صالح توبہ وغیرہ کو اختیار نہ کرے اس کو مقام رجا حاصل نہیں وہ دھوکے میں ہے جیسا کہ کوئی شخص تخم پاشی نہ کرے اور غلہ پیدا ہونے کا منتظر رہے کہ یہ محض ہوسِ خام ہے۔

رجا حاصل کرنے کا طریقہ

اللہ تعالیٰ کی وسعتِ رحمت و عنایات کو یاد کرے اور سوچا کرے۔ رحمت کی آیتوں میں غور کرے لیکن عمل میں اختیاری سستی نہ کرے۔ دین میں رخصتوں کا علم حاصل کر کے بوقت ضرورت ان سے کام لے۔

1.1.2.9... زُہد

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتَاكُمْ" تاکہ فوت شدہ چیز پر افسوس نہ کرو اور جو تم کو دیا ہے اس پر خوشی سے اترا نہ جاؤ۔ (الحدید:23) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "اَوّلُ صَلَاحِ هٰذِهِ الْأُمَّةِ الْيَقِيْنُ وَالزُّهْدُ وَأَوَّلُ فَسَادِهَا الْبُخْلُ وَالْأَمَلُ" (رواه البيهقي في شعب الايمان) یعنی اول بہتری اس امت کی یقین اور زہد ہے اور اول بگاڑ اس امت کا بخل اور طولِ امل ہے۔

زُہد کی حقیقت

آخرت کی نعمتوں کو سامنے رکھ کر اس دنیا میں تھوڑے پر قناعت کرنا زہد کی حقیقت ہے۔

تشریح

زہد اصل میں دل کی آنکھوں سے آخرت کی نعمتوں کا دیکھنا ہے جو ایک عظیم نعمت ہے جس کاذریعہ وہ نور اور علم ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قلب میں ڈالا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے سینہ کھل جاتا ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا کا ساز و سامان مکھی کے پر سے بھی زیادہ حقیر ہے اور آخرت ہی بہتر اور پائدار ہے۔ جس وقت یہ نور حاصل ہو جاتا ہے تو اس حقیر دنیا کی آخرت کے مقابلے میں اتنی بھی وقعت نہیں رہتی جتنی کہ بیش قیمت جواہر کے مقابلے میں پھٹے پرانے چیتھڑے کی ہوا کرتی ہے۔ اور زہد کا ثمرہ یہ ہے کہ بقدر ضرورت و کفایت دنیا پر قناعت حاصل ہو جائے پس زاہد اتنی مقدار پر کفایت کیا کرتا ہے جتنا کہ مسافر کو سفر کا توشہ اپنے پاس رکھنا ضروری ہوتا ہے نیز زہد ترکِ لذّات کا نام نہیں بلکہ محض تقلیلِ لذّات زہد کے لئے کافی ہے یعنی لذّات میں انہماک نہ ہو، نفیس نفیس کھانوں اور کپڑوں کی فکر میں رہنا زہد کے منافی ہے ورنہ بلاتکلف و بِلا اہتمامِ خاص کے لذّات میسر ہو جائیں تو حق تعالیٰ کی نعمت ہیں، شکر کرنا

چاہئے۔ نفس کو خوب آرام سے رکھے اور اس سے کام بھی لے کہ

مزدور کو خوش رکھنا کہ کام اس سے ہے لینا

حقیقت یہ ہے کہ جن کی نظر اللہ پر ہوتی ہے ان کی نظر میں سونا چاندی تو کیا دنیا و مافیھا بھی کچھ نہیں۔ حضور ﷺ نے اپنے اور اپنے جگر گوشوں اور خاص لوگوں کے لئے دنیا کو پسند نہیں فرمایا لہٰذا مخلوق کے ہاتھ میں جو کچھ ہے متاعِ دنیا ہے۔ سب سے امید قطع کر دی جائے۔ جو شخص ایسا کرے گا راحت میں رہے گا کیونکہ زہد سے قلب اور بدن دونوں کو راحت حاصل ہوتی ہے۔

زُہد حاصل کرنے کا طریقہ

دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی دائمی نعمتوں کو اپنے سامنے رکھ کر اس میں غور کرے کہ عقلمندی کیا دنیا کی طلب میں آخرت سے ہاتھ دھونے میں ہے یا دنیا میں جتنا اللہ تعالیٰ دے اس پر قناعت کر کے آخرت کی نعمتوں کو حاصل کرنے کی کوشش میں ہے۔ اس مراقبہ سے اِن شاء اللہ وہ علم اللہ تعالیٰ دل میں القا فرما دے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نصیب فرمائے۔ آمین

1.1.2.10... توکل

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "وَعَلَى اللهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ" اور چاہئے کہ ایمان والے اللہ ہی پر توکل کریں۔ (التوبة: 51) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "وَاِذَا سَئَلْتَ فاسْئَلِ اللهَ وَاِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللهِ" (رواه الترمذي) جب کچھ مانگو تو اللہ ہی سے مانگو اور جب مدد چاہو تو اللہ تعالیٰ ہی سے مدد چاہو۔ یہ حدیث شریف دیکھی جائے "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" کی تفسیر ہے۔

حقیقتِ توکل

سبب کی بجائے مسبب الاسباب پر نظر رکھنا اور اس سے اپنی امیدیں وابستہ کرنا توکل ہے۔

تشریح

توکل کا مطلب کسی کو بتکلف اپنا وکیل بنانا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس کام کو خود نہیں سمجھ سکتے اس کو دوسروں کے سپرد کر دیا جاتا ہے کہ اس کے بتلانے کے موافق کرتا رہے۔ لہٰذا توکل یہی ہے کہ ضروری تدبیر کر کے نتیجہ دل سے خدا کے سپرد کیا جائے کہ وہی جانتا ہے کہ کس چیز میں ہماری خیر ہے اس کے تین ارکان ہیں:

(1) معرفت

(2) حالت

(3) اعمال

اب ان تینوں کا الگ الگ ذکر کیا جاتا ہے۔

رکن اول معرفت ہے۔ دل پر توحید کا مضمون جب کھل جائے اور اس کے ساتھ دل مانوس ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی صفات کی جب معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو دل غیر اللہ کے تعلق سے ہٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ عارف اپنے دل میں صرف اللہ تعالیٰ کو موثر سمجھتا ہے اور غیراللہ کو غیر موثر۔ توکل اس کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔

دوسرا رکن پہلے رکن کا نتیجہ ہے یعنی سالک اپنا کام خدا کے حوالے کر دیتا ہے اور قلب کو مطمئن رکھتا ہے اور غیر اللہ کی طرف قطعی التفات نہیں کرتا۔ اگر کسی سبب کو اختیار کرتا ہے تو صرف اللہ تعالیٰ کے حکم سے ورنہ خود اس کا دل سبب کو اختیار کرنے کی طرف مائل نہیں ہوتا۔

تیسرا رکن دوسرے رکن کا نتیجہ ہے کہ سالک خدا پر جو مسبب الاسباب ہے، نظر رکھتے ہوئے اس کی مرضی کے مطابق سبب اختیار کرتا ہے لیکن اس سبب کو موثر نہیں سمجھتا بلکہ خدا کے حکم پر اس کی نظر ہوتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کے ارادے کو اپنے ساتھ کرنے کے لئے دعا اور اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرتا ہے۔ سبب سے نہیں بھاگتا بلکہ سبب میں دل کے مشغول ہونے سے بھاگتا ہے۔ جاہلوں کا

خیال ہے کہ توکل تو محنت مزدوری اور کسب کو چھوڑ دینے کا نام ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بے کار بن کر بیٹھ جائے اگر بیمار ہو تو علاج نہ کرائے، بے سوچے سمجھے اپنے آپ کو خطرات اور ہلاکت میں ڈال دیا کرے کہ کہیں آگ میں گھس جائے اور کہیں شیر کے منہ میں ہاتھ دیدے تب متوکل کہلایا جائے۔ حالانکہ یہ خیال بالکل غلط ہے کیونکہ ایسا کرنا شرعاً حرام ہے اور شریعت ہی توکل کی خوبیاں بیان کر رہی ہے پھر بھلا جس بات کو شریعت خود حرام بتلائے اسی کی رغبت و حرص دلائے یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔

حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ایسا توکل تو بچہ بھی کرسکتا ہے کہ کچھ بھی پاس نہ ہو اور کہے کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔ اصل توکل تو وہ ہے کہ بینک بھرے ہوئے ہوں لیکن ان پر نظر نہ ہو۔ نظر اللہ پر ہو اور یہ سمجھے اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو کام بنے گا ورنہ کچھ بھی نہیں ہوسکے گا۔

توکل حاصل کرنے کا طریقہ

اس کی عنایتوں اور وعدوں اور اپنی گذشتہ کامیابیوں کا یاد کرنا اور ان کو سوچنا۔

1.1.2.11... قناعت

حقیقتِ قناعت

لذات کی تحصیل میں مبالغے سے اپنے نفس کو روکنا قناعت کی حقیقت ہے۔ اگر کسی لذت والی چیز کی طرف طبعی میلان ہی نہ ہو تو یہ غیر اختیاری ہے۔ جس کو یہ حاصل ہے وہ امتحان سے بچا ہوا ہے لیکن خود اس پر اجر نہیں۔ لیکن اگر میلان تو ہو لیکن عقلاً اپنے نفس کو یہ سمجھائے کہ یہاں کی چیزیں فانی ہیں۔ ان میں مشغول ہونے سے سوائے پریشان ہونے کے کچھ حاصل نہیں ہو گا اس لئے اپنے نفس کو مجاہدات کے ذریعے تھوڑے پر راضی کیا جائے اس سے جو قناعت حاصل ہو وہ مطلوب اور ماجور ہے۔ چونکہ یہ زہد کا نتیجہ ہے اس کے لئے زہد کے

باب کا مطالعہ کیا جائے۔

1.1.2.12... حِلم

حقیقتِ حلم

یہ غضب کی ضد ہے۔ نفس کا ناگوار بات پر بھڑکنے سے رکنا حِلم کہلاتا ہے۔ جس شخص میں حلم ہوتا ہے وہ حلیم کہلاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت بھی ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری کمزوریوں کے پیشِ نظر ناگوار باتوں سے درگزر فرماتے رہتے ہیں پس حلیم شخص بھی اپنے غصّے پر قابو پاکر اللہ تعالیٰ کے اخلاق کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے جس کا ہمیں حکم بھی ہے۔

حِلم حاصل کرنے کا طریقہ

غصہ کا زائل کرنا اور غصہ کا علاج بار بار سوچنا جو کہ اخلاقِ رذیلہ کے بیان میں ہو چکا ہے۔

1.1.2.13... صبر

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "یٰـاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اصْبِرُوْا" یعنی اے ایمان والو صبر کرو۔ (آلِ عمران:200) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "عَجَبًا لِأَمْرِ المؤمنِ اِنَّ أمْرَہٗ کُلَّہٗ لہٗ خَیرٌ ولیسَ ذلكَ لأحَدٍ اِلا لِلْمُؤْمِنِ اِنْ أَصابَتْہُ سَرَّاءُ شَكَرَ فكانتْ خَیرًا لہٗ واِنْ أَصابتہُ ضَرَّاءُ صبرَ فكانتْ خَیرًا لہٗ" (رواہ مسلم) یعنی مؤمن پر تعجب ہے کہ اس کی ہر بات میں بہتری ہے اور یہ کسی کو میسر نہیں مگر مؤمن ہی کو، اگر اس کو خوشی پہنچے تو شکر کرتا ہے اور اگر اس کو سختی پہنچے تو صبر کرتا ہے اور وہ اس کے لئے خیر بن جاتی ہے۔

حقیقتِ صبر

انسان کے اندر دو قوتیں ہیں ایک دین پر ابھارتی ہے دوسری ہوائے نفسانی

پر۔ سو پہلی قوت کو دوسری قوت پر غالب کرنا صبر ہے۔ اور اس کی حقیقت ہے۔ "حَبْسُ النَّفْسِ عَلٰی مَا تَکْرَہُ" یعنی ناگوار بات پر نفس کو جمانا اور مستقل رکھنا آپے سے باہر نہ ہونا۔

تشریح

صبر کی تین قسمیں ہیں

(1) عمل کی پابندی پر صبر

(2) عمل کرتے وقت صبر

(3) کسی عمل کے نہ کرنے پر صبر

عمل کی پابندی پر صبر یہ ہے کہ نفس کو کسی کام پر روک لینا یعنی اس پر جم جانا اور قائم رہنا۔ مثلاً نماز، زکوٰۃ وغیرہ کی پابندی کرنا اور بلا ناغہ ان کو ادا کرتے رہنا۔

اور عمل کرتے وقت صبر یہ ہے کہ عمل کے وقت نفس کو دوسری طرف التفات کرنے سے روکنا، طاعات بجا لانے کے وقت ان کے ارکان کو مع آداب کے اطمینان سے ادا کرنا اور ہمہ تن متوجہ ہو کر کام کو بجا لانا مثلاً نماز پڑھنے کھڑا ہوئے یا ذکر میں مشغول ہوئے تو نفس کو یہ سمجھا دیا کہ تم اتنی دیر تک سوائے نماز یا ذکر کے اور کوئی کام نہیں کرسکتے پھر دوسرے کاموں کی طرف توجہ کرنا فضول ہے۔ اتنی دیر تک تجھ کو نماز یا ذکر ہی کی طرف متوجہ رہنا چاہئے۔

تیسری قسم کسی عمل کے نہ کرنے پر صبر یہ ہے کہ نفس کو اللہ تعالیٰ کی منع کی ہوئی باتوں سے روکے اور ان سے بچے۔ نیز حالات دو قسم کے ہوتے ہیں۔

نعمت اور مصیبت

نعمت سے مسرت ہوتی ہے اور مسرت کی وجہ سے منعم کے ساتھ محبت ہو جاتی ہے۔ بخلاف مصیبت کے کہ اس میں ناگواری ہوتی ہے اور صبر کا موقع مصیبت ہے اور مصیبت کہتے ہیں اس حالت کو جو نفس کو ناگوار ہو۔ اس کی دو

قسمیں ہیں: ایک صورتِ مصیبت اور دوسری حقیقتِ مصیبت۔ جس سے انقباض و پریشانی بڑھے وہ تو گناہوں کی وجہ سے ہے اور حقیقتِ مصیبت ہے اور جس سے تعلق مع اللہ میں ترقی ہو، تسلیم و رضا زیادہ ہو، وہ حقیقتِ مصیبت نہیں بلکہ صورت مصیبت کی ہے۔ عارفین کو مصیبت کا احساس تو ہوتا ہے بلکہ بوجہ ادراک لطیف ہونے کے دوسروں سے زیادہ احساس ہوتا ہے مگر ان کا رنج و غم حد سے نہیں بڑھتا کیونکہ اس میں ان کی نظر اللہ تعالیٰ پر ہوتی ہے۔ مصائب سے بہت سے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے ابوداود شریف میں ہے کہ بعض دفعہ حق تعالیٰ اپنے بندے کو خاص درجہ اور مرتبہ عطا فرمانا چاہتے ہیں جس کو وہ اپنے عمل سے حاصل نہیں کر سکتا تو اللہ تعالیٰ اس کو کسی مصیبت یا مرض میں مبتلا کر دیتے ہیں جس سے وہ اس درجہ عالیہ کو پا لیتا ہے۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّـآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ" جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ہم تو اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ (البقرة:156) مطلب یہ ہے کہ مصیبت اور غم کے وقت زبان کو اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کے وِرد میں مشغول کیا جائے اور دل کو اس کے معنی کے تصور میں کہ ہم اللہ تعالیٰ ہی کی مِلک ہیں اور مالک کو ہر قسم کے تصرف کا اپنے مملوک میں اختیار ہے، غلام کو چاہئے کہ مالک کے تصرف پر راضی رہے اس لئے اس موقع پر تصرفِ حق پر راضی رہنا چاہئے۔ مصیبت کے وقت اول تو اپنے گناہوں کو یاد کریں تاکہ اپنی خطاؤں کا استحضار ہو کر مصیبت سے پریشان نہ ہوں کیونکہ اپنی خطاؤں پر جو سزا ہوتی ہے اس سے دوسرے کی شکایت نہیں ہوتی بلکہ انسان خود نادم ہوتا ہے کہ میں اس قابل تھا۔ پھر اجر کو یاد کریں کہ اللہ تعالیٰ نے مصیبت کا بہت ثواب رکھا ہے یاد کر کے غم کو ہلکا کریں اور مصیبت میں ثابت قدم رہیں خدا تعالیٰ کی شکایت نہ کریں۔ کوئی بات ایمان اور اسلام کے خلاف دل اور زبان پر نہ لائیں۔ اور یہ نہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض ہو گئے ہیں۔ کیونکہ یہ خیال خطرناک ہے، اس سے تعلق ضعیف ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ زائل ہو جاتا ہے۔ مصائب کو سزا سمجھیں

یا آزمائش سمجھیں اور اس کے ثواب کو یاد کریں۔ شریعت نے مصیبت کے وقت صبر و تحمل کی تعلیم دی ہے۔ اس پر کاربند رہیں اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ ہر مصیبت پر نعم البدل ملتا ہے اس میں نفع ضرور ہوگا۔ آخرت میں بھی اور دنیا میں بھی اگرچہ دنیوی نفع ابھی سمجھ میں نہ آئے۔

صبر کو حاصل کرنے کا طریقہ

خواہشات اور نفسانی جذبات کو ضعیف و کم زور کرنا۔

1.1.2.14... شُکر

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ "وَاشْكُرُوْا لِیْ" اور میرا شکر کرو۔ (البقرۃ:152)
اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "اِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ" (رواہ مسلم) یعنی اگر مؤمن کو خوشی پہنچے تو شکر کرتا ہے۔

شُکر کی حقیقت

نعمت کو منعمِ حقیقی کی طرف سے سمجھنا جس کا اثر منعم سے خوش ہونا اور تعمیلِ حکم میں سرگرمی دکھانا ہے۔

تشریح

نعمت کو منعم حقیقی کی طرف سے سمجھنے سے دو باتیں ضرور پیدا ہوتی ہیں۔ ایک منعم سے خوش ہونا اور دوسرا اس کا ممنون ہو کر اس کی خدمت گزاری اور حکم پر عمل کرنے میں سرگرمی دکھانا۔ یعنی جو حالت طبیعت کے موافق ہو خواہ اختیاری ہو یا غیر اختیاری، اس حالت کو دل سے خدا تعالیٰ کی نعمت سمجھنا اور اس پر خوش ہونا اور اپنی لیاقت سے اس کو زیادہ سمجھنا اور زبان سے خدا تعالیٰ کی تعریف کرنا اور اس نعمت کا جوارح یعنی اعضاء سے گناہوں میں استعمال نہ کرنا بلکہ اس نعمت کو اس کی رضامندی میں استعمال کرنا شکر ہے اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے

جب کہ مخلوق کی پیدائش کے اغراض و مقاصد اور یہ بات معلوم ہو جائے کہ کیا کیا چیز کس کس کام کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ مثلاً آنکھ اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے اس کا شکر یہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی کتاب یعنی قرآن مجید اور علم دین کی کتابوں کو پڑھنے اور آسمان و زمین جیسی بڑی مخلوقات کا اس غرض سے مشاہدہ کرنے میں صرف کرے کہ یا تو عبرت حاصل ہو اور خالق برتر کی عظمت و کبریائی سے آگاہی یا علم حاصل ہو جس سے خالق کی عظمت کا پتا چلے اور وہ جو ہم سے چاہتا ہے وہ معلوم ہو نیز ستر کے دیکھنے اور غیر عورت پر نظر ڈالنے سے اور دیگر ممنوعات سے روکے رکھے۔ اسی طرح کان ایک نعمت ہے اس کا شکر یہ ہے کہ اس کو ذکرِ الٰہی اور ان باتوں کے سننے میں استعمال کرے جو آخرت میں نفع دیں اور ہجو اور لغو اور فضول کلام سننے سے روکے۔

زبان کا یہ شکر ہے کہ اس کو یادِ خدا، حمد و ثناء اور اظہارِ شکر میں مشغول رکھے اور تنگ دستی اور تکلیف میں شکوہ شکایت سے باز رکھے کہ اگر کوئی حال بھی پوچھے تو شکایت کا کلمہ زبان سے نہ نکلنے پائے، کیونکہ شہنشاہ کی شکایت ایسے ذلیل اور بے بس غلام کے سامنے کرنا جو کچھ بھی نہیں کر سکتا بالکل فضول اور معصیت میں داخل ہے۔ اور اگر شکر کا کلمہ نکل گیا تو طاعت میں شمار ہوگا صرف زبانی الحمدللہ کہنا جب کہ دل میں منعم اور نعمت کی قدر نہ ہو محض درجۂ عنوان میں ہے، یہ چھلکا ہے جس میں گری نہیں یعنی محض الفاظِ شکر ہیں، معنی شکر نہیں اور جب معنی شکر نہیں تو اس کی مثال بادام کے نرے چھلکے جیسی ہے جس میں گری نہ ہو کہ محض چھلکے کو بادام نہیں کہیں گے۔

اسی طرح ہر عمل کا مغز اور روح ہے اور ایک پوست اور صورت ہے۔ پس شکر کی روح یہ ہے کہ منعم اور نعمت کی دل سے قدر ہو۔ ابتدائی درجہ شکر تو مرتبۂ عقلی ہے کہ حق تعالیٰ کو منعم حقیقی جانے اور عقلاً اس کی قدر پہچانے اور انتہائی مرتبہ یہ ہے کہ اس کا اثر طبع، جوارح اور حرکات و سکنات میں نمایاں ہو یعنی تمام اعتقادات، عبادات، معاملات، اخلاق و معاشرت وغیرہ شریعت کے مطابق ہوں۔

شُکر حاصل کرنے کا طریقہ

حق تعالیٰ کی نعمتوں کو سوچنا اور یاد کرنا اور ہر نعمت کو اس کی طرف سے جاننا۔ اس سے رفتہ رفتہ حق تعالیٰ کی محبت پیدا ہوگی۔ اور شکر کا درجہ کاملہ نصیب ہو جائے گا۔ زبان سے بھی شکر کے کلمات اس طرح کہنا کہ دل اس کے ساتھ ہو۔ کہتے ہیں کہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا پس جب انسان غور و فکر اور مجاہدے سے جب اپنی حقیقت جان لے کہ میں کتنا کمزور ہوں کتنا بے حقیقت ہوں۔ میرے سارے جوارح، صلاحیتیں، اوقات اور سب کچھ اللہ تعالیٰ کی دَین ہے تو پھر جب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر نظر ہوتی ہے تو دل میں بے اختیار شکر کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے میرے جسم کے بالوں کے برابر منہ عطا فرمائے اور ہر منہ میں 70 زبانیں ہوں اور سب سے میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کروں تو اس نعمت کا شکر کیسے ادا کروں گا کہ اس نے مجھے اتنی زبانیں دی ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کا شکر کرنا تو محال ہے لیکن اس کی طلب کرنا اور اپنے آپ کو ناشکری سے بچانا اور اس سب کچھ کو کم سمجھنا یہ شکر کے طور پر قبول ہو جائے اس کی امید کی جاسکتی ہے۔

شُکر کے فائدے

شکر کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے کیونکہ شکر کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ محبت کرتے ہیں۔ نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔"لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ" اگر تم میری نعمتوں کا شکر ادا کروگے تو میں ان نعمتوں میں اور اضافہ کروں گا۔ (ابراھیم:7)
ایک بزرگ فرماتے تھے کہ شکر نعمتوں کا بیمہ ہے کیونکہ شکر کرنے سے کم از کم وہ نعمتیں جو موجود ہیں وہ تو باقی رہیں گی کیونکہ یہ بڑھوتری کا سب سے کم درجہ ہے ورنہ امید کرنی چاہیے کہ ان میں اضافہ ہوگا۔ پس بندے کو چاہیے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کا شکر کرتا رہے اسی میں دونوں جہانوں کا فائدہ ہے۔

1.1.2.15... صدق

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجَاھَدُوْا بِأَمْوَالِھِمْ وَأَنفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ أُولَئِكَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ" یعنی مؤمن تو وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لائے، پھر کچھ تردد نہیں کیا اور اپنی جان و مال سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا، یہی لوگ پورے سچے ہیں۔ (الحجرات:15) اور حدیث شریف میں ہے کہ "عَنْ عَائشۃِ قَالَتْ سَمِعَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلہِ وَسَلَّمَ أَبَا بَکْرٍ رَضِيَ اللّٰہُ عَنْہُ وَ ھُوَ یَلْعَنُ بَعْضَ رَقِیْقِہٖ فَالْتَفَتَ اِلَیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ وَ قَالَ: یَا أَبَا بَکْرٍ لَعَّانِیْنَ وَ صِدِّیْقِیْنَ کَلَّا، وَ رَبِّ الْکَعْبَۃِ فَأَعْتَقَ أَبُوْ بَکْرٍ یَوْمَئِذٍ بَعْضَ رَقِیْقِہٖ وَ جَاءَ اِلَیْہِ فَقَالَ: لَا أَعُوْدُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ" (نوادر الاصول في احادیث الرسول) نبی کریم ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سنا کہ وہ اپنے کسی غلام پر لعنت کر رہے ہیں آپ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ صدیق اور لعنت کرنے والے ہرگز نہیں رب کعبہ کی قسم۔ پس اس دن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے بعض غلاموں کو آزاد کیا اور آپ ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ اب ایسا نہ کروں گا یا رسول اللہ ﷺ۔

حقیقتِ صدق

جس مقام کو حاصل کرے کمال کو پہنچا دے کہ اس میں کسر نہ رہے۔

تشریح

صدق کے معنی پختگی کے ہیں۔ اور اسی لئے ولی کامل کو صدّیق کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ تمام احوال و افعال و اقوال میں پختگی حاصل کر چکا ہوتا ہے۔ شریعت میں صدق عام ہے۔ اس میں احوال کو بھی شمولیت ہے، افعال کو بھی، اقوال کو بھی۔ اقوال کا صدق تو یہ ہے کہ بات پکی اور سچی ہو۔ یعنی واقعہ کے مطابق ہو جو شخص اس صفت سے موصوف ہو اس کو صادق الاقوال کہتے ہیں۔ اور افعال کا صدق یہ ہے کہ ہر فعل شریعت کے مطابق ہو، اس کے خلاف نہ ہو پس جس

شخص کے افعال ہمیشہ شریعت کے مطابق ہوں اس کو صادق الافعال کہا جاتا ہے۔ اور احوال کا صدق یہ ہے کہ احوال سنت کے مطابق ہوں پس جو احوال خلافِ سنت ہیں وہ احوالِ کاذبہ ہیں اور جس شخص کے احوال و کیفیات سنت کے مطابق ہوں اس کو صادق الاحوال کہتے ہیں۔ نیز صدق احوال میں یہ بھی ہے کہ وہ احوال ایسے ہوں جن کا اثر صاحبِ حال پر باقی رہے یہ نہ ہو کہ آج ایک حالت پیدا ہوئی، پھر زائل ہو گئی اور اس کا کچھ بھی اثر باقی نہ رہا جس کو تلوین کہتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب یہ بھی نہیں کہ احوال کا غلبہ ہمیشہ رہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس کا اثر ہمیشہ رہنا چاہیے کہ جو حالت طاری ہو وہ مقام ہو جائے۔ اصطلاح میں اسی کو تمکین کہتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس طاعت کا ارادہ ہو اس میں کمال کا درجہ اختیار کیا جائے۔ مثلاً نماز کو اس طرح پڑھنا کہ جس کو شریعت نے صلوٰۃ کاملہ کہا ہے یعنی اس کو مع آدابِ ظاہرہ و باطنہ کے ادا کرنا، اس طرح تمام طاعات میں جو درجہ کمال کا شریعت نے بتایا ہے اس کا اختیار کرنا صدق ہے۔

صدق کو حاصل کرنے کا طریقہ

صدق ہر قال، حال اور فعل میں کمال کے جاننے پر موقوف ہے کیونکہ اگر کمال کا پتا نہیں ہو گا تو اس کو حاصل کیسے کیا جا سکے گا۔ لہٰذا ہمیشہ نگراں رہے۔ اگر کچھ کمی ہو جائے اس کا تدارک کرے۔ اسی طرح آہستہ آہستہ کمال حاصل ہو جائے گا۔ اصل طریقہ یہ ہے کہ صادقین کے ساتھ رہے اور ان کی نگرانی میں اپنا کام کرے اور ان میں جن کے ساتھ مناسبت ہو اس کے ساتھ اپنا تعلق قائم کر کے اس کو اپنے قول و فعل اور حال سے باخبر رکھے کہ وہی اس میں کمال کی صحیح نشاندہی کرنے والا اور اس کے حصول کی آسان ترکیب بتانے والا ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سنتِ عادیہ یہ ہے کہ اکثر طالبین کی اس طرح اپنے فضل سے رہنمائی فرما دیتے ہیں اور ان کو جلد یا بدیر مقام صدق پر سرفراز فرما دیتے ہیں۔

1.1.2.16... تواضُع

اللہ تعالیٰ کا ارشادِ پاک ہے کہ "وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْأَرْضِ هَوْنًا" اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر تواضع سے چلتے ہیں۔ (الفرقان:63) مطلب یہ ہے کہ ان کے مزاج میں تواضع ہے تمام اُمور میں۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ" (نقله العراقي في تخريج الإحياء وحكم عنه بأنه :إسناده حسن) یعنی جو شخص اللہ کے لئے تواضع اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو رفعت اور بلندی عطا کرے گا

مٹادے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہیے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

تواضُع کی حقیقت

تواضع کی حقیقت یہ ہے کہ اپنے آپ کو ایک کمزور انسان سمجھے اور ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کی عظمت پیشِ نظر ہو، اپنی کمزوریوں پر ایسی نظر ہو کہ اپنی طرف بڑائی کی نسبت سے سچ مچ دور ہو۔ اس کی اصل مجاہدہ نفس ہے اور یہ تکبر کی ضد ہے۔

تشریح

تواضع صرف اس کا نام نہیں ہے کہ زبان سے اپنے آپ کو خاکسار، نیازمند، ذرۂِ بے مقدار کہہ دیا اور بس۔ بلکہ تواضع یہ ہے کہ اگر کوئی ہمیں ذرۂِ بے مقدار کہہ کر برا بھلا کہے اور ذلیل کرے تو ہم میں انتقام کا جوش پیدا نہ ہو اور نفس کو یوں سمجھائیں کہ ہم جب واقعی ایسے ہیں تو پھر برا کیوں مانتے ہیں اور کسی کی مذمت سے ہمیں کوئی رنج و اثر نہ ہو یہ تو تواضع کا اعلیٰ درجہ ہے کہ تعریف اور برائی عقلاً برابر ہو جائے کیونکہ طبعاً تو مساوات ہو ہی نہیں سکتی کہ یہ تو غیر اختیاری ہے البتہ اختیاری اُمور میں تواضع ہمیں اختیار کرنی چاہیے اور اسی کا انسان مکلف بھی ہے۔ اتفاق کی اصل تواضع ہے، جن دو شخصوں میں تواضع ہوگی ان میں

نااتفاقی نہیں ہو سکتی۔ تواضع میں جذب اور کشش کی خاصیت ہے۔ تواضع کی طرف خودبخود کشش ہوتی ہے بشرطیکہ صحیح تواضع ہو۔

تواضُع حاصل کرنے کا طریقہ

انسان جب تک ناسمجھ ہوتا ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کی عظمت کا ادراک نہیں ہوتا اس لئے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں، صلاحیتوں اور توفیقات کو اپنا سمجھ کر پھول جاتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے دی ہیں اور جس طرح دی ہیں اس طرح لے بھی سکتا ہے۔ پس انسان کا اپنے اندر یہ سمجھ پیدا کرنا اور اپنی حیثیت کا مشاہدہ کرنا اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا ایسا دھیان حاصل کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی کبریائی ہر وقت پیشِ نظر اور مستحضر رہے یہی تواضع کو حاصل کرنے کا طریقہ ہے۔ یہ سوچ کہ اللہ تعالیٰ کو تکبر سے نفرت ہے تو متکبر سے ضرور نفرت ہوگی اور تواضع و عاجزی پسند فرماتے ہیں تو متواضع کو بھی پسند فرمائیں گے۔ ذکر کی کثرت، موت کی یاد اور ان حضرات سے ملنا جن میں تواضع ہو تواضع حاصل کرنے کے لئے مفید اعمال ہیں۔

1.1.2.17... تفویض

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "وَأُفَوِّضُ أَمْرِيْ اِلَى اللهِ اِنَّ اللهَ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ" اور میں اپنا معاملہ حق تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں خدا تعالیٰ سب بندوں کا نگراں ہے۔ (الغافر:44) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "إِذَا أَصْبَحْتَ فَلَا تُحَدِّثْ نَفْسَكَ بِالْمَسَاءِ، وَإِذَا أَمْسَيْتَ فَلا تُحَدِّثْ نَفْسَكَ بِالصَّبَاحِ" (سنن الترمذي :2333) مطلب یہ ہے کہ جب صبح کرو تو شام کے متعلق اپنے دل میں خیال نہ لاؤ اور جب شام کرو تو صبح کے متعلق اپنے دل میں خیال نہ لاؤ۔

تفویض کی حقیقت

اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دینا کہ جو وہ چاہیں تصرف کریں اپنے لئے کوئی حالت تجویز نہ کرنا یعنی خدا کے سوا کسی پر نظر نہ رکھے، تدبیر کرے اور نتیجے کو

خدا کے سپرد کر دے۔

تشریح

تفویض کے معنی ترکِ تدبیر نہیں، بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی پر نظر نہ رکھیں۔ تدبیر کرے اور تدبیر کے نتیجے کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دے اور جن اُمور میں تدبیر کا کچھ تعلق و دخل نہیں ان میں تو ابتدا ہی سے تفویض و تسلیم اختیار کرے۔ اپنی طرف سے کوئی حالت یا نظام تجویز نہ کرے، تجویز ہی تمام پریشانیوں کا سبب ہے کیونکہ ہم نے ہر چیز کا ایک خاص نظام اپنے ذہن میں وضع کر رکھا ہے اور چاہتے ہیں کہ ہر کام اس نظام کے مطابق ہو لیکن جب کوئی کام اس نظام کے خلافِ واقع ہوتا ہے تو دل کو تکلیف ہوتی ہے اور زیادہ حصہ اس نظام کا جو ہماری طرف سے تجویز ہوتا ہے غیر اختیاری ہوتا ہے۔ تو غیر اختیاری اُمور کے لئے نظام تجویز کرنا حماقت نہیں تو کیا ہے۔ اسی لئے اہل اللہ نے تجویز چھوڑ کر یہ مذہب اختیار کر لیا ہے۔

تجھ پر فدا ہو جاں مری، زندہ رکھے عطا تری
دل عشق میں مبتلا ترے، دل چاہے بس رضا تری

یعنی زندہ کریں تو آپ کی عطا ہے اور اگر موت دیں تو بھی آپ پر فدا چونکہ جب دل ہی آپ پر آگیا ہے تو اب جو بھی آپ کی مرضی ہو تسلیم ہے۔ الغرض اپنی تجویز کو دخل نہ دے اس طرح تربیت کے سلسلہ میں بھی اپنی تربیت کو خدا کے سپرد کرے کہ جس طرح چاہے وہ تربیت کرے حالات و کیفیات عطا کریں یا سب کو سلب کریں اپنی تجویز کو خدا تعالیٰ کی تجویز میں فنا کر دیں یعنی کامل عبدیت اختیار کریں۔

تفویض کی صفت حاصل کرنے کا طریقہ

حق تعالیٰ کے حکیم اور کریم ہونے کا مراقبہ اس کے لئے بہت مفید ہے۔ حکیم ہے اس لئے اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں اور کریم ہے تو اس کے

ہر کام میں ہماری خیر ہے۔ جب کوئی خلافِ طبع ناگوار واقعہ پیش آئے تو فوراً یہ سوچے کہ یہ حق تعالیٰ کا تصرف ہے جس میں لازماً کوئی حکمت اور مصلحت ہے۔ ابتدا میں تکلف سے یہ بات حاصل ہوگی پھر سوچتے رہنے سے تجویز کو فنا کرنا پڑتا ہے اور پھر یہ حالت اہل اللہ کے لئے طبعی بن جاتی ہے۔

1.1.2.18... رضا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد پاک ہے کہ "رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ" یعنی اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوئے۔ (البينة:8) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "مِنْ سَعَادَةِ ابْنِ آدَمَ رِضَاهُ بِمَا قَضَى اللّٰهُ لَه" (رواہ الترمذي و احمد) یعنی آدمی کی سعادت سے ہے راضی رہنا اس پر جو اس کے لئے اللہ نے مقرر کر دیا ہو۔

رضا کی حقیقت

قضا پر اعتراض نہ کرنا نہ زبان سے نہ دل سے۔

تشریح

رضا بر قضا کا بعض مرتبہ ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ تکلیف بھی محسوس نہیں ہوتی۔ پس اگر مصیبت کا احساس ہی نہ ہو تو رضاء طبعی ہے اور اگر مصیبت کا احساس باقی رہے تو رضاء عقلی ہے۔ اول رضاء طبعی حال ہے جس کا بندہ مکلف نہیں اور ثانی رضاء عقلی مقام ہے جس کا بندہ مکلف ہے۔ قضا پر راضی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تکلیف کی صورتوں میں تکلیف تو محسوس ہوتی ہے مگر چونکہ عقل نے اس کے بہتر انجام یعنی ملنے والے ثواب پر مطلع کر دیا ہے اس لئے طبیعت اس تکلیف کو بلا تکلف گوارا کرتی ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے طبیب کسی مریض کو پینے کے لئے تلخ دوا بتائے یا آپریشن کرانے کی ہدایت کرے تو اس صورت میں ظاہر ہے کہ اس تلخ دوا کا پینا اور آپریشن کرانا تکلیف کی باتیں ہیں مگر چونکہ اس کے ساتھ ہی عمدہ نتیجہ یعنی

صحت و تندرستی سے مریض کو آگاہی حاصل ہے لہٰذا وہ ان تکلیف دہ باتوں کے بتانے والے طبیب سے راضی بلکہ اس کا احسان مند و ممنون رہتا ہے۔ اسی طرح جو شخص سچے دل سے اس کا یقین کئے ہوئے ہے کہ دنیا کی ہر تکلیف پر حق تعالیٰ کی طرف سے اجر مرحمت ہوگا اور ہر مصیبت و صدمہ پر اس قدر ثواب عطا ہوگا جس کے مقابلے میں اس عارضی تکلیف کی کچھ حقیقت نہیں ہے تو اس یقین سے وہ ضرور مسرور و شاداں ہوگا۔ جس وقت مولائے حقیقی کی جانب سے جو عطا ہوتا ہے اس وقت کے وہی مناسب ہوتا ہے اس کے خلاف کی تمنا نہیں چاہئے جب اللہ تعالیٰ بظاہر ہمارے نقصانات ہی کو ہمارے لئے بہتر سمجھ رہے ہیں تو ہم کو اس میں صدمہ کی کون سی بات نظر آئی۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے جیسا بنا دیا اس کے لئے وہی مناسب تھا گو ہر شخص دوسروں کو دیکھ کر یہ تمنا کرتا ہے کہ میں ایسا ہوتا اور اپنی حالت پر قناعت نہیں ہوتی لیکن غور کر کے دیکھے اور سوچے تو اس کو معلوم ہوگا کہ میرے لئے مناسب حالت وہی ہے جس میں خدا تعالیٰ نے مجھ کو رکھا ہے۔

البتہ دعا کرنا خلافِ رضا نہیں۔ اہل اللہ محض حکم کی وجہ سے اظہارِ عبدیت کے لئے دعا کرتے ہیں اس واسطے دعا نہیں کرتے کہ ہم نے جو مانگا ہے ضرور ہمیں وہی مل جائے، بلکہ ہر حال میں خدا کی رضا پر راضی رہتے ہیں خواہ قبول ہو یا نہ ہو۔ قبول نہ ہونے سے شاکی اور تنگ دل نہیں ہوتے ہیں یہی رضا کی علامت ہے۔

صفتِ رضا حاصل کرنے کا طریقہ

یہ آثار محبت میں سے ہے اس لئے اس کے واسطے جداگانہ طریق نہیں ہے۔ محبت کے ساتھ ہی رضا بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ جب محبت ہو جاتی ہے تو پھر بقول شاعر ؎

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

1.1.2.19... فنا

حقیقتِ فنا

فناء ذات یعنی اپنے آپ کو مٹانا۔ اسی کو اصطلاح میں فنا کہتے ہیں۔ اس میں عبدیتِ تامہ حاصل ہو جاتی ہے جس سے افعالِ ذمیمہ و ملکاتِ رذیلہ زائل ہو کر معاصی ترک ہوجاتے ہیں اور قلب سے غیر اللہ کی محبت نکل جاتی ہے۔ اس سے حرص، طولِ امل، کبر و عجب و ریا وغیرہ جو سب ذات کے ساتھ وابستہ چیزیں ہیں، ان کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

صفتِ فنا حاصل کرنے کا طریقہ

ملکۂ یاداشت کواتنا راسخ کرنا کہ غیر اللہ کے ساتھ کوئی عملی تعلق نہ رہے اسکی اصل ہے جس کو حاصل کرنے کا طریقہ مجاہدہ اور کثرتِ ذکرِ لسانی و قلبی ہے۔

فناءالفناء یعنی فناء کا فناء

ایک تو وہ لوگ ہوتے ہیں کہ وہ اتنی خود رائی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ خدا کو بھی بھول جاتے ہیں یہ تکبر پیدا کرتا ہے اور ایک وہ مبارک لوگ ہیں جو اپنی ذات کو اس حد تک بھول جاتے ہیں کہ ان کو اپنی فنائیت کا بھی علم نہیں ہوتا۔ بس ان کو صرف اللہ یاد ہوتا ہے اور اسی کی خوشنودی میں لگے رہتے ہیں وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کو یاد رکھتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کوراضی کرنے کے لئے ہر عمل کے لئے تیار رہتے ہیں اور اس معاملے میں وہ دوسروں سے زیادہ ہوش رکھتے ہیں۔ اس لئے اس کو بقا بھی کہتے ہیں۔ یعنی وہ بے خودی جو فنا میں تھی وہ بھی نہ رہی یعنی جیسا التفات اور استحضار غیر کا پہلے تھا وہ نہ رہا، غیر دل سے نکل گیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہی تو کمال تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے عظیم سانحے کو برداشت کیا اور بے خودی میں نہ گئے، مکمل ہوش میں رہے، حقائق کا ادراک

کیا اور اس صورتِ حال میں جو اللہ تعالیٰ کا حکم تھا پورا کر کے دکھایا اور وہ آیتِ مبارکہ کا جس میں آپ ﷺ کے وصال کا ذکر تھا وہ حضرت کو اچھی طرح یاد رہی اور اس آیت کا پڑھنا تھا کہ باقی سب صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی اس حقیقت کا ادراک ہوگیا۔ اس کے حاصل کرنے کا طریقہ محبتِ الٰہی ہے جو اس کو اپنے سے بیگانہ اور اللہ تعالیٰ کا دیوانہ کر دے کیونکہ اصل پاگل وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی محبت میں دیوانہ نہیں اور اصل عقلمند وہ ہے جو نفسانی عقل سے پاک ہے۔

ہے فرزانہ جو فرزانہ نہیں ہے ہے دیوانہ جو دیوانہ نہیں ہے

1.1.2.20... دُعا

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِىْٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِىْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ" اور تمہارے پروردگار نے فرمایا ہے کہ مجھ کو پکارو میں تمہاری درخواست قبول کر لوں گا جو لوگ میری عبادت سے سر تابی کرتے ہیں وہ عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔ (الغافر:60)

دعا کی حقیقت

اس کی حقیقت نیازمندی اور بندگی ہے یعنی اپنی حاجت اور احتیاج کو پیش کرنا کہ اے اللہ ہمیں یہ دیدے قرآن و حدیث دونوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دعا عین عبادت ہے خواہ کسی قسم کی ہو۔ دینی ہو یا دنیوی مگر ناجائز امر کے لیے نہ ہو خواہ چھوٹی سے چھوٹی چیز کی ہو یا بڑی سے بڑی چیز کی۔ ترمذی شریف میں یہاں تک آیا ہے کہ اگر جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو خدا سے مانگا کرو اور دعا کی خاص بات یہ ہے کہ جتنی عبادتیں ہیں اگر دنیا کے لیے ہوں تو عبادت نہیں رہتیں مگر دعا ایک ایسی عبادت ہے کہ یہ اگر دنیا کے لیے بھی ہو تب بھی عبادت ہے اور ثواب ملتا ہے مثلاً مال مانگے یا اور کوئی دنیوی حاجت مانگے جب بھی ثواب کا مستحق بنے گا۔ حدیث شریف میں ہے "مَنْ لَّمْ يَسْئَلِ اللّٰهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ"

(سنن الترمذي:3373) کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے نہ مانگے اس پر اللہ تعالیٰ غصہ کرتے ہیں اور یہی آیتِ بالا سے بھی مفہوم ہوتا ہے نیز یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جو برابر مانگتا رہے اس سے خوش ہوتے ہیں۔

ہر تدبیر میں انسان اپنے جیسے عاجز کے سامنے احتیاج کو ظاہر کرتا ہے خواہ قالاً یا حالاً۔ اور دعا میں ایسی ذات سے مانگتا ہے جو سب سے زیادہ کامل القدرۃ ہے اور جس کے سب محتاج ہیں اور عقل بھی یہی کہے گی کہ جو سب سے قادر تر ہے اسی سے مانگنا زیادہ کمال اور نفع رساں ہے پس یقیناً یہ تدبیر ہر تدبیر سے بڑھ کر ہے کیونکہ کوئی بھی تدبیر حق تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ ہی سے کامیاب ہوسکتی ہے تو جو شخص حق تعالیٰ سے مانگے گا وہ ضرور کامیاب ہوگا۔

دعا صرف غیر اختیاری اُمور کے ساتھ خاص نہیں جیسا کہ عام خیال کیا جاتاہے کہ جو امر اپنے اختیار سے خارج ہوتا ہے وہاں مجبور ہو کر دعا کرتے ہیں ورنہ تدبیر پر اعتماد ہوتا ہے بلکہ اختیاری اُمور میں بھی دعا کی سخت ضرورت ہے اصل کام تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، یہ اسباب و علامات محض بندوں کی تسلی اور دوسری حکمتوں کے لیے مقرر فرمائے ہیں۔

ضرورتِ دُعا

دعا کے علاوہ جتنے اسباب ہیں یا وہ دنیا کے لئے ہیں یا آخرت کے لئے مثلاً زراعت، تجارت وغیرہ کے لئے جو اسباب ہیں ان کا اصل مقصود دنیا ہے چاہے حسن نیت سے اس کا اجر آخرت میں بھی ملے۔ اور اسبابِ شرعیہ مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ سے آخرت مقصود ہے چاہے وہ نتیجے کے لحاظ سے دنیا کے لئے بھی مفید ہوں یعنی ان میں دنیا کی نیت نہیں کی جاسکتی ہے۔ صرف دعا ایک ایسی چیز ہے کہ اس میں دنیا کی بھی نیت ہو تو بھی آخرت میں مفید ہے اور آخرت کے لئے ہو تو وہ تو ہے ہی، جس سے بوجہ اس جامعیت کے اس کی وقعت و عظمت ظاہر ہے اس لیے قرآن مجید و حدیث میں نہایت درجہ اس کی ترغیب و فضیلت و تاکید جابجا وارد ہے۔ ابوداود شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"تمہارا رب بہت باحیاء اور کریم (کرم والا) ہے، جب اس کا بندہ اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتا ہے تو انہیں خالی لوٹاتے ہوئے اسے اپنے بندے سے شرم آتی ہے۔ترمذی شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تین لوگ ہیں جن کی دعا رد نہیں ہوتی: ایک روزہ دار، جب تک کہ روزہ نہ کھول لے، (دوسرے) امام عادل، (تیسرے) مظلوم، اس کی دعا اللہ بدلیوں سے اوپر تک پہنچاتا ہے، اس کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، اور رب کہتا ہے: میری عزت (قدرت) کی قسم! میں تیری مدد کروں گا، بھلے کچھ مدت کے بعد ہی کیوں نہ ہو" نیز ابن ماجہ شریف میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نیکی ہی عمر کو بڑھاتی ہے، اور تقدیر کو دعا کے علاوہ کوئی چیز نہیں ٹال سکتی، اور کبھی آدمی اپنے گناہ کی وجہ سے ملنے والے رزق سے محروم ہو جاتا ہے" اور ترمذی شریف کی ایک روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعا سے زیادہ کوئی چیز قدر و منزلت کی نہیں۔ اور مستدرک حاکم کے مطابق آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دعا مسلمان کا ہتھیار ہے اور دین کا ستون اور آسمان کا نور ہے۔

دعا میں یہ خاصیت ہے کہ اس سے معمولی تدبیر بھی موثر ہو جاتی ہے۔ دعا کرنے سے بندہ کو حق تعالیٰ سے خاص تعلق ہو جاتا ہے جس وقت آدمی دعا کرتا ہے اس وقت غور کر کے ہر شخص دیکھ لے کہ اس کو اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق محسوس ہوگا بغیر اس کے خاص تعلق نہیں ہوتا بلکہ صرف ہوائی ہوتا ہے۔ اس لئے دعا کے ذریعے سلوک بھی آسانی کے ساتھ طے ہو جاتا ہے یعنی جو برکات یعنی اللہ تعالیٰ کا دھیان ذکر سے حاصل کیا جاتا ہے وہ دعا سے جلدی حاصل ہو جاتا ہے۔

دعا میں ایک نفع یہ بھی ہے کہ یہ حق تعالیٰ کے یہاں معذور سمجھا جائے گا کیونکہ جب اس سے سوال ہوگا کہ تم نے حق کا اِتباع کیوں نہیں کیا تو یہ کہہ دے گا کہ میں نے طلبِ حق کے لیے بہت سعی کی اور اللہ تعالیٰ تو ایک ہی تھے میں نے ان سے بھی عرض کر دیا تھا کہ مجھ پر حق واضح ہو جائے۔ بعض دفعہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت و عنایت سے نیک بندوں کی عاجزی اور دعا و زاری پر نظر فرما کر

محض اپنی قدرت سے ناتمام اسباب سے یا بلا اسباب بھی اثر مرتب فرما دیتے ہیں۔

قبولیتِ دعا اور اس کا طریقہ کار

احادیثِ شریفہ میں دعا کی بڑی فضیلت آئی ہے اور عقلاً بھی یہ سب سے بڑی چیز ہے اور یہ ہر تدبیر سے بڑھ کر ہے اس کو تقدیر سے زیادہ قرب ہے کیونکہ اس میں اس ذات سے درخواست ہے جس کے قبضہ میں تقدیر ہے۔ عوام سب تدبیریں کرتے ہیں مگر دعا نہیں کرتے بس دو تین دعائیں یاد کرلی ہیں، نماز کے بعد آموختہ کے طور پر ان کو پڑھ کے منہ پر ہاتھ پھیر لیتے ہیں، نہ خشوع ہے نہ خضوع ہے، یہ تو ایک غلطی ہوئی اور دوسری غلطی یہ ہے کہ دعا کے نہ قبول ہونے سے شیطان پھر یہ دھوکہ دیتا ہے کہ یہ تدبیر تو سب تدبیروں سے کم ہے دیکھو اتنا عرصہ دعا کرتے گزر گیا قبول ہی نہ ہوئی مگر حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ کوئی مسلمان ایسا نہیں جو دعا میں اڑ جائے اور پھر عطا نہ ہو خواہ سرِدست اس کو دے دیں یا آئندہ کے لیے جمع کر دیں اس سے معلوم ہوا کہ دعا قبول ضرور ہوتی ہے مگر صورتیں اس کی مختلف ہیں کبھی تو وہی مل جاتا ہے جو مانگا تھا اور کبھی اس سے افضل چیز مل جاتی ہے اور کبھی دنیا میں کچھ عطا نہیں ہوتا بلکہ اس کا اجر آخرت میں جمع کر کے آخرت میں دیا جائے گا۔ اس وقت ثواب کو دیکھ کر تمنا کریں گے کہ کاش ہماری سب دعائیں آخرت میں ہی ذخیرہ رہتیں دنیا میں ایک بھی نہ ملتی پس یقین کرلینا چاہیے کہ ہماری سب دعائیں قبول ہی ہوتی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کی مصلحت کو تم سے زیادہ جانتے ہیں پس اس بات کو بھی وہی خوب جانتے ہیں کہ جس نعمت کی تم درخواست کر رہے ہو وہ تمہارے لئے مناسب ہے یا نہیں اور مناسب ہے تو کس وقت اور کس حالت میں مناسب ہے جیسے اگر کوئی طبیب سے درخواست کرے کہ میرا علاج مسہل سے کر دیجئے تو اصل منظوری تو علاج کا کر دینا ہے گو مسہل نہ دے اور دوسری منظوری مسہل دینا ہے اگر یہ مفید ہو پس اللہ تعالیٰ کا جو ارشاد ہے "أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ" کہ ہم ہر دعا کرنے والے کی درخواست کو لے لیتے ہیں۔ (البقرة:186)

اور اس پر توجہ کرتے ہیں بے توجہی نہیں کرتے تو جب درخواست لے لی گئی ہے تو اگر اس کا پورا کرنا ہماری مصلحت کے خلاف نہیں ہو گا تو ضرور پوری ہو گی ورنہ اس کی جگہ کچھ اور مل جائے گا سو یہ تو اصل کامیابی ہے پس اجابتِ دُعا جس کا وعدہ ہے اس کے معنی درخواست کا لے لینا ہے اور اس پر توجہ کرنا ہے یہ اجابت یقینی ہے اس سے کبھی محرومی نہیں ہوتی، آگے دوسرا درجہ ہے کہ جو مانگا ہے وہی مل جائے۔ یہ اگرچہ ممکن ہے لیکن اس کا وعدہ نہیں۔

دعا کے آداب

احادیث معتبرہ میں دعا کے لیے چند آداب تعلیم فرمائے گئے ہیں جن کو ملحوظ رکھ کر دعا کرنا بلا شبہ کامیابی کی کنجی ہے اور جن کی رعایت کے بعد دعا کا قبول نہ ہونا اللہ تعالیٰ کی عادت کے خلاف ہے اس لئے کوشش کرنی چاہیے کہ ان آداب کا خیال رکھ کر دعا کی جائے لیکن اگر کوئی شخص کسی وقت ان تمام یا بعض آداب کو جمع نہ کر سکے تو یہ نہیں چاہیے کہ دعا ہی چھوڑ دے بلکہ دعا تو ہر حال میں مفید ہی مفید ہے اور ہر حال میں حق تعالیٰ سے قبولیت کی امید رکھنی چاہیے۔ یہ آداب مندرجہ ذیل ہیں۔

سب سے بڑا ادب یہ ہے کہ رزق حلال ہو۔ رزق حرام سے اپنے آپ کو بچائے کیونکہ رزق حرام دعا کے قبول نہ ہونے کا سب سے بڑا سبب ہے۔ اس کے علاوہ جو آداب ہوسکتے ہیں ان میں وضو کرنا، قبلہ رخ ہونا، دو زانو بیٹھنا، دعا کے لیے دونوں ہاتھ پھیلانا، اخلاص اور ادب و تواضع کے ساتھ دعا کرنا، دعا کے لیے اول و آخر حمد و ثنا اور درود شریف پڑھنا، اپنی محتاجی اور عاجزی کو ذکر کرنا، دعا کے وقت انبیا علیہم السلام اور دوسرے مقبول بندوں کے ساتھ توسل کرنا یعنی یہ کہنا کہ یا اللہ ان بزرگوں کے طفیل سے میری دعا قبول فرما، ان دعاؤں کے ساتھ دعا کرنا جو حضور اکرم ﷺ سے منقول ہیں، رغبت و شوق اور عزم کے ساتھ دعا کرنا یعنی یہ نہ کہے کہ یااللہ اگر تو چاہے تو میرا کام پورا کر دے بلکہ قبول دعا کی امید قوی رکھے۔ کسی ناجائز چیز، گناہ اور محال چیز کی دعا نہ کرے۔ اپنی سب حاجات

صرف اللہ تعالیٰ سے طلب کرے اور مخلوق پر بھروسہ نہ کرے۔ دعا کے آخر میں آمین کہہ کر دونوں ہاتھ اپنے چہرہ پر پھیرے۔ مقبولیتِ دعا میں جلدی نہ کرے یعنی یہ نہ کہے کہ میں نے دعا کی تھی اب تک قبول نہیں ہوئی۔

دعا اور اسباب

ان میں اعتدال اصل طریقہ نبویہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے دعا و توکل کے ساتھ اسباب کی رعایت فرمائی ہے کہ نہ دعا کے بھروسہ پر اسباب کو چھوڑ دے اور نہ اسباب میں ایسا منہمک ہو کہ مسبب الاسباب پر نظر نہ رہے۔ آخر دعا بھی تو ایک سبب ہے۔ اس لئے یہ بات بڑی عجیب ہے کہ باقی اسباب کا خیال تو رکھا جائے لیکن اس اصل سبب کی طرف دھیان نہ ہو۔ عوام میں اس طرف سے بڑی غفلت ہے۔ تعویز وغیرہ پر تو عوام کو بہت یقین ہوتا ہے جس کو ثابت کرنا محنت طلب کام ہے لیکن دعا جو قرآن و حدیث سے یقینی طور پر بلا غبار ثابت ہے اور تمام انبیاء، صدیقین اور اولیاء کا لازمی طریقہ رہا ہے اس کی قدر نہیں کی جاتی اور اگر دعا کے لئے کہتے ہیں تو پھر اسباب کی طرف توجہ نہیں کی جاتی تو بعض لوگ تو یہ ظلم کرتے ہیں کہ دعا کو ایک سبب بھی نہیں مانتے تو دعا سے محروم ہیں اور بعض اپنے اختیاری اُمور جن میں اسباب کے اختیار کرنے کے ساتھ دعا کا حکم ہے اس کو صرف دعا سے کروانا چاہتے ہیں۔ یاد رہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اس لئے اس بندگی کا تقاضا ہے کہ ہم شریعت کے مطابق اسباب کا بھی ڈٹ کر استعمال کریں اور ان اسباب پر ہمارا بھروسہ نہ ہو، مسبب الاسباب پر ہو اس لئے اللہ تعالیٰ سے ان اسباب کے مؤثر ہونے کی دعا بھی کی جائے۔ نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ سے چھوٹی چیز مانگنے سے اللہ تعالیٰ ناخوش ہونگے کیونکہ حق تعالیٰ کے نزدیک ہر بڑی چیز چھوٹی ہے اس کے نزدیک عرش اور نمک کی ڈلی برابر ہے۔ دعا میں اگر دل نہ لگتا ہو تو دل کو اس طرح سمجھا دیں کہ دنیا میں بعض اسباب میں نفع یقینی نہیں ہوتا لیکن ہم اس امید پر کہ شاید اس سے نفع ہو جائے ہمت سے کام لیتے ہیں۔ گو آخر میں خسارہ ہی ہو جائے یعنی خسارہ کا خطرہ ہوتا ہے جیسے تجارت

وغیرہ میں، تو دعا میں تو کسی قسم کے نقصان کا احتمال ہی نہیں پھر اس میں کوتاہی کیوں کی جاتی ہے؟

1.1.2.21... خشوع

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ" وہ نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔ (المؤمنون:2) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "فَيُصَلِّيْ ركعتين مُقبِلاً عليها" (البخاري) پھر دو رکعت نماز اسطرح پڑھے کہ اپنے دل اور چہرہ سے اس کی طرف متوجہ رہے۔

حقیقتِ خشوع

کسی نیک عمل میں بطور مقصودیت کسی غیر اللہ کا قلب میں حاضر نہ ہونا اور نماز میں کسی غیر مطلوب چیز کی طرف التفات کا نہ ہونا خشوع کہلاتا ہے۔ خشوع لغت میں مطلق سکون کو کہتے ہیں اور شرعاً اعضاء کے سکون کے ساتھ سکونِ قلب جس کی حقیقت حرکتِ فکریہ کا انقطاع ہے کو جتنا اختیار سے حاصل ہو سکتا ہے حاصل کرنا خشوع ہے۔ جس طرح اعضاء کا سکون بقدرِ قدرت ممکن ہے مثلاً صحیح اور قوی آدمی اس پر قادر ہے کہ نماز میں کوئی حرکت نماز کے علاوہ صادر نہ ہونے دیں وہ اس کا مکلف ہوگا اور جو کسی درجہ میں معذور ہے مثلاً غلبہ درد کے وقت اس پر قابو نہیں جب درد اٹھے گا بے چین ہو کر پیچ و تاب کھائے گا اس لیے وہ اس درجہ سکون کا مکلف نہ ہوگا البتہ جب درد نہ اٹھے پھر وہ از سرِ نو اس سکون کا مکلف ہوگا اسی طرح سکونِ قلب بھی بقدرِ قدرت مطلوب ہے مثلاً جو شخص تشویش کے تمام اسباب سے محفوظ ہو وہ حرکاتِ فکریہ کے کلی انقطاع پر قادر ہے اس لیے وہ اس کا مکلف ہوگا اور جو تشویش کے اسباب میں مبتلا ہو وہ ایسی انقطاع پر قادر نہیں اس لیے وہ اس درجہ کا مکلف بھی نہ ہوگا البتہ جتنا وقت تشویش سے سکون کا میسر ہوگا یعنی وہ تشویش تخیل پر غالب نہ ہو اس وقت میں اس کا مکلف ہوگا یہ تو اس کا اصل مفہوم ہے اب اس مقام پر ایک باریک بات

ہے جو زیادہ قابل اعتناء ہے اور اس میں زیادہ غور کرنے کی ضرورت ہے، اگر صاحب معاملہ کو ایسی بصیرت نہ ہو تو اس کو کسی مصلح تجربہ کار سے مشورہ کرنا چاہیے وہ یہ کہ اس حرکتِ فکریہ کو قطع کرنے طریقہ کیا ہے کیونکہ یہ انقطاع براہِ راست حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے دل کو یا تو کسی ایک محمود چیز کی طرف قصداً متوجہ کر دیا جائے جو نماز کے خلاف نہ ہو مثلاً ذاتِ حق کی طرف برابر متوجہ رہے اگر خیال نہ جمنے کی وجہ سے اس پر قادر نہ ہو تو یہ تصور کرے کہ میں کعبہ کی طرف رخ کیے ہوئے ہوں یا پھر غور و خوض میں دل کو مشغول کرے مثلاً نماز میں جو اذکار و قرأت پڑھ رہا ہے انکی طرف توجہ رکھے کہ میں یہ الفاظ پڑھ رہا ہوں یا ان کے معانی کی طرف توجہ رکھے چونکہ نفس ایک وقت میں دو طرف متوجہ نہیں ہوتا اس لیے یہ توجہ دوسرے خطرات کے آنے سے مانع ہو جائے گی۔

سکونِ قلب کو حاصل کرنے کا طریقہ

یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص کی استعداد جدا ہے، کسی کے لیے ایک تصور نافع ہے تو کسی کے لیے دوسرا تصور۔ بعض اوقات صاحبِ معاملہ بصیرت اور تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے اپنے لئے ایک طریقے کو اختیار کرتا ہے اور وہ طریقہ اس کی طبعیت کے مناسب نہیں ہوتا اس لیے اس سے مقصود اس کو حاصل نہیں ہوتا اور بار بار کی ناکامی سے مایوس ہو کر اس غلط گمان میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ خشوع فعلِ اختیاری نہیں اس لیے بالکل اس کا اہتمام چھوڑ بیٹھتا ہے اور اس کی برکت سے محروم رہتا ہے اس لیے اپنے لئے مناسب طریقے کا حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ دوسری غلطی جو اس سے اشد ہے یہ ہوتی ہے کہ تعین کے بعد جس طریق کو اختیار کیا گیا ہے اس میں کاوش زیادہ کرنے لگتا ہے اور اس کا منتظر اور متوقع رہتا ہے کہ دوسرا کوئی خیال بالکل نہ آئے اور اس کے لیے طبعیت پر زور ڈالتا ہے حتی کہ نوبت کلال و ملال کی پیش آتی ہے جس کا نتیجہ وہی یاس اور ناامیدی ہے کہ خشوع کو حاصل کرنے کی کوشش ترک کر دیتا ہے۔ اس لیے زیادہ کاوش نہیں

کرنی چاہیے بس سرسری معتدل توجہ کافی ہے اگر اس توجہ کے ساتھ کوئی دوسرا خطرہ آجائے وہ غیر اختیاری ہوگا اور مضر نہ ہوگا جیسے کسی خاص صفحہ میں کسی خاص لفظ پر قصداً نظر کی جائے تو یقینی بات ہے کہ وہ شعاعیں بلا قصد دوسرے کلمات پر بھی پہنچ جاتی ہیں مگر اس کا قصد نہیں ہوتا۔

اور تیسری ایک غلطی سب سے بڑھ کر یہ ہوتی ہے کہ دوسرے خیال کے آنے کے ساتھ یہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ خیال قصداً آیا یا بلا قصد، سو یہ فیصلہ محض بیکار ہے اگر یہ فرض کیا جائے کہ قصداً آگیا تو اب گزشتہ کی تلافی تو نہیں ہوسکتی یہی کہ آئندہ کے لیے اپنے خیال کو درست رکھنے کی ضرورت ہے تو اپنی توجہ اب بہتر کرلے، یہی ہوسکتا ہے اور اس کا ہی حکم ہے۔ اصل میں جو توجہ خیالات کو روکے وہ دو قسم کی ہوتی ہے ایک غور و خوض اگرچہ مختلف اشیاء کی طرف ہو دوسری کسی ایک چیز کی طرف دھیان چاہے اس میں غور و خوض نہ ہو پس جس شخص کو آیات و اذکار کے معانی بلا خوض ذہن میں آتے ہوں مثلاً کوئی پکا حافظ ہے اور عالم بھی وہاں نہ غور و خوض کا وجود ہے اور نہ ہی جس چیز میں فکر سے کام لیا جارہا ہو وہ ایک چیز ہے اس لیے توجہ کی کوئی قسم نہ پائی گئی پس اس سے خیالات منقطع نہیں ہوں گے بخلاف اس شخص کے جس کو سوچنے سے معنی یاد آتے ہیں اس شخص کی توجہ قاطع خطرات ہوگی پس ایسے شخص کے لیے دوسری توجہ کی ضرورت ہوگی یعنی شے واحد کی طرف خواہ وہ شے واحد کچھ بھی ہو ذات حق ہو یا کعبہ پر نظر یا کچھ اور۔ اور توجہ الی الحق یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات کا اجمالاً تصور رکھے جس طریق سے بھی بے تکلف ذہن میں آجائے زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں یا ان کے کسی فعل کا تصور رکھے مثلاً یہ کہ وہ ہم کو دیکھ رہے ہیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کسی ایک چیز کی طرف توجہ کا ایک طریقہ جو بہت آسان بھی ہے اور بے حد نافع بھی، یہ ہے کہ اپنی تمام طاعات صلوٰۃ و تلاوت و اذکار بلکہ مباح افعال میں بھی اس کا تصور رکھے کہ یہ سب عنقریب حق تعالیٰ کے دربار میں پیش ہوں گے تو ان میں کوئی ایسا اختیاری فعل نہ ہو کہ یہ پیشی کے قابل نہ رہے بس اتنا تصور کافی ہے ابتداءً تو استحضار ضعیف ہوگا لیکن

کوشش کے بعد اس میں دوام اور پختگی آئے گی۔ اِن شاء اللہ۔

حدیث شریف میں ہے کہ ایک روز نبی کریم ﷺ نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے اور نماز میں آپ کو کچھ خطرہ ہوا (الحديث اخرجه الترمذی) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی بھی چیز کا نماز میں خیال نہ آنا نماز میں خشوع کی شرط ہے، یہ بات درست نہیں لیکن اپنے اختیار سے کسی لایعنی بات میں غور و فکر کرنا البتہ خشوع کے خلاف ہے۔ غرض خطرات اور وساوس کا لانا تو اختیاری ہے پس نماز میں یہ خشوع کے خلاف ہوگا اور خطرات کا آنا غیر اختیاری ہے اس لئے اس سے نماز میں خشوع پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہر شخص صرف اتنے کا مکلف ہے کہ وہ نماز میں وساوس اور خیالات کی طرف متوجہ نہ ہو۔ اس میں چونکہ مشقت ہے اس لئے بعض دفعہ خطرہ والی نماز بے خطرہ والی نماز سے افضل و اکمل ہوتی ہے کہ خطرات کو دفع اور قلب کو جمع کرنے میں مشقت لاحق ہوتی ہے جس کی وجہ یہی مشقت ہے کیونکہ ایک مطلوب امر کے لئے ہے۔

غرض کمال توجہ کے منافی وہ وساوس و خیالات ہیں جو اختیاری ہوں اب اگر وہ وساوس اختیاریہ مباحات کے درجے کے ہیں تو ان سے گناہ تو نہ ہوگا البتہ اس سے خشوع ناقص ہو جائے گا اور اگر وہ تصورات حرام ہیں تو ان سے گناہ بھی ہوگا چنانچہ نص میں وارد ہے "وَاِن تُبْدُوْا مَا فِیْٓ أَنْفُسِکُمْ أَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ" اور اگر تم اپنے دل کی بات ظاہر کرو گے یا چھپاؤ گے اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔ (البقرۃ:284) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وساوس پر بھی مواخذہ ہوگا لیکن حدیث سے تفسیر معلوم ہوئی کہ مراد وساوسِ اختیاریہ ہیں جو درجہ عزم میں ہوں اور اس کے بعد "لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَھَا" اللہ کسی کو اس کی طاقت کے سوا تکلیف نہیں دیتا۔ (البقرۃ:286) نے بالکل صاف کر دیا کہ وسعت سے زیادہ پر مواخذہ نہیں اور وساوسِ اضطراریہ وسعت سے خارج ہیں پس وساوسِ غیر اختیاریہ سے بالکل مطمئن رہیں کیونکہ شیطان ضابطہ سے کام کرتا ہے جن سے گناہ بلاواسطہ نہیں کرا سکتا یعنی اتقیاء سے، ان کو وہ عبادت کے وقت وساوس میں مبتلا کرتا اور اس طرح سے پریشان کرتا ہے تاکہ وساوس سے

گھبرا کر یہ عبادت ترک کر دیں مگر جو محقق ہیں وہ اس سے ہرگز نہیں گھبراتے وہ تو وساوس آنے کے وقت کہتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے کہ دشمن کی سب چالیں ختم ہو کر وسوسہ پر رہ گئیں بلکہ وہ گھبرانے کی بجائے شیطان سے کہتے ہیں کہ آ جتنے وسوسے ڈال سکے ڈال دے ہمارا کچھ نقصان نہیں۔ عام لوگ اس کے دفع کی کوشش کرتے ہیں مگر محققین فرماتے ہیں کہ دفع کے قصد سے بھی اس کی طرف توجہ نہ کریں بلکہ جب وسوسہ آئے اس وقت مقصود کی طرف توجہ کی تجدید کریں اور وسوسہ کے نہ لانے کا قصد کریں نہ دفع کا کیونکہ دفع توجہ کے بغیر ہو گا نہیں تو دفع وسوسہ کا قصد کرنے سے اس کی طرف اور توجہ بڑھے گی، گھٹے گی نہیں پھر جب شیطان اس کو وسوسہ کی طرف متوجہ پائے گا تو وہ اور زیادہ وسوسے ڈالے گا۔

ضرورتِ خشوع

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ مِن قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ۖ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ" کیا ایمان والوں کے لئے وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد اور جو دینِ حق نازل ہوا اس کے سامنے جھک جائیں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو پہلے کتاب ملی تھی پھر ان پر زمانہ دراز گزر گیا پس ان کے دل سخت ہوگئے اور بہت سے ان میں نافرمان ہوگئے۔ (الحدید:16)

یہاں ذکر اللہ میں خشوع کی ضرورت کا بیان ہے اور ذکر اللہ میں ساری عبادتیں آگئیں اس خشوع کے نہ ہونے پر کیسی وعید ہے، یہود و نصاریٰ سے تشبیہ دے کر ذکر کر دیا ہے کہ ایسے نہ بنو جس سے ظاہر ہو کہ ترکِ خشوع کیسی بری چیز ہے جس کے باعث آدمی کافروں سے مشابہ ہو جاتا ہے اور اس کا ثمرہ بیان فرمایا کہ "فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ" پس ان کے دل سخت ہوگئے۔ (الحدید:16) یہ قساوتِ قلبی ایسی بری چیز ہے کہ قرآن مجید میں ہے کہ "فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُم مِّنْ ذِكْرِ اللهِ ۚ أُوْلٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ" یعنی تباہی و ہلاکت ہے ان لوگوں کے

لیے جن کے دل خدا کی یاد سے سخت ہو رہے ہیں وہ لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔ (الزمر:22) اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "إِنَّ أَبْعَدَ النَّاسِ مِنَ اللهِ الْقَلْبُ الْقَاسِي" (رواه الترمذي) بے شک سب سے زیادہ دور اللہ سے قساوت والا دل ہے۔ پس خشوع حاصل کرنے کی تاکید کرنا جیسا کہ آیت میں ہے اور (اس کی ضد یعنی) قساوت کی برائی کرنا جیسا کہ قرآن اور حدیث میں ہے اس کے ضروری اور واجب ہونے کے لیے کھلی دلیل ہے پس ہر اک کیلئے لازم ہے کہ وہ دل میں خشوع پیدا کرے۔

اسبابِ خشوع

اگر صفت خشوع موجود ہے تب تو اس کے مناسب وضع اختیار کرنا لازم ہے اور اگر یہ صفت موجود نہیں تو خود اس کے حاصل کرنے کے لیے چار اسباب ہیں

ایک سبب تو یہ ہے کہ اس کے آثار کا اختیار کرنا ضروری ہے اور اس کے ظاہری آثار ہیں کہ جب چلے گردن جھکا کر چلے، بات چیت میں اور معاملات میں سختی نہ کرے، غصہ اور غضب میں آپے سے باہر نہ ہو، بدلہ لینے کی فکر میں نہ رہے، اپنی رفتار میں میانہ روی پیدا ہو اور آواز پست ہو۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ اہلِ خشوع کی صحبت اختیار کی جائے۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا خوف دل میں بٹھایا جائے اس خوف کو پیدا کرنے کے لیے یہ تدبیر کی جائے کہ کوئی مناسب وقت تجویز کر کے اس میں تنہا بیٹھ کر اپنی نافرمانی کی حالت اور پھر خداوند کریم کی نعمتیں سوچے کہ نافرمانی کے سبب کہیں موقوف نہ ہو جائیں اور عذابِ آخرت اور قیامت کی ہولناک باتوں، پل صراط، میزان اور دوزخ کی حالت وغیرہ کو سوچا جائے تو اِن شاء اللہ بہت فائدہ ہو کیونکہ اس کو خوف کے پیدا ہونے میں بڑا دخل ہے اور پھر خوف سے خشوع پیدا ہو گا۔

چوتھا سبب خشوع کے پیدا ہونے کا یہ ہے (اور یہ کتابوں وغیرہ سے بھی فراغت کے بعد ضروری ہے) کہ اگر ظاہری علم کے حاصل کرنے میں دس سال

ختم کیے ہیں تو باطن کی درستی میں فی سال ایک مہینہ ہی خرچ کر دیجئے یعنی کم از کم دس مہینے ہی کسی کامل بزرگ کی صحبت میں خرچ کیجیے اور اس کے ارشاد کے مطابق عمل کیجیے۔ خداوند کریم کی عادت ہے کہ اس کی برکت سے خشوع کی دولت عطا فرماتے ہیں۔

اعمال میں خشوع حاصل کرنے کا طریقہ

خشوع کے لیے عمل کی ابتدا میں توجہ کافی ہے ہر ہر لفظ پر ضروری نہیں مثلاً قرآن مجید کی تلاوت سے پہلے یہ خیال کریں کہ محض اللہ تعالیٰ کیلئے تلاوت کرتا ہوں یہ کافی ہے۔ ہر ہر حرف پر ایسی توجہ ضروری نہیں کیونکہ یہ حاصل نہیں ہوسکتا مگر اس میں یہ قید بھی ہے کہ جب تک اس کی مخالف بات کی طرف توجہ نہ ہو اس وقت تک اسی پہلے توجہ کو حکماً باقی سمجھا جائے گا جیسا کہ انسان چلنے سے پہلے یہ ارادہ دل میں کر لے کہ جامع مسجد کی طرف چلتا ہوں بس اتنا کافی ہے، ہر ہر قدم پر یہ ارادہ ضروری نہیں ورنہ چلنا دشوار ہو جائے گا۔ ہاں اگر کسی دوسری جانب ایسی توجہ جو اس توجہ کے خلاف ہو، پائی جائے تو پھر پہلی توجہ ختم سمجھ کر نئے سرے سے اپنے ارادہ کی تجدید کی جائے گی۔

طبعیت کو مجبور کرنے سے اعمال مثلاً نماز میں خشوع حاصل ہوتا ہے اور انسان اسی کا مکلف ہے۔ طبعیت کو مجبور کرنا مجاہدہ ہوتا ہے اور مجاہدے کے ساتھ عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک بغیر مجاہدے کے عمل سے افضل ہے جو زیادہ مفید ہے۔ اگر غفلت سے اِدھر اُدھر کے پریشان خیالات موجود ہوں تو پھر بہ تکلف نماز کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اور یہی مجاہدہ جاری رہے گا۔ اگر کوئی چاہتا ہے کہ یہ سب کچھ خودبخود ہونے لگے تو یہ مطلوب نہیں چنانچہ حدیث میں ہے۔ "وَالَّذِی يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَيَتَتَعْتَعُ فِيهِ وَهُوَ عَلَيْهِ شَاقٌّ لَهُ أَجْرَانِ" (المسلم:224) جو شخص قرآن شریف پڑھنے میں رکتا ہے اور اس پر دشوار بھی ہے تو اس کو دوہرا ثواب ہو گا۔ (یعنی ایک ثواب تو پڑھنے کا اور دوسرا محنت اور مجاہدہ کا۔ اس سے ان لوگوں کی پریشانی دور ہونی چاہیے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں کوشش سے نماز میں خشوع قائم

رکھنا ہوتا ہے اور ہمیں خود بخود خشوع حاصل نہیں ہے۔

خشوع کو حاصل کرنے کا آسان طریقہ

پہلا یہ کہ پختہ حافظوں کی طرح نہ پڑھا کریں بلکہ ایسے ناظرہ خواں یا حافظ کی طرح جس کا قرآن کچا ہو پڑھیں، تو جس طرح ایسا ناظرہ خواں یا حافظ ہر لفظ کو دیکھ کر یا سوچ کر ادا کرتا ہے اور لفظ لفظ پر دھیان کر کے پڑھتا ہے اسی طرح نماز میں ہر ہر لفظ پر مستقل توجہ اور ارادہ کیا کریں اور جو قول و فعل نماز میں صادر ہو وہ توجہ اور قصد سے ہونا چاہیے۔ محض مشق اور یاد سے نہ ہو مثلاً زبان سے "سبحنك اللّٰھم" کہا تو اس کی طرف مستقل توجہ ہو کہ میں زبان سے کہہ رہا ہوں پھر "وبحمدك" کہا تو اسی طرح اس کی طرف توجہ اور قصد ہو اسی طرح آخر نماز تک۔ پس اس طرح کرنے سے برابر پوری نماز میں توجہ طاعت کی طرف رہے گی اور ایک طرف جب توجہ ہوتی ہے تو دوسری طرف نہیں ہوتی پس یقیناً اس سے غیر صلوٰۃ کی طرف توجہ نہ ہوگی پس حضورِ کامل میسر ہوگا اور حضور کے لیے اعضاء کو مطلوبہ حالت میں رکھنے کی ضرورت ہے ورنہ چہرہ پھیرنے سے نظر جب بھٹکے گی تو خیالات منتشر ہوں گے۔

آسان طریقہ

یہ تصور رکھیں کہ میں خداوند کریم کے سامنے ہوں اور خداوند کریم سن اور دیکھ رہے ہیں۔ لقاء رب اور رجوع الی اللہ کا استحضار کریں اس طریقہ سے خشوع جلد حاصل ہو جائے گا۔

1.1.2.22... تبلیغ

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ "وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ" اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے کہ اور لوگوں کو بھی خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک کاموں کے کرنے کو کہا کریں اور برے کاموں سے روکا کریں اور ایسے لوگ

آخرت میں ثواب سے پورے کامیاب ہوں گے۔ (آلِ عمران:104) اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ "مُرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ" [أخرجه ابن ماجه، 2/1327 برقم:4004، وأحمد في المسند، 6/159 برقم:25294] امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے رہو۔

تبلیغ کی حقیقت

امر بالمعروف یقینا واجب ہے کہ یہ خدا کا حکم ہے اور حکم سب کو عام ہے مگر اس میں ایک تفصیل ہے۔ وہ یہ کہ اس کی دو قسمیں ہیں ایک خطابِ عام اور دوسرا خطابِ خاص۔ تبلیغ خاص تو ہر جگہ اور ہر شخص پر ہے، یہ کسی فرد بشر سے ساقط نہیں ہوتی اور امر بالمعروف (تبلیغ) عام یعنی وعظ کہنا یہ سب کے ذمہ فرض نہیں بلکہ یہ صرف علماء پر واجب ہے مگر عوام مسلمین کے ذمہ سفر خرچ و دیگر اسباب کا مہیا کرنا ہے اور امر بالمعروف کا مدار قدرت پر ہے یعنی جس کو جس کسی پر جتنی قدرت ہے اس کے ذمہ اتنی تبلیغ واجب ہے مثلاً ماں باپ کے ذمہ واجب ہے کہ اپنی اولاد کو نماز، روزہ اور دیگر ضروریاتِ دین کی نصیحت کریں، خاوند پر فرض ہے کہ اپنی بیوی کو احکام شرعیہ پر مجبور کرے آقا کے لیے لازم ہے کہ اپنے نوکر چاکر اور جو ان کے ماتحت ہیں ان کو امر بالمعروف کرے۔

حدیث شریف میں ہے۔ "مُروا صبیانکم بالصلوٰۃ اِذا بلغوا سبعاً واضربوھم اِذا بلغوا عشرا" (مسند أحمد:6689) تم اپنے بچوں کو نماز پڑھنے کا امر کرو جب کہ ان کی عمر سات سال ہو اور دس سال کی عمر میں مار کر پڑھاؤ۔ غرض ہر شخص پر واجب ہے کہ اپنے ماتحتوں کو اُمورِ خیر کا حکم کرے اور خلاف شرع باتوں سے روکے۔ "اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِيْ الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَأَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ" یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دے دیں تو یہ لوگ خود بھی نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور دوسروں کو بھی نیک کاموں کے کرنے کو کہیں اور برے کاموں سے منع کریں۔ (الحج:41) ان سب کا نچوڑ یہ ہوا کہ جو شخص امر بالمعروف و نہی عن

المنکر پر قادر ہے یعنی قرائن سے غالب گمان رکھتا ہو کہ اگر امر و نہی کروں گا تو مجھ کو کوئی قابلِ اعتبار نقصان لاحق نہیں ہو گا اس کے لئے اُمورِ واجبہ میں امر و نہی کرنا واجب ہو گا اور اُمور مستحبہ میں مستحب مثلاً نماز پنجگانہ فرض ہے تو ایسے شخص پر واجب ہو گا کہ بے نماز کو نصیحت کرے۔ اور نوافل مستحب ہیں ان کی نصیحت کرنا مستحب ہو گا۔ جو شخص کسی وجہ سے تبلیغ پر قادر نہ ہو اس پر اُمورِ واجبہ میں بھی تبلیغ کرنا واجب نہیں۔ اس کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ تارکِ اُمورِ واجبہ کو دل سے برا سمجھے البتہ اگر ہمت کرے گا تو ثواب ملے گا۔ پھر جس پر تبلیغ واجب ہے تو اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر ہاتھ سے قدرت ہے تو ہاتھ سے تبلیغ واجب اور اگر زبان سے ہے تو زبان سے تبلیغ واجب ہے۔

ہاتھ سے تبلیغ کی اجازت صرف حکام کو ہے عوام کو نہیں کیونکہ اس میں فتنہ کا احتمال ہے پس اس سے فساد ہو سکتا ہے جبکہ تبلیغ کا مقصد اصلاح ہے فساد نہیں لیکن حکومت کی بھی قسمیں ہیں۔ باپ کو بیٹے پر اور شوہر کو بیوی پر حکومت حاصل ہے اس لئے یہاں اگر ہاتھ سے تبلیغ ممکن ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

ترمذی شریف میں آیا ہے کہ "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم معروف (بھلائی) کا حکم دو اور منکر (برائی) سے روکو، ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنا عذاب بھیج دے پھر تم اللہ سے دعا کرو اور تمہاری دعا قبول نہ کی جائے"۔ نیز ابوداود شریف کی روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسی میں ابوبکر صدیقؓ کا ارشاد مبارک ہے کہ میں نے آپ ﷺ سے سنا ہے کہ جب لوگ ظالم کو دیکھ کر اس کا ہاتھ نہ پکڑیں (یعنی ظلم نہ روک دیں) تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا عذاب لوگوں پر عام کر دے۔

تبلیغ کے آداب اور شرائط

(1) جس چیز کی تبلیغ کرنا ہو اس کے احکامات تفصیل سے معلوم ہوں۔

(2) اپنے نفس کو خوش کرنے کے لئے نصیحت نہ ہو بلکہ اس سے مقصود صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہو۔

(3) نصیحت کرتے ہوئے طریقہ مشفقانہ ہو۔

(4) تبلیغ کے وقت صرف تبلیغ ہی کو مقصود سمجھے۔ ثمرات پر نظر نہ رکھے کیونکہ ان کا حصول غیر اختیاری ہے اور غیر اختیاری میں کاوش کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

(5) وعظ میں کسی کو نشانہ نہ بنائے بلکہ سب کو مخاطب کرے۔

(6) واعظ ہدایا وغیرہ لینے سے اجتناب کرے تاکہ بے لوث رہے اس سے کام میں برکت ہوتی ہے۔

(7) کسی بھی شخص کی مجمع عام میں اصلاح نہ کی جائے کیونکہ اس سے اس کو واعظ سے بغض ہوسکتا ہے جس سے وہ ضد میں آکر مزید بگڑ سکتا ہے۔

(8) واعظ کے لئے سختی اور درشتی کا طریقہ مناسب نہیں بلکہ جتنی شفقت اور نرمی ہوگی فائدہ ہوگا۔ اس پر بھی مخالفت ہو تو تحمل کرے۔ طاقت نہ ہو تو خطابِ خاص کی بجائے صرف خطابِ عام پر اکتفا کرے۔

تبلیغ کا طریقہ

"اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُم بِالَّتِیْ ھِیَ أَحْسَنُ" حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے محمد ﷺ آپ لوگوں کو سبیل رب کی طرف حکمت اور مواعظ حسنہ کے ساتھ بلایئے اور اگر مجادلہ کی ضرورت ہو تو ان سے مجادلہ بھی کیجئے (مگر) یہ احسن طریقہ سے ہو۔ (النحل:125)

سبیلِ رب سے مراد اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ ہے جو کہ ازروئے حدیث شریف صرف اسلام ہے پس اس کی طرف بلانے کا آپ ﷺ کو حکم ہوا۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے تین چیزیں بتائیں۔

(1) حکمت کے ساتھ دعوت

(2) دعوت بالموعظۃ الحسنہ

(3) اچھے طریقے سے مجادلہ

گفتگو میں دو چیزیں ہوتی ہیں ایک اپنے دعویٰ پر دلائل قائم کرنا اور دوسرا

مخاطب کے دلائل کا توڑ اور ابطال۔ پہلے کو دعوت بالحکمت کہیں گے اور دوسرے کو مجادلہ۔ اب ایک تو ضابطے کے طور پر بتانا ہے جیسا کہ ڈھنڈورچی بادشاہ وقت کا حکم لوگوں تک پہنچاتا ہے کہ اس کا اس کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہوتا کہ کون اس پر عمل کرتا ہے کون نہیں اور ایک باپ کا بیٹے کو سمجھانا ہے کہ اس میں غایت شفقت ہوتی ہے اور ایسے طریقے سے بات کی جاتی ہے کہ بیٹا کسی طریقے سے مان لے۔ اس کے لئے چاہے اس کو کتنی تکلیف اٹھانی پڑے لیکن اس کو سمجھا کر چھوڑتا ہے کیونکہ باپ اس کو برداشت نہیں کرسکتا کہ اس کا بیٹا خیر سے محروم ہو جائے۔ یہی موعظۃ الحسنہ کا اصل ہے کہ واعظ ایسے طریقے سے بات کرے کہ مخاطبین کا دل پگھل جائے اور عمل کے لئے تیار ہو جائیں۔ وہ ضابطے کی خانہ پری نہیں کرتا۔ یہی انبیاء علیہم السلام کا طریقہ ہے جیسا کہ آپ ﷺ کو ارشاد ہوا تھا آپ ﷺ نے بھی تمام زندگی اس پر عمل کرنے کا حق ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی تمام زندگی اس طرح کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس کے لئے ہر واعظ کو عافیت کے ساتھ لمبی عمر، صحیح فہم اور صحیح نیت نصیب فرمائے۔ آمین۔ ثم آمین۔

حاصل کرنے کا طریقہ

فضائل تبلیغ اور اس کے چھوڑنے کے مواعید میں غور کرنا اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے مانگنا اس کا طریقہ ہے۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے اس نعمت سے سرفراز کیا ہو ان کی مجالس میں شرکت بھی اس کے حاصل کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔

ہماری تبلیغی جماعت

موجودہ تبلیغی جماعت چونکہ اہلِ حق کی کوششوں سے وجود میں آئی ہے اور اس کے لئے اہلِ خیر نے بہت دعائیں کی ہیں اور اب بھی کرتے ہیں اس لئے اس میں خیر کا پہلو غالب ہے اس لئے ان کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے، تاہم جیسا کہ انبیاء کے تشریف لے جانے کے بعد ان کے ماننے والوں نے انبیاء کی تعلیم کی جب حفاظت نہیں کی تو گمراہ ہوگئے اس لئے جو اصول اکابر چھوڑ چکے ہیں ان

پر جب تک ہم قائم رہیں گے تو اللہ تعالیٰ کی مدد ہمارے ساتھ شاملِ حال رہے گی اور اگر ان پر عمل چھوڑ دیں تو پھر خطرہ ہے کہ خیر ہم سے اٹھ نہ جائے۔ اس لئے ہمیں اپنی جماعت میں مندرجہ ذیل کمزوریوں کی اصلاح کا جلد سے جلد بندوبست کرنا چاہیے۔

(1) علماءِ حق کے ساتھ ہمارا ٹکراؤ نہ ہو بلکہ ہمیں اپنے آپ کو ان کا خادم سمجھنا چاہیے اور جو کچھ ہم کسی سے سنیں تو ان سے اس کی تصدیق کرواتے رہیں کہ وہ ٹھیک ہے یا غلط تاکہ کہیں ناسمجھی سے ہم غلط باتوں کی تشہیر نہ کر رہے ہوں۔

(2) ہمارے اکابر یعنی مولانا الیاسؒ، حضرت شیخ الحدیثؒ کی جیسی فکر تھی ہمیں اپنے مشائخ کے ساتھ اپنی انفرادی اصلاح کے لئے تعلق رکھنا چاہیے اور ان سے اپنی اصلاح کروانی چاہیے کیونکہ اپنی اصلاح فرضِ عین ہے اور دوسروں کی اصلاح فرضِ کفایہ۔

(3) صرف اپنی جماعت کو خیر پر نہ سمجھیں بلکہ اہلِ حق کے جتنے کام ہیں ان سب کو حق پر سمجھتے ہوئے اپنا کام سمجھیں اور ان کے ساتھ نہ صرف یہ کہ توڑ نہ ہو بلکہ ان کے لئے دل سے دعائیں کریں۔

(4) جو فضائل دین کے دوسرے کاموں کے لئے احادیثِ شریفہ میں وارد ہوں اور جماعت کے اکابر نے تاویل کے ساتھ ان کو تبلیغ کے کسی جزو کے لئے ثابت کئے ہوں تو ان کو بیان تو بے شک کیا جائے لیکن جن کاموں کے لئے یہ اصلاً ثابت ہوں ان سے ہم کسی طرح انکار نہ کریں کیونکہ یہ حدیث شریف کے معنوی تحریف میں آسکتا ہے جس سے ہم حق سے دور جاسکتے ہیں۔

مثلاً ہم اگر ایک دن اور ایک رات تبلیغ میں لگانے والے کے لئے یہ اجر بتاتے ہیں کہ اس کا اتنا اجر ہے کہ یہ دنیا اور مافیھا سے بہتر ہے۔ یہ فضیلت اصل میں اس حدیث شریف سے لی گئی ہے جو جہاد کی فضیلت میں انسؓ بن مالک سے

مروی ہے جس میں جہاد میں ایک دن اور ایک رات پہرہ دینے والے کے لئے یہ فرمایا کہ وہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ اس کے لئے ہمارے بڑوں نے تبلیغ میں وقت لگانے کو پہلے جہاد فی سبیل اللہ قرار دیا۔ پھر اس میں ایک دن اور ایک رات لگانے کو جہاد میں پہرہ دینے کا مشابہ قرار دیا اور پھر اس پر اس فضیلت کو قیاس کیا۔ یہاں پر اس قیاس کی نفی مراد ہرگز نہیں۔ اس پر قیاس کرنا ممکن ہے تبھی اکابر نے ایسا کیا کیونکہ فضیلت کے لئے ضعیف استدلال بھی کافی ہوسکتا ہے لیکن اگر اس فضیلت کا اصلی جہاد فی سبیل اللہ میں پہرہ دینے کے لئے ہونے سے ہم نے انکار کیا تو یہ بلاشبہ اس حدیث شریف کی معنوی تحریف قرار پائے گی۔ اس طرح ہمارے ساتھی جب گشت میں چلنے والے حضرات کے لئے یہ فضیلت بیان کرتے ہیں کہ گشت میں جانے والوں کے راستے میں فرشتے پر بچھاتے ہیں۔ اس فضیلت کی اصل وہ حدیث شریف ہے جس میں طالبعلم کے راستے میں فرشتوں کے پر بچھانے کی فضیلت مذکور ہے۔ اس طرح ہمارے ساتھی اپنے بیان کے لئے جمع ہونے والوں کے لئے اس فضیلت کو ثابت کرتے ہیں جس میں ذکر کرنے والوں کے بارے میں ذکر ہے کہ ان کے اردگرد فرشتے جمع ہوتے ہیں اور وہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے دربار میں ان لوگوں کا تذکرہ کرتے ہیں جس میں آخر میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ ایسے لوگ ہیں جن کے ساتھ بیٹھنے والے بھی محروم نہیں۔ تو بیان کے لئے اس فضیلت کو بیان کرنا جائز ہے لیکن ذکر کے حلقوں سے اس کی اگر ہم نفی کریں تو یہ حدیث شریف کی معنوی تحریف کے زمرے میں آئے گا۔

1.1.2.23... تفکر

"اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ" اس میں نشانی ہے فکر کرنے والوں کے لئے۔ (النحل:69) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "فاٰثروا مایبقی علیٰ ما یفنی" (مسند أحمد:19698) پس باقی رہنے والی چیزوں کو فانی چیزوں پر ترجیح دو۔

حقیقتِ فکر

دو معلوم چیزوں کو ذہن میں حاضر کر کے اس سے تیسری بات اخذ کرنا تفکر کہلاتا ہے مثلاً یہ کہ آخرت باقی ہے اور یہ کہ دنیا فانی ہے اس سے یہ بات ذہن میں آئی کہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دینی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّأُولِی الْأَلْبَابِ، الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ بلاشبہ آسمانوں اور زمینوں کے بنانے اور یکے بعد دیگرے رات دن کے آنے جانے میں اہلِ عقل کے لئے دلائل ہیں جن کی حالت یہ ہے کہ وہ لوگ (ہر حال میں دل سے بھی اور زبان سے بھی) کھڑے بھی، بیٹھے بھی، لیٹے بھی اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور آسمان اور زمین کے پیدا ہونے میں غور و فکر کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے اس (مخلوق) کو لایعنی پیدا نہیں کیا (بلکہ اس میں حکمتیں رکھی ہیں) ہم آپ کو منزہ اور پاک سمجھتے ہیں سو ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا لیجئے۔ (آلِ عمران:191-190)

ان آیاتِ مبارکہ اور احادیثِ شریفہ سے بالکل یہ واضح ہوتا ہے کہ مخلوقات اور مختلف واقعات میں غور کر کے اس سے صحیح نتیجے تک پہنچنے کا کام لینا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور آخرت کے یقینی ہونے کا ادراک کر کے اللہ تعالیٰ سے اپنے لئے بخشش طلب کرنی چاہیے۔ ان فانی نعمتوں کی ان باقی نعمتوں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں اس لئے ہمیں ان باقی نعمتوں کی طلب میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مانگنا تو سب کچھ اللہ سے ہی ہے کہ وہی کارساز ہے اس لئے اس دنیا کی ضروریات بھی اللہ سے ہی مانگنی چاہییں۔ یہاں اس سے مطلب صرف یہ ہے کہ باقی کو فانی پر ترجیح دینی چاہیے۔ آپ ﷺ اسی لئے دائم الفکر رہتے تھے اور آپ ﷺ کا بڑا ہنسنا بس تبسم ہوتا تھا۔ کبھی بھی کھل کر نہ ہنستے تھے اور یہ بھی آپ ﷺ کا ہی حوصلہ تھا ورنہ جو احوالِ شدیدہ آپ ﷺ

کے سامنے تھے ان کی وجہ سے تو شاید تبسم بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ مجھے جو معلوم ہے اگر آپ کو معلوم ہو جائے تو بہت کم ہنستے اور زیادہ رویا کرتے۔

تفکر کی ضرورت

"عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: لَاخَيْرَ فِيْ قِرَاءَةٍ لَيْسَ فِيْهَا تَدَبُّرٌ، وَلَا عِبَادَةَ فِيْهَا فِقْهٌ" (جامع بيان العلم وفضله:1550) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ارشاد فرمایا۔ (معتد بہ) نفع نہیں ایسے قرآن مجید پڑھنے میں جس میں فکر نہ ہو اور ایسی عبادت میں جس میں معرفت نہ ہو۔ صوفیاء کے طریق کا مدار اعظم یہی فکر ہے لہٰذا خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اکابر کو بھی اپنے حال سے فارغ نہیں بیٹھنا چاہیے بلکہ اپنا محاسبہ کر کے تغیر حال کی فکر کرنی چاہیے۔ فکر کی وجہ سے راستے خودبخود منکشف ہوجاتے ہیں۔ سوچنے کی مثال حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے گھڑی کی بال کمانی سے دی ہے کہ ہے تو مختصر سی لیکن تمام پرزوں کی حرکت اسی سے ہوتی ہے۔ اس طرح سوچنے سے دین کے قلعے فتح ہوتے ہیں۔ سارا قرآن فکر کی تاکید سے بھرا ہوا ہے۔

ایک جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ" یعنی اللہ تعالیٰ یہ احکام اس لئے کھول کھول کر بیان کر رہے ہیں تاکہ تم دنیا اور آخرت میں موازنہ کرنے کے لئے فکر کرو۔ (البقرة:219) اہل اللہ نے دنیا کی حقیقت میں فکر کر کے ہی آخرت کی حقیقت کو سمجھا ہے اس لئے دنیا سے نفرت کرتے ہیں۔

فکر کا طریقہ

نورِ ایمان یعنی جن پر ایمان ہے پر یقین کو کامل کرنے کا طریقہ ذکر فکر ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔ "وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ" (الحشر:18) یعنی اپنے اعمال کا محاسبہ کرتا رہے کہ آج دن میں کتنے نیک کام کئے۔ جو نیک کام ہوئے

ہیں ان پر خدا کا شکر کرے اور جو گناہ ہوئے ان پر توبہ استغفار کرے۔ جو بات کہے سوچ کر کہے اور جو کام کرے پہلے سے اس کا انجام سوچ لے۔ مراقبات کر کے بالخصوص مراقبہ موت اور اگر موت کی سوچ سے دل گھبرائے تو پھر مراقبہ حیات یعنی آخرت کی حیات کا مراقبہ کرے کہ وہاں کیسی کیسی لذتیں ہیں اور ان لذتوں کے حصول کا طریقہ یہ کہ ہم اللہ کو راضی کریں اور اس کی ناراضگی سے بچیں۔ اس سے اعمال کی لالچ پیدا ہوگی اور اعمال کی توفیق نصیب ہوگی۔

حاصل کرنے کا طریقہ

دونوں چیزوں یعنی آخرت اور دنیا کی حقیقت کا ذہن میں رکھ کر اس میں غور کرنا ہی اس کا طریقہ ہے۔

1.1.2.24... تقویٰ

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ" اے ایمان والو خدا سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔ (التوبة:119) اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "التَّقْوَى هَاهُنَا وَيُشِيرُ إِلَى صَدْرِهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ" (صحیح مسلم: كِتَابُ الْبِرِّ وَالصِّلَةِ وَالْآدَابِ) کہ تقویٰ اس جگہ ہے اور آپ نے اپنے قلب کی طرف تین بار اشارہ کیا۔

حقیقتِ تقویٰ

تقویٰ کا حکم اور فضیلت قرآن مجید میں جس قدر ہے غالباً کسی چیز کا اتنا نہیں ہے اس سے اس کا مہتم بالشان ہونا معلوم ہوا ہے۔ حقیقت اس کی یہ ہے کہ تقوٰی کا استعمال شریعت میں دو معنی میں ہوتا ہے ایک ڈرنا دوسرا بچنا۔ اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصود تو معاصی سے بچنا ہی ہے مگر سبب اس کا ڈرنا ہی ہے کیونکہ جب کسی چیز کا خوف دل میں ہوتا ہے تو پھر اس سے بچا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اول جب "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ" اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو جیسا اس سے ڈرنا چاہیے۔

(آلِ عمران:102) کا نزول ہو تو اس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ڈر گئے کیونکہ وہ یہ سمجھے کہ آج ہی حقِ تقوٰی لازم ہوگیا حالانکہ شروع ہی سے تقویٰ کا حصول دشوار ہے۔ حقِ تقوٰی کا معنی ایک تو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی شان کے لائق جیسا تقویٰ ہے وہ اختیار کرو سو آیت میں یہ مراد نہیں کیونکہ یہ تو بشر کی طاقت سے خارج ہے اور جو چیز تحمل سے باہر ہو، اللہ تعالیٰ اس کا کسی کو مکلف نہیں بناتا اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ انسان کی وسعت کے موافق جو تقوٰی خدا کی شان کے لائق ہے اس کو بجا لاؤ۔ آیت میں یہی معنی مراد ہیں۔ ابتدا ہی سے انسان کا اس درجہ میں پہنچ جانا دشوار ضرور ہے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس آیت کو اس کے فوری حصول کا حکم سمجھا اور پھر یہ خوف ہوا کہ حقِ تقوٰی کا آج ہی سے حاصل ہونا تو بڑا دشوار ہے پھر اس حکم کی تعمیل کیونکر ہو اس پر دوسری آیت نازل ہوئی "فَاتَّقُوْا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ" پس جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرو۔ (التغابن:16) یعنی جتنا تقویٰ تم سے اس وقت ہوسکتا ہے اس وقت تو اس کو اختیار کرو پھر ترقی کرتے رہو یہاں تک کہ حقِ تقویٰ حاصل ہو جائے اس آیت نے پہلی آیت کی تفسیر کر دی۔

تقوٰی کے مختلف درجے ہیں ایک درجہ یہ ہے کہ کفر اور شرک سے بچے دوسرا درجہ یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ کو ترک نہ کرے اور محرمات کا ارتکاب نہ کرے پھر جیسے جیسے اعمال ہونگے ویسا ہی تقوٰی پیدا ہوتا رہے گا اور اس تقوٰی کے کمال سے ایمان بھی کامل ہوتا رہے گا حتیٰ کہ درجہ احسان حاصل ہو جائے گا جو کہ ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے اور یہی تقوٰی کا بھی اعلیٰ درجہ ہے اور یہی درجہ مطلوب ہے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ "لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَأْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَأْسِ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ" کچھ سارا کمال اسی میں (نہیں آگیا) کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرلو یا مغرب کو کرلو لیکن (اصل) کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ (کی ذات وصفات)

پر یقین رکھے اور اسی طرح قیامت کے دن (آنے) پر (بھی) اور فرشتوں (کے وجود) پر (بھی) اور اللہ کی کتاب پر اور سب پیغمبروں پر بھی اور وہ شخص مال دیتا ہو۔ اللہ کی محبت میں اپنے (حاجتمند) اور رشتہ داروں کو اور (نادار) یتیموں کو بھی اور بے خرچ مسافروں کو بھی اور (لاچاری) میں بھی سوال کرنے والوں کو (قیدی اور غلاموں کی) گردن چھڑانے میں (بھی مال خرچ کرتا ہو) اور وہ شخص نماز کی پابندی بھی رکھتا ہو اور (مقررہ) زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو اور جو اشخاص (کہ ان عقائد اور اعمال کے ساتھ یہ اخلاق رکھتے ہوں کہ) اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب (کسی جائز امر کا) عہد کرلیں اور (اس صفت کو خصوصیت کے ساتھ کہوں گا کہ) وہ لوگ ان مواقع میں مستقل مزاج رہنے والے ہوں ایک تو تنگدستی میں اور دوسرے بیماری اور تیسرے معرکہ قتال کفار میں یعنی کم ہمت اور پریشان نہ ہوں بس یہ لوگ ہیں جو سچے (کمال کے ساتھ موصوف) ہیں اور یہی لوگ ہیں جو سچے متقی ہیں۔ (البقرۃ:177)

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں تقویٰ کے سارے شعبوں کو جمع فرمایا ہے۔ اس میں بالکل ابتدا میں یہ فرمایا کہ دین سارے کا سارا صرف اس میں نہیں کہ نماز میں کس سمت کو منہ کرنا ہے بلکہ یہ تو اس کا ایک جزو ہے جس کا تعلق نماز کے ساتھ ہے ورنہ اگر نماز نہ ہوتی تو کسی خاص سمت کو منہ کرنا بھی عبادت نہ ہوتا۔ اس کے بعد باقی تمام ابوابِ تقویٰ کو اجمالاً بیان کر دیا ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ پر ایمان، ملائکہ پر ایمان، آسمانی کتابوں اور تمام انبیاء پر ایمان کا حکم ہے یہ تو عقائد کے متعلق ہے پھر اللہ تعالیٰ کی محبت میں مال کو مستحق لوگوں پر خرچ کرنے کا فرمایا جس سے حبِ مال کا علاج انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے ہوتا ہے۔ یہ دل کی اصلاح کے متعلق ہے پھر نماز کو قائم کرنے کا امر ہے جو بدنی اطاعت ہے پھر زکوٰۃ دینے کا ہے یہ مالی اطاعت ہے اس کے بعد وعدے کو پورا کرنے کا امر ہے جو معاشرت کے متعلق ہے پھر صبر کا امر ہے جو سلوک کے متعلق ہے غرض اس میں تمام تقویٰ کے شعبوں کو اجمالا جمع کردیا ہے اسی لیے "أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ" پر اس کو ختم کردیا ہے۔

اعمال تین قسم کے ہیں

ایک وہ جو دین میں نافع ہیں ان کو تو کرنے کا حکم ہے چاہے فرض ہوں یا واجب کے درجہ میں ہوں یا سنت کے درجہ میں، اور بعض وہ ہیں جو دین میں مضر ہیں۔ ان کو چھوڑنے کا حکم ہے خواہ حرام کے درجہ میں ہوں یا مکروہ کے درجہ میں، اور بعض وہ ہیں کہ جن کے کرنے کا حکم ہے نہ چھوڑنے کا، یہ مباحات ہوتے ہیں۔ مباحات اپنے اثر کے لحاظ سے یا تو وہ دین کے لیے مفید ہیں جیسے حفظانِ صحت کے لئے چلنا پھرنا وغیرہ یا مفید نہیں پس جو دین میں مفید ہیں تو ان کو تو کرنا چاہیئے گو کہ یہ واجب نہیں ہوں گے البتہ جب مباح جب دین میں مفید ہو اور اس کو اچھی نیت سے کیا جائے تو وہ مستحب ضرور ہوتا ہے اور اس میں ثواب بھی ملتا ہے اور وہ مباحات جو دین میں مفید نہیں تو وہ فضول ہیں اور فضولیات کا ترک کردینا شرعاً مطلوب ہے چنانچہ حدیث میں ہے "مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَالَا يَعْنِيهِ" (ریاض الصالحین) یعنی اسلام کی خوبی اور کمال یہ ہے کہ لایعنی کو ترک کر دیا جائے جب فضولیات کے ترک کو حسنِ اسلام میں دخل ہے اور حسنِ اسلام مامور بہ اور مطلوب ہے تو ان فضولیات کا ترک بھی مامور بہ ہوگیا۔ گو ان کو حرام نہیں کہا جائے گا لیکن فضولیات میں مشغولی کراہت سے خالی نہیں ہوگی پس جس طرح حرام اور مکروہ سے بچنا ضروری ہے اسی طرح فضولیات سے بچنا بھی ضروری ہے غرض یہ ہے کہ بے ضرورت مباحات میں مشغول ہونا بھی برا ہے اور ضرورت کے وقت مشغول نہ ہونا بھی برا ہے۔

بعض لوگ اسلام سے پہلے احرام حج میں اگر کسی ضرورت سے گھر جانا چاہتے تو دروازہ سے جانا ممنوع سمجھتے تھے اس لیے پشت کی دیوار میں نقب دے کر اس سے اندر جاتے تھے اور اس عمل کو فضیلت گردانتے تھے حق تعالیٰ اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں۔ "وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ أَبْوَابِهَا وَاتَّقُوْا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ" اس میں کوئی فضلیت نہیں کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آیا کرو، ہاں فضیلت یہ

ہے کہ حرام (چیزوں) سے بچے (چونکہ دروازوں سے گھروں میں آنا حرام نہیں اس لیے اس سے بچنا بھی ضروری نہیں سو اگر آنا چاہو تو) گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور (اصل الاصول تو یہ ہے کہ) خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو اس سے البتہ امید ہے کہ تم (دارین میں) کامیاب ہوجاؤ۔ (البقرة:189)

اس آیت سے ایک بڑے کام کی بات معلوم ہوئی امت کہ جو شے شرعاً مباح ہو اس کو طاعت و عبادت اعتقاد کر لینا اسی طرح اس کو معصیت اور محل ملامت اعتقاد کر لینا شرعاً قابلِ مذمت ہے چنانچہ گھروں میں دروازوں سے آنا مباح تھا اس کو ان لوگوں نے معصیت سمجھا تھا اور دروازہ چھوڑ کر کسی اور طرف سے آنا بھی فی نفسہٖ مباح ہے اس کو ان لوگوں نے عبادت و فضیلت سمجھا تھا اس پر حق تعالیٰ نے ان پر رد فرمایا اور ان کے اعتقاد کو باطل اور مخالف تقوٰی کے ٹھہرایا اور تقوٰی کو واجب فرمایا تو جس چیز سے واجب کا ترک اور خلاف لازم آئے گا وہ ضرور گناہ ہوگی پس ان کے یہ دونوں اعتقاد گناہ ہوئے اس قاعدہ سے ہزاروں اعمال کا حکم معلوم ہوگیا جو کہ عوام بلکہ خواص میں بھی شائع ہیں۔ نیز خیال رہے کہ ہر شے اور اعضاء کا تقوٰی ہے آنکھ کا تقوٰی یہ ہے کہ بری نگاہ سے کسی عورت یا مرد کو نہ دیکھے، زبان کا تقوٰی یہ ہے کہ کسی کی غیبت نہ کرے جھوٹ نہ بولے کسی کو ستائے نہیں، اسی طرح ہاتھ کا تقوٰی ہے کہ کسی پر ظلم نہ کرے شہوت سے مس نہ کرے، پاؤں کا تقوٰی یہ ہے کہ بری جگہ چل کر نہ جائے، کان کا تقوٰی یہ کہ کسی کی غیبت نہ سنے راگ باجے سے بچے۔ وضع میں بھی تقوٰی ہے کہ خلاف شریعت وضع نہ رکھے پیٹ کا تقویٰ یہ ہے کہ حرام مال نہ کھائے وغیرہ۔

حاصل یہ ہے کہ صادق اور متقی یہی لوگ ہیں جن کے یہ اوصاف ہیں جو مذکور ہوئے اور ان اوصاف میں تمام اجزاء دین کا ذکر اجمالاً آگیا دین کا کوئی جزو اس سے باقی نہیں رہا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ متقی وہی ہے جو دین میں کامل ہو ظاہر میں بھی باطن میں بھی لیکن یہ حاصل ہوتا دل کے ایک عمل سے جو کہ اللہ سے ڈر ہے کہ وہ ناراض نہ ہوجائے۔

حاصل کرنے کا طریقہ

اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت پیدا کی جائے اور پھر یہ سوچا جائے کہ میرا کوئی قول اور فعل اس کو ناپسند تو نہیں۔ یا یہ سوچے کہ کیا میں اپنے اعمال کے ساتھ اللہ کے حضور پیش ہو سکتا ہوں پس جس جس چیز میں کوئی مسئلہ محسوس ہو اگر ظاہر سے متعلق ہو تو علماء کرام سے اس کی تحقیق کرے اور باطن سے متعلق ہے تو اپنے شیخ سے یا جس کو اپنے باطن کا راہبر بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قہر و عتاب کی آیتیں پڑھ کر ان چیزوں سے بچنا چاہیئے جو اس عتاب کی وجہ بن سکتی ہیں۔ اہلِ تقویٰ کی صحبت اس میں اکثیر کا کام دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حقیقی تقویٰ نصیب فرمائے۔

1.2... اعمال کے ثمرات (نتائج)

بندے کی طرف سے۔۔۔۔۔۔ عبدیت کاملہ
اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔۔۔۔۔ رضائے الٰہی

یہی نسبت مع اللہ کے حاصل ہونے کی علامات بھی ہیں کیونکہ نسبت کے معنی تعلق کے ہیں اور تعلق دو جانب سے ہوتا ہے اور یہ نسبت مع اللہ دو باتوں پر مشتمل ہوتی ہے: بندے کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق جو کہ عبدیت کاملہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا تعلق بندے کے ساتھ جو کہ رضائے الٰہی ہے۔ حصولِ نسبت مع اللہ کو وصول الی اللہ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ بندے کے ساتھ تعلق ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا تعلق بندے کے ساتھ رضا کا ہو اور بندے کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہونے کے یہ معنی ہیں کہ دوامِ طاعت، کثرتِ ذکر مع ملکۂ یاداشت جس کی علامت یہ ہے کہ طاعات و عبادات کی طرف ایک اضطرابی رغبت ہوتی ہے اور معصیتِ ظاہری و باطنی سے ایسی نفرت ہو جیسے پیشاب پاخانہ سے ہوتی ہے اور اتباعِ سنت کا بکمال اہتمام ہو۔

اب ان دونوں کی قدرے تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

1.2.1... عبدیت کاملہ

"وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ" اور جن اور انس کو میں نے صرف اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں۔ (الذاریات:56) اس آیت کی تفسیر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے "ای لِیعرفون" منقول ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تاکہ مجھے پہچانیں۔ پہچاننے میں یہ بھی شامل ہے کہ آدمی جان لے کہ اللہ تعالیٰ کس کام سے راضی ہوتے ہیں اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا کے لئے ایک ہی راستہ بتایا ہے اور وہ آپ ﷺ کے طریقے پر چلنا ہے۔ ہم کلمہ تشہد میں اقرار کرتے ہیں کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ نہیں کوئی معبود مگر اللہ اور میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول ہیں۔ پس آپ ﷺ کی پیروی میں ہم سب اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں۔ اسی کو بندگی کہتے ہیں

جس کو عبدیت کہتے ہیں۔

جب کوئی شخص سلوک میں قدم رکھتا ہے تو اس وقت اس کے ساتھ رذائل لگے ہوتے ہیں۔ ان رذائل کو دور کرنے کے لئے وہ مجاہدات کرتا ہے، ریاضتیں کرتا ہے۔ شیخ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔ کرتے کرتے رذائل دور ہوجاتے ہیں یا ان کے دور ہونے کے سامان ہوجاتے ہیں۔ ساتھ ساتھ سالک اپنے قلب کو فضائل سے آراستہ کرتا رہتا ہے جس کے لئے ذکر، شغل اور مراقبہ جاری ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ وقت آپہنچتا ہے کہ اس کے قلب میں ایک ایسی کیفیت القاء کی جاتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے غیر مشروط طور پر سلامی ہو جاتا ہے اور اپنے نفس کی جو کجی اس حقیقت کے سمجھنے میں رکاوٹ تھی وہ نہیں رہتی اور یہ اپنے منور قلب کے نور سے اس حقیقت کا ادراک کرلیتا ہے کہ میں بندۂ ضعیف، اللہ تعالیٰ کا محض بندہ ہوں اور وہ میرا عظیم رب ہے۔ اس کو اختیار ہے کہ میرے اندر جو تصرف کرنا چاہے کرے، مجھے چوں چرا کرنے کا اختیار نہیں کہ میں غلام ہوں اور وہ میرا مالک ہے، میں نہ صرف اس کا غلام ہوں بلکہ اس کا عاشق بھی ہوں کیونکہ وہی میرا ازلی محسن ہے، ایسا کمال والا اور جمال والا ہے کہ ہر کمال والے کا کمال اس کے کمال سے اور ہر جمال والے کا جمال اس کے جمال سے ہے، اس لئے یہ سالک اپنا دل اپنے اللہ کو دے دیتا ہے اور بزبان حال کہتا ہے

تجھ پر فدا ہو جاں مری، زندہ رکھے عطا تری
دل عشق میں مبتلا ترے، دل چاہے بس رضا تری

آپ ﷺ کی دعا ہے۔ اللّٰهُمَّ رَضِّنِي بِمَاقَضَيْتَ لِي وَعَافِنِي فِيمَا أَبْقَيْتَ حَتَّى لا أُحِبَّ تَعْجِيلَ مَا أَخَّرْتَ وَلا تَأْخِيرَ مَا عَجَّلْتَ (رواه الطبراني:45886)

اس صورت میں شریعت پر عمل کرنا اس کی طبعیتِ ثانی بن جاتا ہے کیونکہ وہ ہر وقت اس تلاش میں ہوتا ہے کہ میں کس طرح اپنے مالک کو راضی کرلوں اور چونکہ اس پر یہ خوب واضح ہو چکا ہوتا ہے کہ اپنے محبوب کو راضی کرنے کا بس یہی ایک طریقہ ہے کہ اس کے احکامات پر بے چون و چرا عمل کرتا جائے اور

اسی کو شریعت کہتے ہیں اس لئے شریعت پر عمل کرنے کو وہ ہر دم تیار رہتا ہے۔ اصل میں عبدیت کے حصول میں یہی نفس ہی تو آڑ ہوتا ہے جیسے ہی نفس کی تہذیب ہوگی تو سچ سچ اور حق حق نظر آئے گا۔ بس اس کے نتیجے میں بندہ خود کو اپنے رب کا ادنیٰ غلام سمجھ لیتا ہے۔ اس میں اس کی نظر اپنے سے ہٹ کر اپنے مالک پر آجاتی ہے اور اس کی خوشنودی کے لئے کچھ بھی کرسکتا ہے چاہے اس کو کوئی جاہل کہے یا گنوار لیکن اس کے لئے سب کچھ گوارا ہوتا ہے محبوب کی ناراضگی گوارا نہیں ہوتی۔ اس کو کیفیتِ بندگی یا عبدیت کہتے ہیں۔ اسلام بھی اسی کو کہتے ہیں۔ پس کیفیتِ بندگی کا حصول اسلام کا کمال بھی ہے۔

ایسا شخص احکامات کی مصلحتوں کی کرید میں نہیں ہوتا کیونکہ اس کو ان سب کی بڑی مصلحت معلوم ہوچکی ہوتی ہے اور وہ ہے اپنے محبوب کی رضا۔ وہ اپنے کسی کام پر اتراتا نہیں کیونکہ محبوب کی عظمت کے سامنے اس کو اپنا عمل ہیچ نظر آتا ہے لیکن اس پر خوش ضرور ہوتا ہے کیونکہ ایسے کام کی توفیق ہو جانا جس میں اس کے محبوب کی رضا مضمر ہوتی ہے اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے اس پر خوش ہو جاتا ہے لیکن اس خوف سے کہ کہیں اپنی کسی غلطی سے ناقبول نہ ہو جائے لرزاں ترساں بھی رہتا ہے اور محبوب کے کرم کو دیکھتے ہوئے پُر امید بھی رہتا ہے۔ احادیثِ شریفہ میں ایک مومن کی علامات ایسی ہی بتائی گئی ہیں۔ عبد ہر خیر کی نسبت اپنے محبوب مالک کی طرف اور ہر شر کی نسبت اپنے نفس کی طرف کرتا ہے جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا "وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِيْ" اور میں اپنے نفس کو پاک نہیں کہتا۔ (یوسف:53) اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کلالۃ کے بارے میں میری ایک رائے ہے اگر وہ صحیح ہے تو میرے رب کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے تو شیطان اور میرے نفس کی طرف سے ہے۔ احادیثِ شریفہ کی دعائیں اس سے پُر ہیں۔ ایسے حضرات نہایت لجاجت کے ساتھ دعاؤں میں مشغول ہوتے ہیں کہ محبوب کی رضا اسی میں ہے لیکن نتیجہ خدا پر چھوڑ دیتے ہیں کہ خود کوئی تجویز ہی نہیں رکھتے۔ ان کو پتا ہوتا ہے کہ ہمارا محبوب مالک ہماری تمام ضروریات سے آگاہ اور ہم پر ہم سے زیادہ مہربان ہے۔ عبد کی

کوئی شان نہیں ہوتی۔ بقول حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کبھی تو اس کو آقا کی رضا کے لئے پاخانہ اٹھانا پڑتا ہے تو کبھی اس کی قائمقامی کے لئے جلسہ یا دربار میں جانا پڑتا ہے۔ اس لئے عبد کی نظر میں خوشگوار اور ناخوشگوار حالت برابر ہوتی ہے کہ ایک میں محبوب کی محبوبیت ہے "ان اللّٰهَ شَاكِرٍ يُحِبُّ الشاكِرِين" (طبرانی) اور دوسرے میں محبوب کی معیت "اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ"

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب
کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

پس کیفیتِ عبدیت والے حضرات کو اچھی چیز ملے تو دل سے خدا کا شکر ادا کر دیتے ہیں اور ناخوشگوار حالت پیش آئے تو اس کو منجانب اللہ سمجھ کر صبر کر لیتے ہیں۔ ہر حالت میں ان کی خیر ہے۔ اصل میں یہ ایسی کیفیت ہے جو تمام فضائل کو لئے ہوئے ہے اس لئے اس کا حصول سارے فضائل کا حصول اور سارے رذائل سے پاکی کا مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل یہ نعمت نصیب فرمائے۔ آمین

مختصراً اعتقادات، عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاقیات میں شریعت کا جو بھی حکم ہو اس کو بسر و چشم پورا کرنا عبدیت ہے۔

عبدیت کے حصول کا طریقہ

نفس، قلب اور عقل کی اصلاح اس کی تحصیل کا طریقہ ہے کیونکہ جب تک نفس کی شرارت مؤثر ہے اور دل پاک نہیں اور عقل فہیمِ سنت نہ ہو عبدیت حاصل نہیں ہوسکتی۔

1.2.2... رضائے الٰہی

اللہ تعالیٰ کا ارشادِ مبارک ہے "وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ" اور اللہ تعالیٰ کی رضا بڑی چیز ہے۔ (التوبة:72) اور اس کے لئے یہ دعا بہت مشہور ہے۔ "اَللّٰهُمَّ اِنی أسئلك رضاك و الجنة" اے اللہ میں آپ سے آپکی رضا اور جنت کا سوال

کرتا ہوں۔ حق تعالیٰ کے ساتھ بندے کو ایسے تعلق کا نصیب ہو جانا کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنا سمجھے یعنی جن کو رجال اللہ کہا جاتا ہے ان میں سے ہو جائے۔ یہ وہ نعمت ہے جو بڑے خوش نصیبوں کو ملا کرتی ہے۔ اس کے لئے سارے ہی پاپڑ بیلنے پڑیں اور یہ نعمت حاصل ہو جائے تو بہت سستا سودا ہے۔

رونے سے اگر ہوتا عرفی مجھے وصال
رونا مجھے قبول تھا اس کے لئے صد سال

کسی عملِ صالح میں یہ قابلیت نہیں کہ اس کا بدل ہو کیونکہ وہ سب ہی توفیقاتِ الٰہیہ ہیں لیکن اللہ تعالیٰ عادتاً ان لوگوں کو ہی نوازتے ہیں کہ محض اپنے فضل سے اپنی رضا کو اعمال پر مرتب فرما دیتے ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ کوئی شخص اپنے عمل سے جنت نہیں جائے گا بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے جائے گا۔ اور یہ نسبت مع اللہ جب نصیب ہو جاتی ہے تو پھر زائل نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ جس کو دوست بناتے ہیں تو پھر ان کو اپنے سے دور نہیں فرماتے۔ البتہ بشریت کے ناطے کچھ ایسے اعمال ان سے سرزد ہو جائیں جن پر گرفت کی جا سکے تو ان حضرات کو اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک اپنے اللہ سے رو دھو کے معاف نہیں کرا دیتے۔ اس لئے اگر منفی عمل ہوگیا تو ساتھ ہی مثبت عمل یعنی توبہ و استغفار کی اتنی توفیق ہو جاتی ہے کہ نہ صرف وہ گناہ معاف ہو جاتا ہے بلکہ مزید ترقیات کے دروازے بھی کھل جاتے ہیں۔ جیسے آپ ﷺ نے ایک صحابی پر حد کے دوران ایک اور صحابی کے جب مذمت کے الفاظ سنے تو فرمایا کہ اس کی مذمت نہ کرو کہ اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر سارے حجاز والوں پر بھی تقسیم کی جائے تو سب کی بخشش ہو جائے۔ الغرض ایسے لوگ معصوم تو نہیں ہوتے کہ وہ تو صرف انبیاء ہیں لیکن محفوظ ہو جاتے ہیں۔ ان کو "رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ" اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے۔ (البینہ:8) کا مژدہ سنایا جاتا ہے اور یہ ان سب کے لئے ہے جن کو خشیت حاصل ہو۔

رضائے الٰہی کا طریقہ تحصیل

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا یہ غیر اختیاری ہے جب اللہ تعالیٰ کرم فرمائے ہو جاتا ہے البتہ ہمارا کام اختیاری اُمور میں سستی نہیں کرنا ہے کیونکہ ہم اسی کے مکلف ہیں۔ "فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ" بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ (ھود:115) اس لئے ایسے کریم رب سے قبولیت کی امید رکھتے ہوئے اعمالِ ظاہرہ اور باطنہ جو اختیاری ہیں میں دل و جان سے لگنا ہی اس کے حاصل کرنے کا طریقہ ہے جو پورا سلوک ہے، اس کے بعد جب بھی اس کا فضل ہو جائے تو یہ خوش نصیبی ہے۔ دیر سویر میں نہیں لگنا چاہیے کہ اس راستے میں تعجیل ایک کانٹا ہے جس سے بچ کے گزرنا چاہیے لیکن اختیاری اُمور میں غفلت بھی نہیں ہونی چاہیے کیونکہ وہ محرومی کی وجہ بن سکتی ہے۔

پانے کا، نہ پانے کا تو اختیار گو نہیں
پس ہم کو چاہیے کہ تگ و دو لگی رہے

اک لحظہ کی غفلت نہ ہو اس شاہ سے کبھی
شاید اسی لمحے ہو نگاہ تجھ پہ کرم کی

1.2.2.1... وصول الی اللہ کے تین طریقے

اول سب سے طویل، دوم درمیانہ اور سوم مختصر

اول: سب سے طویل

وہ یہ ہے کہ کثرتِ صوم و صلوٰۃ، قرأت قرآن پاک و حج و جہاد وغیرہ کرنا، یہ طریق اخیار کا ہے۔ اس میں قوتِ ارادی سے علم نافع حاصل کیا جاتا ہے اور پھر اپنی قوتِ ارادی سے نفس کی کشاکشی پر قابو پا کر عملِ صالح کیا جاتا ہے۔

دوم: درمیانہ

ان اُمور کے علاوہ مجاہدہ و ریاضت، اخلاقِ ذمیمہ کے ازالے اور اخلاقِ حمیدہ کی تحصیل میں مشغول ہونا اور اکثر اسی طریق سے واصل ہوتے ہیں۔ یہ طریق ابرار کا ہے۔ اس کے لئے کسی شیخ کے ہاتھ پر بیعت کرنی پڑتی ہے کیونکہ دل کے تاروں کو چھیڑنا اور مجاہدہ کی مقدار کا تعین ان ہی کا کام ہے۔ اس میں دو چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ ایک شیخ کا تجربہ اور دوسرا ان کے سلسلے کی برکت جس سے مطلب حاصل ہونا زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔

سوم: مختصر مگر زیادہ موثر

یہ فنا فی الشیخ، فنا فی الرسول اور فنا فی اللہ کا راستہ ہے جس کو طریقِ عشق کہتے ہیں۔ اس میں قوتِ ارادی نہیں بلکہ قوتِ عشق کارفرما ہوتی ہے اس لئے یہ طریقہ مختصر ترین ہے۔ اس میں سالک تزکیہ نفس اور تصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح میں مشغول ہوتے ہیں اور کشف و کرامات کو ایک جَو کے بدلے میں بھی نہیں خریدتے اور "مُوْتُوْا قَبْلَ أَنْ تَمُوْتُوْا" پر مستقیم ہوتے ہیں۔ یہ طریق شطاریہ کاہے۔ "مُوْتُوْا قَبْلَ أَنْ تَمُوْتُوْا" کے ساتھ انطباق اور مرنے سے پہلے مرنے کی نوعیت یہ ہے کہ موت کے وقت مردے کہ یہ احوال ہوتے ہیں۔ توبہ، زہد، توکل، قناعت، عزلت، توجہ الی اللہ، صبر، رضا، ذکر، مراقبہ جو کہ شطاریہ کا شیون ہے۔

(1) توبہ: یعنی ہر فعلِ بد سے نکل جانا جیسا کہ موت کے وقت ہوتا ہے۔

(2) زہد: دنیا و مافیہا کا ترک کرنا جیسا کہ موت کے وقت ہوتا ہے۔

(3) توکل: اسبابِ ظاہرہ غیر عادیہ کا ترک کرنا جیسا کہ موت کے وقت ہوتا ہے۔

(4) قناعت: شہوات کا ترک کرنا جیسا کہ موت کے وقت ہوتا ہے۔

(5) عزلت: خلق سے قطع کرنا جیسا کہ موت کے وقت ہوتا ہے۔

(6) توجہ الی اللہ: ماسویٰ اللہ سے اعراض کرنا جیسا کہ موت کے وقت ہوتا

ہے۔

(7) صبر: ترکِ حظوظ کرنا جیسا کہ موت کے وقت ہوتا ہے۔

(8) رضا: رضائے نفس کو ترک کرنا اور رضائے حق پر راضی رہنا اور خدا کے حکم کو تسلیم کرنا جیسا کہ موت کے وقت ہوتا ہے۔

(9) ذکر: ذکرِ غیر حق کو ترک کرنا اور یادِ حق میں مشغول ہونا جیسا کہ موت کے وقت ہوتا ہے۔

(10) مراقبہ: اپنے وقت کے لوٹنے کے خیال کو ترک کرنا جیسا کہ بوقتِ موت ہوتا ہے۔

یہ ہے " مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا" ہونا کہ جو موت کے وقت حالت ہوتی ہے وہ حالتِ حیات میں نقد حال ہو کہ جسم دنیا میں ہو اور روح متوجہ باآخرت ہو اور واصل بحق ہو۔ مال و دولت، ساری دنیا کی سلطنت ہاتھوں میں ہو لیکن دل پر اس کا کچھ بھی اثر نہ ہو جس کی پہچان یہ ہے کہ ممنوعات و مکروہاتِ شرعیہ سے قولاً و فعلاً و حالاً جوارح و زبان کو بند کرے، قلب کو ماسِوئ اللہ سے فارغ اور اخلاقِ حمیدہ سے آراستہ کرے بیہودہ مجالس سے پرہیز ہو۔ جو چیز طالب کو یادِ الٰہی سے باز رکھے وہی بیہودہ اور لایعنی ہے۔ باطل لوگوں کی صحبت سے اجتناب کرے جو طالب خدا کا نہیں وہی باطل ہے۔ اے عزیز! یہ ہے "مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا" کا مصداق جو کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔ آپ نے امت سے اس طرح رہنے کو چاہا ہے۔

اخلاق کے رسوخ کی علامات

اخلاق کے رسوخ کی علامت یہ ہے کہ جس وقت جس خلق کا موقع پیش آئے اس وقت بلا التفات، بلا اختیار تدبیر فوراً یا ادنیٰ تدبیر سے اس خُلق کا با محل استعمال ہو۔

2... غیر مقصود

یہ تین قسم کے ہیں: ذرائع، توابع، موانع

2.1... ذرائع

ذرائع دو قسم کے ہوتے ہیں: منصوص اور غیر منصوص

2.1.1... منصوص ذرائع

منصوص ذرائع میں عبادات آتی ہیں جن میں سب کچھ ہے اگر صحیح طریقے سے ادا ہوں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہے اور اس کے لئے بعض ذرائع ایسے تھے جن تک بقول شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کسی انسان کا ذہن نہیں جا سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے پیغمبروں کے ذریعے وہ ذرائع ہمیں مہیا کر دیئے۔ یہ ذرائع منصوص ذرائع کہلاتے ہیں جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ اگر یہ ذرائع کسی کے سو فیصد ہوں تو کسی غیر منصوص ذریعے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ جیسے آنکھیں درست ہوں تو عینک کی ضرورت نہیں ہوتی اور اگر آنکھیں درست نہ ہوں تو عینک لگانا ضروری ہے۔ اس طرح نماز بے حیائی اور منکرات سے روکتی ہے لیکن اگر کسی کی نماز اس حد تک مؤثر نہ ہو تو اس کو اس کے ساتھ کچھ غیر منصوص ذرائع کی ضرورت پڑے گی البتہ ان منصوص ذرائع سے انکار کسی بھی وقت ممکن نہیں اور غیر منصوص ذرائع ان کا متبادل نہیں قرار دیئے جا سکتے جیسے آنکھیں بالکل ختم ہو جائیں تو عینک پھر کس کام کی؟

2.1.1.1... نماز

عبادات میں نماز ایسی اعظم عبادت ہے کہ اگر اس کو پورے اہتمام آداب و شرائط سے ادا کیا جائے تو کسی دوسری مستقل ریاضت کی ضرورت نہیں اس میں ذکر، شغل، مراقبہ اور مثل تسبیحات، استغفار، درود شریف وغیرہ سب جمع ہیں۔ اس میں ذکر کا ہونا اور کلام پاک کی تلاوت ہے جو جامع اذکار ہے اور شغل بحالتِ

قیام سجدہ کی جگہ نظر کا جمانا، بحالتِ رکوع قدم پر نگاہ رکھنا، بحالتِ سجدہ پرّہ بینی پر نگاہ رکھنا، بحالتِ جلسہ و قعدہ گود پر نگاہ جمانا، بحالتِ سلام دائیں بائیں کندھے پر نگاہ رکھنا۔ مراقبہ بحالت تحریمہ باستحضارِ نیت اور کل صلوٰۃ میں "اَللّٰہُ نَاظِرِیْ" کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو دیکھ رہے ہیں، خیال رکھنا یہ مقام احسان کہلایا جاتا ہے جس کے لئے تمام مجاہدے اور ریاضتیں اختیار کی جاتی ہیں۔

جیسے کہ حدیث شریف میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ "مَالْاِحْسَانُ" کہ احسان کیا چیز ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا "أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ" (البخاري) کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرے گویا اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے کیونکہ اگر تو نہیں دیکھ رہا ہے تو اللہ تعالیٰ تجھ کو دیکھ رہے ہیں۔ غرض نماز کو اس کے آداب و مستحبات اور شروط کے ساتھ ادا کرنے سے راہِ سلوک اور اس کا انتہائی درجہ مقامِ احسان حاصل ہو سکتا ہے اور لطائفِ ستہ کے آثار ظہور کر سکتے ہیں۔

2.1.1.2... روزہ

روزہ کا خاصہ ازروئے قرآن پاک تقویٰ ہے جو ولایت کی کنجی ہے کیونکہ ولایت کے لئے دو ہی باتیں درکار ہیں: ایمان اور تقویٰ بشرطیکہ روزہ کو ظاہراً اور باطناً صحیح رکھا جائے یعنی اس میں ان تین ممنوعات اکل و شرب و مباشرت سے رکنے کے ساتھ ساتھ کوئی ایسا عمل نہ ہو جو روزہ کی اصل یعنی تقویٰ کے خلاف ہو۔ چونکہ اس میں نفس پر روزہ کے ساتھ پیر رکھا جاتا ہے یعنی کھانے پینے اور مباشرت کی ممانعت سے نفس کی اصلاح ہوتی ہے اور تراویح میں قیام اور تلاوتِ قرآن سننے سے دل کی اصلاح ہوتی ہے۔

2.1.1.3... زکوٰۃ

قرآن و حدیث میں انفاق فی سبیل اللہ کی بہت ترغیب ہے۔ اس میں زکوٰۃ بشرطِ استطاعت فرض کے درجے میں ہے۔ مال کی محبت جو نفس کے بہت سارے

رذائل کی جان ہے اس سے اس پر زد پڑتی ہے۔ رشوت و سود اور ناجائز ذرائع سے مال کو جمع کرنے کے ساتھ جو مفاسد وابستہ ہیں زکوٰۃ سے ان کا توڑ ہوتا ہے۔

2.1.1.4... حج

ایک ہوتی ہے نفسانی عقلِ معاش اور دوسری ہوتی ہے عقلِ معاد۔ عقلِ معاش انسان کی اس اہم صلاحیت کو نفس کے لئے استعمال کرتی ہے جس کی حدود کا تعین ضروری بلکہ از حد ضروری ہے۔ اس کے لئے حج مشروع کردیا گیا کہ جن بزرگوں کی اداؤں کی ہم سے نقل کرائی جاتی ہے انہوں نے کیسے اپنی عقلِ معاش پر عقلِ معاد کو غالب کیا تھا۔ اس میں لباس وہ پہنایا جاتا ہے جس کا تقاضا عقلِ معاش نہیں کرتی بلکہ جذبۂ عشق سے ہی ایسا ممکن ہے۔

2.1.2... غیر منصوص ذرائع

اگر ان منصوص اعمال کی ادائیگی میں نفس و شیطان کی وجہ سے کمزوری پائی جائے تو ان کا پھر علاج ضروری ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے آنکھیں اگر صحیح کام کریں تو عینک لگانا ایک فضول حرکت ہوگی لیکن اگر آنکھیں کمزور ہوگئی ہیں اور صحیح طور ان کے لئے دیکھنا ممکن نہیں رہتا تو اگر مناسب عینک لگانے سے چیزیں صحیح نظر آسکتی ہوں تو عینک لگانا ضروری ہو جاتا ہے۔ بس یہی فرق ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں یہی ذرائع کافی تھے اور ان ہی سے ان کے سب کام ہوتے تھے بعد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے دوری کی وجہ سے امت کے یہ ذرائع کمزور ہوتے گئے اس لئے دوسرے ذرائع کی اہمیت بڑھتی گئی۔ چونکہ ان دوسرے ذرائع کی ضرورت حسبِ حال مختلف لوگوں کے لئے مختلف ہوتی ہے اس لئے یہ منصوص نہیں بلکہ تجرباتی ہوتے ہیں۔ ان کا منصوص ہونے کا مطالبہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی جسمانی بیماری کے علاج کے لئے دوا کے منصوص ہونے کا مطالبہ۔

غیر منصوص ذرائع کی قسمیں

یہ دو ہیں۔ یہ دونوں فی الاصل مقصود نہیں بلکہ بضرورت استعمال کی جاسکتی

ہیں۔

2.1.2.1... مجاہدہ

2.1.2.2... فاعلہ

مجاہدہ میں نفس پر محنت کی جاتی ہے کہ بندہ اس کے مرغوبات پر قابو پانے پر قادر ہو تاکہ اس نفس سے اللہ تعالیٰ کی منشاء پاک کے مطابق کام لیا جاسکے۔ فاعلہ میں نفس کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو ابھارا جاتا ہے کہ بندے کے رذائل دور ہو جائیں اور اس کو فضائل حاصل ہو جائیں۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ غیر منصوص ذرائع مقصود نہیں ہوتے لیکن جن مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہوتے ہیں ان کو حاصل کرنے کے لئے پھر ان کے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ مثلاً کسی کو فقہ میں مہارت حاصل کرنی ہو تو اس کو پہلے صرف نحو، اصولِ فقہ، قرآن کی تفسیر اور احادیث کی تشریح میں جان کھپانی پڑے گی پھر اس کو کسی ماہرِ فقہ کی نگرانی میں فتاویٰ کا کام کرنا پڑے گا تب کہیں اس میں فقہ کی مہارت پیدا ہوسکے گی۔ اگر کوئی یہ کہے کہ میں ایک فقیہ کی نگرانی میں فتویٰ لکھنا شروع کر دیتا ہوں تو مہارت حاصل ہو جائے گی تو اس کی یہ بات قابلِ سماعت نہیں سمجھی جائے گی۔ اس طرح اگر کسی کو ڈاکٹر بننا ہے تو اس کو ایم بی بی ایس میں اناٹومی، بائیو کیمسٹری، فارمکالوجی، پیتھالوجی وغیرہ سب پہلے پڑھنی پڑتی ہیں پھر ان کو میڈیسن اور سرجری سمجھ میں آتی ہیں۔ پس اگر کوئی کہے میں نے تو صرف سرجری اور میڈیسن پڑھنا ہے تو اس کی بات نہیں سنی جائے گی۔ اب سب سے پہلے مجاہدہ کا بیان ہوگا۔ پھر اس کے بعد فاعلہ کا۔

2.1.2.1... مجاہدہ

مجاہدہ کی حقیقت نفس کی مخالفت کی مشق و عادت ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا و اطاعت کے مقابلے میں نفس کی خواہشات کو مغلوب رکھا جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" اور جن لوگوں نے ہمارے لئے کوشش کی ہم اُن کو ضرور اپنے رستے دکھا دیں گے۔ (العنکبوت:69) اور حضور

اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا "عن فضالة الكامل قَال قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ "اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ فِيْ طَاعَةِ اللّٰهِ" (رواه البيهقي) یعنی فضالۃ الکامل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجاہد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اپنے نفس سے جہاد کرے۔ روایت کیا اس کو بیہقی نے۔

تکمیلِ فنائے نفس بغیر مجاہدہ کے ممکن نہیں، اس لیے مجاہدات کی ترتیب سالکین کے لیے بنانی پڑے گی۔ مجاہدہ ہر سالک کا اپنا ہوگا کیونکہ بعض مجاہدات جس کے لیے مجاہدات ہیں وہ دوسروں کے لیے نہیں ہوتے۔ مثلاً خادم کو کہا بازار سے سودا لاؤ تو اس کے لیے یہ عام بات ہے لیکن جس کو معاشرے میں کوئی مقام حاصل ہو اس کو یہ کہنا اس کے لیے مجاہدہ ہے۔ سخی سے خرچ کرانا مجاہدہ نہیں، بخیل سے خرچ کرانا مجاہدہ ہے۔

طریقہ

نفس کو بعض چیزیں محبوب ہوتی ہیں اور بعض چیزیں نفس پر گراں ہوتی ہیں۔ جو چیزیں نفس کو محبوب ہوتی ہیں ان میں کچھ تو نفس کے حقوق ہیں جن سے حیات اور جسم قائم ہے، یہ نفس کی ضروریات ہیں اور کچھ نفس کے حظوظ ہیں، یہ نفس کی خواہشات ہیں۔ سو مجاہدہ و ریاضت میں حظوظ میں کمی کی جاتی ہے یا ان کا ترک کرایا جاتا ہے اور نفس پر جو چیزیں گراں ہیں ان کا نفس کو عادی بنایا جاتا ہے حقوق البتہ ادا کئے جاتے ہیں کیونکہ جائز حقوق سے اپنے نفس کو محروم کرنا خلافِ سنت ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ "اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقّ" (البخاري) یعنی بے شک تمہارے نفس کا تم پر حق ہے۔ کیونکہ اس سے ضعف بڑھتا ہے اور صحت میں خلل پڑتا ہے۔ پھر ضروری اشغال و عبادات سے بھی انسان عاجز ہو جاتا ہے۔

مجاہدہ کی حقیقت

مجاہدہ مقصود نہیں ذریعہ ہے اس لئے اگر مجاہدہ کے بغیر شریعت کے مطابق اعمال ہونے لگیں تو ان سے مزید کا مطالبہ نہیں کیونکہ اللہ جل شانہ کا ارشادِ مبارک ہے طٰهٰ مَآ أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ہم نے آپ پر قرآن اس لیے نہیں اتارا کہ آپ خواہ مخواہ کسی محنتِ شاقہ اور تکلیفِ شدید میں مبتلا ہوں۔ (طه:2-1) البتہ شریعت پر چلنے میں اگر نفس مزاحم ہو تو پھر اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ بقول حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ پہلے لوگ اپنے نفس کی اصلاح سلوک طے کر کے کرلیتے تھے بعد میں جو حضرات نقشبندیہ کے فیوض حاصل کرنا چاہتے تو اس میں نقشبندیہ کے اذکار و مراقبات کرلیتے تھے ان کو مجاہدات و ریاضات کی ضرورت نہیں ہوتی تھی کیونکہ سلوک طے کرنے میں وہ ہو چکی ہوتی تھیں ان کو صرف معرفت حاصل کرنے کے لئے اذکار و مراقبات کی ضرورت ہوتی تھی اس لئے متاخرین نقشبندیہ کو یہ خیال ہوا کہ ہمارے طریق میں مجاہدات نہیں حالانکہ حضرت مجدد الف ثانیؒ جذب حاصل ہونے کے بعد سلوک کی تکمیل کو سالک کی تکمیل کا لازمی حصہ سمجھتے ہیں اور اس کے بغیر مجاذیب کو مجذوب متمکن کہتے ہیں اور بقول حضرت مجدد صاحبؒ کے نہ خود پہنچے ہیں نہ دوسروں کو پہنچا سکتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام سلسلوں میں جن کو ضرورت ہو ان کو مجاہدات و ریاضات سے گزرنا پڑتا ہے۔

مجاہدہ کی ضرورت

فرض کریں زید نے بار برداری کا ایک جانور خریدا جو کہ اڑیل ہے اس پر زید جب کوئی بوجھ ڈالتا ہے تو وہ مزاحمت کرتا ہے اور اگر اس کو آزاد چھوڑتا ہے تو دوسری چیزوں کو خراب کرتا ہے، کسی اور کے کھیت میں جاکر اس کا نقصان کرتا ہے جس کا خمیازہ زید کو بھگتنا پڑتا ہے اب زید اس جانور کے ساتھ کیا کرے گا۔ ظاہر ہے اگر زید اس کا کچھ نفع اٹھانا چاہتا ہے یا اس کے نقصان سے بچنا چاہتا ہے تو اس کی تربیت کرے گا جس کا طریقہ یہ ہوگا کہ ترغیب و ترہیب کے ذریعے

اس کو مشقت کا عادی بنائے گا۔ اس کی ضرورت کی چیزیں تو اس کو مہیا کرے گا لیکن اس کی دوسری خواہشات کو کنٹرول کرے گا۔ ایسی صورت میں یہ جانور زید کے لئے نفع بخش بن جائے گا لیکن اس کی شر سے بچنے کے لئے زید پھر بھی اس پر نگاہ رکھے گا اور اس کو کھلا نہیں چھوڑے گا اور کھلا چھوڑنے کے قابل کبھی ہوا بھی تو پھر بھی اس کی خبر رکھے گا کہ اس کی خواہشات کہیں اس کی تربیت کو ضائع نہ کر دیں اسی ترتیب کو تربیتِ نفس پر بھی منطبق کریں۔

اعمالِ صالحہ چونکہ نفس کو کرنے پڑتے ہیں۔ اگر وہ نفس پر گراں ہوں تو اعمالِ صالحہ میں مشقت رہتی ہے کیونکہ نفس ان کے مقابلے میں مخالفت کرتا ہے اگر نفس کی تربیت نہ ہوچکی ہو تو اس کی مثال زید کا اڑیل جانور ہے۔ نفس کی اس مخالفت کے باوجود عمل کرنا مجاہدہ حقیقی ہے جو فرض و واجب اعمال کی صورت میں فرض و واجب ہے اور سنت و مستحب کی صورت میں سنت و مستحب ہے۔ چونکہ ان اعمال کو تو کرنا ہی کرنا ہے اسی لئے نفس کی یہ مخالفت تو عمر بھر کرنی پڑتی ہے۔ دوسری طرف نفس کے کچھ ایسے تقاضے بھی ہوتے ہیں جن کو پورا کرنے سے شریعت کی مخالفت ہوتی ہے نفس ان چیزوں کو کرنا چاہتا ہے چونکہ شریعت کی مخالفت سے بچنا ہی بچنا ہے اس لئے نفس کے خلاف عمر بھر جما رہنا پڑے گا البتہ جس نے اپنے نفس کو مشقتوں کا عادی بنا کر اس کی تربیت کی تو ایک طرف اعمالِ صالحہ کی مزاحمت کم ہو جاتی ہے اور دوسری صورت میں خلافِ شرع اعمال کی طلب کم ہو جاتی ہے جیسا کہ زید نے اپنے جانور کی تربیت کی تو زید نے اس کا نفع اٹھایا اور اس کے شر سے محفوظ ہوا۔ "قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى" بے شک وہ کامیاب ہوا جو پاک ہو گیا۔ (الاعلیٰ:14) کا یہی مطلب ہے۔

کچھ غلط فہمیوں کا ازالہ

مبتدی یعنی جس نے اپنی تربیت ابھی شروع کی ہے اس کے لئے تو یہ غلط ہے ہی کہ وہ اپنے نفس کو مشقت سے بچانا چاہے یعنی مجاہدہ پر تیار نہ ہو اور اس انتظار میں رہے کہ سارا کام مشقت کے بغیر ہو جائے اور منتہی جس کی تربیت

ہوچکی ہو اس کی غلطی یہ ہے کہ وہ ابتدائی مجاہدہ کر کے آئندہ کے لئے بھی اپنے آپ کو مجاہدہ سے مستغنی سمجھ لے چونکہ بسا اوقات نفس کے تقاضوں کی وجہ سے پھر کبھی کمزوری پیش آسکتی ہے اور اس وقت منتہی کو بھی معصیت کا تقاضا ہوتا ہے اس طرح اس کا نفس بھی بعض دفعہ طاعات میں کسل کرنے لگتا ہے اس وقت اس کو بھی مجاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے مگر مبتدی اور منتہی کے مجاہدہ میں بڑا فرق ہے، جیسے ایک تو زید کا جانور جب اڑیل تھا اس وقت اس سے کوئی کام کرانا یا اس کو کسی چیز سے روکنا زیادہ مشکل تھا اور ایک جب وہ تربیت یافتہ ہوگیا تو اس سے کام کرانا اور اس کو کسی چیز سے بچانا جو کہ ظاہر ہے کم مشکل ہے۔ وقتی طور پر تربیت یافتہ جانور بھی اگر مزاحمت کرے تو اس کو قابو کرنا اتنا مشکل نہیں ہوتا البتہ اگر کوئی یہ سمجھ لے کہ اب میرا جانور سدھا ہوا ہے اس لئے اس سے بالکل بے فکر ہو جائے تو جو نقصان ہو سکتا ہے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

شیطان اور نفس کے شر سے بچنے کا طریقہ

کسی انسان کو برائی پر ابھارنے والی دو قوتیں ہیں۔ ایک نفس ہے اور دوسرا شیطان۔ نفس لذات کا طالب ہے اور شیطان خدا سے دوری کا۔ پس نفس کو اگر جائز طریقے سے مطمئن کیا جائے اور کچھ مجاہدے سے اس کی تہذیب ہو جائے تو ساتھ ساتھ چلنے لگتا ہے بخلاف شیطان کے کہ وہ لذت کا طالب نہیں خدا سے دوری کا طالب ہے اس لئے وہ ایسے گناہ بھی کرا دے گا کہ جس میں نفس کو لذت نہیں ہوگی بلکہ عین ممکن ہے نفس کو تکلیف بھی ہو جیسے گمراہ صوفی جو نفس کو تکلیف دینا ہی دین سمجھتے ہیں حالانکہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ شیطان نے ان کو سمجھایا ہوتا ہے کہ تو چونکہ نفس کو تکلیف دے رہا ہے اس لئے تو روحانی ترقی کر رہا ہے۔ بعض عیسائی جو بعض اوقات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اپنے زعم میں مصلوبیت کو یاد کر کے ان کی طرح اپنے آپ کو پھانسی لگاتے ہیں اپنے جسم پر کیل ٹھونکتے ہیں یا شیعہ جو حضرت امام حسین کے حالات کو یاد کر کے اپنے آپ کو پیٹتے ہیں اور بعض دفعہ زنجیروں سے اپنے آپ کو مارتے ہیں یہ اسی نوعیت کے

تماشے ہیں۔ اس لئے اس کا سمجھنا بہت ضروری ہے کہ اپنے نفس کو کونسی تکلیف دینا جائز ہے اور کونسی ناجائز؟

نفس کی تو تربیت ہوسکتی ہے شیطان کی نہیں۔ شیطان سے تو ہمیشہ پناہ مانگنی چاہیے اور اس کے مکائد کو اچھی طرح سمجھنا چاہیے۔ نفس چونکہ گھر کا بھیدی ہے اس لئے شیطان اس کو آلہ کار بناتا ہے اور اپنا کام کراتا ہے لیکن اگر اس طرف سے شیطان مایوس ہو تو پھر وہ دوسرے رخ سے حملہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت کا دل میں راسخ ہونا اور محبوبِ خدا ﷺ کی سنت کے ساتھ چپکنا ہی شیطان کا توڑ ہے کیونکہ اس راہ سے شیطان حملہ آور نہیں ہو سکتا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس ملعون سے پناہ مانگنی چاہیے۔ آجکل بھی اس دنیا میں بعض ایسے غیر تمند موجود ہیں جن کے ہاں اگر ان کے دشمن کسی چیز سے پناہ مانگیں تو ان کے لئے جان پر کھیل جاتے ہیں تو جس خدا نے ان غیر تمندوں کو پیدا کیا ہے وہ اپنے دشمن سے آپ کو پناہ نہیں دیں گے؟ خوب سمجھنا چاہیے اور اس کے لئے صحبتِ صالحین اور ذکر کی کثرت بہت مفید ہے۔

مجاہدہ میں اعتدال

مجاہدہ سے مقصود نفس کو پریشان کرنا نہیں ہے بلکہ نفس کو مشقت کا عادی بنانا ہوتا ہے اور اس کی راحت و تنعم کی عادت کو ختم کرنا ہوتا ہے اور اس کے لئے اتنا مجاہدہ کافی ہے جس سے نفس پر کسی قدر مشقت پڑے۔ بہت زیادہ نفس کو پریشان کرنا اچھا نہیں ورنہ وہ بالکل معطل و بے کار ہو جائے گا۔ اس کو خوب سمجھنا چاہیے، محنت و مشقت ہمیشہ اور ہر حال میں مستحسن نہیں بلکہ جب اعتدال سے ہو اور اس پر نتیجہ اچھا مرتب ہو، اسی وقت مستحسن ہے۔ پس مجاہدہ میں افراط بھی مذموم ہے۔ لہٰذا اعتدال کی رعایت لازم ہے۔ اسی کو حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

نہ کھا اتنا جو کھائے منہ سے ہو باہر
نہ کم اتنا کھا ضعف جس سے ہو ظاہر

یعنی نہ اتنا کھاؤ کہ منہ سے باہر آنے لگے اور نہ اتنا کم کھاؤ کہ جسم میں کمزوری آ جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد پاک ہے "وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا" یعنی خدا کے بندے وہ ہیں، جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں بلکہ وہ خرچ اس کے درمیان میں معتدل ہوتا ہے۔ (الفرقان:67) پس مجاہدہ میں بھی اعتدال کی رعایت کرنی چاہئے۔ بلکہ اس اعتدال کو بھی اپنی رائے سے تجویز نہ کرنا چاہیے بلکہ کسی محقق سے درجہ اعتدال اور طریق مجاہدہ معلوم کرنا چاہیے۔

مجاہدے کی اقسام

مجاہدے کی دو قسمیں ہیں اختیاری اور غیر اختیاری۔ پھر آگے اختیاری کی دو قسمیں ہیں جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ اختیاری کا تعلق نظام تربیت سے براہ راست ہے اور اس کا انسان مکلف ہے البتہ غیر اختیاری مجاہدات اللہ تعالیٰ کا تصرف ہے جس میں بڑی حکمتیں ہیں۔ بعض دفعہ اللہ تعالیٰ کسی سے کوئی بڑا کام لینا چاہتا ہے تو اس کام سے پہلے اس سے مجاہدہ لیا جاتا ہے جیسے آپ ﷺ سے معراج شریف سے پہلے طائف کا مجاہدہ لیا گیا تھا یہ سب سے اونچے درجے کا غیر اختیاری مجاہدہ ہے جیسے آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ تکلیف مجھے دی گئی۔ اس کے بعد اس مجاہدے کا درجہ ہے جو درجات بلند کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ کیونکہ بعض دفعہ انسان وہ حاصل نہیں کر پاتا جو اسے حاصل کرنا چاہیے تو اس پر غیر اختیاری مجاہدہ بھیج دیا جاتا ہے جس سے اس کو وہ مل جاتا ہے ایسے حضرات کو اس کا ادراک ہوتا ہے اور وہ اس پر شکر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تکلیف بھیج کر ان کے ساتھ کرم کا معاملہ فرمایا ہے گویا کہ تکلیف پر صبر کی بجائے شکر کرتے ہیں اور اپنے آپ کو اس سے زیادہ تکلیف کا اہل سمجھتے ہیں اور بعض دفعہ اختیاری مجاہدے کے لئے کوئی تیار نہیں ہوتا تو اس کو غیر اختیاری مجاہدہ میں مبتلا کرکے اس کی تربیت کی جاتی ہے۔ اگر وہ اختیاری مجاہدہ کرتے تو اس غیر اختیاری مجاہدے میں نہ پڑتے۔ اس کے بعد گناہوں کی بخشش کے لیے ہوتا ہے، ایسے شخص پر جب تکلیف

آتی ہے تو وہ اس پر صبر کر لیتا ہے جس سے اس کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں اور آخری درجہ اللہ پاک کی ناراضگی سے آنے والا مجاہدہ ہے جس پر انسان جزع فزع کرکے اس کا اجر ضائع کرلیتاہے۔

اختیاری مجاہدہ کی دو قسموں میں سے ایک مجاہدہ جسمانی ہے کہ نفس کو مشقت کا عادی کیا جائے مثلاً نوافل کی کثرت سے نماز کا عادی کرنا اور روزہ کی کثرت سے طعام کی حرص وغیرہ کو کم کرنا اور ایک مجاہدہ معصیت کے تقاضے کے وقت نفس کی مخالفت ہے کہ جس وقت نفس معصیت کا تقاضا کرے اس وقت اس کے تقاضے کی مخالفت کرنا۔ اصل مقصود یہ دوسرا مجاہدہ ہے اور یہ واجب ہے اور پہلا مجاہدہ اس کو حاصل کرنے کے لئے کیا جاتا ہے کہ جب نفس مشقت برداشت کرنے کا عادی ہوگا تو اس کو اپنے جذبات کے ضبط کرنے کی بھی عادت ہوگی، لیکن اگر مجاہدہ جسمانیہ کے بغیر کسی کو نفس پر قدرت حاصل ہو جائے تو اس کو مجاہدہ نفسانیہ کی پھر ضرورت نہیں۔ مگر ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ اسی واسطے صوفیاء نے مجاہدہ جسمانیہ کا بھی اہتمام کیا ہے۔ اور ان کے نزدیک اس کے چار ارکان ہیں۔

2.1.2.1.1... کم کھانا

2.1.2.1.2... کم بولنا

2.1.2.1.3... کم سونا

2.1.2.1.4... ان لوگوں سے کم ملنا جن سے نقصان ہو۔

جو شخص ان ارکان کا عادی ہو جائے گا، واقعی وہ اپنے نفس پر قابو یافتہ ہو جائے گا کہ معصیت کے تقاضے کو ضبط کر سکے گا۔ اور مجاہدہ نفسانیہ یہ ہے کہ جب نفس گناہ کا تقاضا کرے اس کی مخالفت کی جائے اور یہ بات اس وقت حاصل ہوگی جب نفس کی جائز خواہشوں کی بھی کسی حد تک مخالفت کی جائے۔ مثلاً کسی لذیذ چیز کو جی چاہا تو فوراً اس کی خواہش کو پورا نہ کیا جائے بلکہ اس کی درخواست کو اس وقت رد کر دیا جائے اور کبھی کبھی سخت تقاضے کے بعد اس کی جائز خواہش پوری کر دی جائے تاکہ نفس پریشان نہ ہو جائے بلکہ اس کو خوش رکھا جائے اور اس

سے کام بھی لیا جائے کہ

مزدور خوش رکھنا کہ کام اس سے ہے لینا

پھر جب کوئی مباحات میں نفس کی مخالفت کا عادی ہو جاتا ہے، اس وقت معاصی کے تقاضے کی مخالفت پر آسانی سے قادر ہو جاتاہے اور جو شخص مباحات میں نفس کو بالکل آزاد رکھتا ہے وہ بعض اوقات معصیت کے تقاضے کے وقت اس کو دبا نہیں سکتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ریاضت و مجاہدہ کے دو رکن ہیں۔ اول مجاہدہ اجمالی یا جسمانی، دوسرا مجاہدہ تفصیلی یا نفسانی۔ مجاہدہ اجمالی کے چار اصول ہیں، کم کھانا، کم سونا، کم بولنا اور کم ناجنس سے ملنا۔ ان سب اُمور میں مرتبہء اوسط پر شیخ کی نگرانی میں عمل ہونا چاہیے، نہ اس قدر کثرت کرنی چاہیے جس سے غفلت و قساوت و کاہلی پیدا ہو اور نفس کو محض تکلیف دینا مقصود نہ بنے جس کو رہبانیت کہتے ہیں، نہ اس قدر قلت کرے کہ صحت و قوت زائل ہو جائے۔ دوسرے رکن مجاہدہ تفصیلی کی دو قسمیں ہیں۔ اول اخلاقِ حمیدہ میں دوسری اخلاقِ رذیلہ میں۔ ان دونوں قسموں کی تفصیل گذشتہ اخلاق کے باب میں ملاحظہ فرمائیں۔

2.1.2.1.1... کم کھانا

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے "كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ" یعنی کھاؤ اور پیو اور حد سے مت نکلو، بے شک اللہ تعالیٰ حد سے نکل جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (الأعراف:31) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "يُجْزِيئهُم مَا يُجْزِيءُ اَهْلَ السَّمآء مِنَ التَّسْبِيْحِ والتقديس" (الجزء الحديث رواه أحمد والطبراني) مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو غذا کی جگہ وہ چیز کافی ہو جائے گی جو اہل آسمان کو کافی ہو جاتی ہے یعنی تسبیح و تقدیس۔ بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ انہوں نے خلوت میں مدتوں کھانا نہیں کھایا۔ اس حدیث سے ظاہر ہے کہ بعض اوقات صرف ذکر و تسبیح بھی غذا کا کام دے سکتے ہیں لیکن تقلیل غذا کے جو واقعات منقول ہیں آج کل ان پر عمل نہیں ہو سکتا، کیونکہ ان حضرات کو قوت زیادہ تھی کہ غذا کم کرنے سے بھی ان کا دل پریشان نہیں ہوتا تھا اور ان

کی قوت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان سے بعض اشغال ایسے منقول ہیں جس کا آجکل کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا۔ ان میں ایک صلوٰۃ معکوس کو لیجئے جس کی حقیقت یہ ہے کہ الٹا لٹک کر شغل کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ شارع علیہ السلام نے تقلیل طعام کو تجویز کیا ہی نہیں بلکہ کھانے کی عادت والے اوقات کو بدل کر ان میں وقفہ بڑھا دیا اور اس عادت کی تبدیلی اور وقفہ کی زیادتی سے جو نفس کو تکلیف ہوتی ہے اس کو شریعت نے تقلیل طعام کے قائم مقام سمجھا ہے اس میں جتنی صورتیں مجاہدے کی نکل سکتی ہیں۔ روزہ ان میں سب سے افضل ہے۔

لہٰذا تقلیل طعام کو شریعت نے روزہ کی صورت میں مقرر فرمایا ہے اس کے علاوہ صورتیں اہل مجاہدہ نے جو تقلیل طعام کی اختیار کی ہیں، شریعت میں اس کی مقصودیت کی اصل نہیں، یعنی کم کھانا اور بھوکا رہنا یہ شرعی مجاہدہ نہیں اور بھوک کی جو فضیلت وارد ہے اس سے اختیاری بھوک مراد نہیں بلکہ غیر اختیاری مراد ہے۔ یعنی یہ اس بھوک کے فضائل نہیں جو باوجود گھر میں غلہ ہونے کے اختیار کی جائے بلکہ کسی شخص پر فاقہ آ پڑے تنگ دستی ہو تو اس کی تسلی کے لئے فضائل بیان کر دئے گئے ہیں کہ مسلمان کو فاقہ سے پریشان نہ ہونا چاہئے اس سے اس کو ثواب ملتا ہے، درجات میں ترقی ہوتی ہے۔ یہ فضائل ایسے ہی ہیں جیسا کہ احادیث میں بیماری کے فضائل ہیں اور اس پر ثواب بیان کیا گیا ہے۔ یقیناً اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ خود بیمار پڑ جائے اسی وجہ سے چونکہ قلت طعام نہ خود بالذات مقصود ہے اور نہ اتنی قلت طعام کی آج کل کے لوگوں میں برداشت کی قوت ہے جتنی کہ متقدمین میں تھی اسی لئے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے تبلیغ دین کے قلت طعام کے بیان پر عمل کرنا آجکل کے لئے نہیں ہے۔

الغرض قلتِ طعام فی نفسہٖ مقصود نہیں بلکہ مقصود حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور مقصود اس حیوانی قوت کے زور کو توڑنا ہے جو انسان کو سرکشی پر آمادہ کرتا ہے پس اگر یہ گناہوں سے نفس کا رکنا تقلیل طعام کے بغیر میسر آجائے تو تقلیل طعام (کھانے کو کم کرنا) ضروری نہیں ہوگا نیز عبادت میں سرور و نشاط صحت اور قوت ہی سے ہوتا ہے اور تجربہ ہے کہ آج کل تقلیل غذا سے اکثر صحت برباد ہو جاتی

ہے۔ لہٰذا سالک کو چاہیئے کہ نہ تو اتنا کم کھائے کہ صحت برباد ہو جائے اور عبادت کی قوت ہی نہ رہے اور نہ اتنا زیادہ کھائے کہ سستی کی وجہ سے عبادت کے قابل ہی نہ رہے بلکہ اوسط درجے کا لحاظ رکھنا چاہیئے اور اسی کا قرآن میں حکم دیا گیا ہے اور ہر شخص کا اوسط اس کی خوراک کی مقدار کے اعتبار سے جدا جدا ہوتا ہے۔ اصل طریقہ یہ ہے کہ جس وقت بھوک لگے اس وقت کھانا کھائے اور اتنا کھا کر رک جانا چاہیے کہ چند لقمے اور کھانے کو جی چاہ رہا ہو۔

خواجہ نقشبندؒ کے نزدیک اتنا مجاہدہ کرنا چاہیے جتنا کہ مسنون ہے اور دوسرے مشائخ نفس کا زور توڑنے کے لئے اچھا خاصا مجاہدہ کرواتے تھے جیسے شیخ ابوسعیدؒ کا واقعہ مشہور ہے وغیرہ۔ ان دونوں طریقوں کو ملانے کا ایک طریقہ پیش کیا جاتا ہے امید ہے کہ ان سے دونوں کے مصالح فی زمانہ حاصل ہو سکیں گے۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

بزرگ فرماتے ہیں کہ بھرے پیٹ کا ثمرہ شیطانیت اور خالی پیٹ کا روحانیت ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ بھرے پیٹ کے ساتھ نفس پُرزور ہوتا ہے اور یہ شیطانی وساوس سے زیادہ متاثر ہوسکتا ہے اس لیے یہ شیطانیت کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس کو ختم کرنے کے لیے پیٹ کو خالی رکھنا ہوتا ہے لیکن کتنا؟ کیونکہ ایک خاص حد سے کم کرنے سے آدمی بیمار ہوسکتا ہے جو موت تک لے جاسکتی ہے جس سے شریعت روکتی ہے۔ عملی صورت اس کی یہ ہے کہ کھانا بتدریج اتنا کم کیا جائے جس سے آدمی کی ضرورت پوری ہو یعنی بیمار نہ ہو۔ اس وقت جسم کی جتنی اصلی ضرورت ہے اس کو اتنا کھانا ملے گا تو شریعت کی خلاف ورزی نہیں ہوگی اور پیٹ ضرورت کی حد تک خالی رہنے سے نفسانیت پر زد پڑے گی جس کا دوسرا مطلب روحانیت کا بڑھنا ہے۔

ایک ہے ضرورت کے مطابق کھانا اور ایک عیش کا کھانا ہے۔ عیش کے کھانے اور ضرورت کے کھانے میں جتنا فرق ہے اس کو اگر کم کیا جائے تو یہ مجاہدہ ہوگا جو اختیاری ہے۔ اس سے جو روحانیت آئے گی اور پھر اس سے جو جسم کی ضرورت کم ہوگی وہ غیر اختیاری ہے۔ پس ہم اس میں مزید بھی اختیاری طور پر کم

کر سکیں گے جس سے مزید جسم کی ضرورت غیر اختیاری طور پر کم ہوگی۔ بعض اللہ والوں کا کھانا جو ناقابل یقین حد تک کم ہوجاتا ہے وہ اسی طرح ہوتا ہے۔ اگر کھانا کوئی ویسے مسلسل کم نہ کرسکتا ہو تو دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جسم کو جس لیول پر لانا ہے یعنی جتنا مسنون طریقے کے مطابق کھانا ہے اس پر آنے کے لیے پہلے اختیاری مجاہدہ کرکے اس سے زیادہ کمی کی جائے اس سے جتنی جسم کی مطلوبہ طاقت میں کمی ہو اس کو دوسرے وقت میں پورا کیا جائے کیونکہ نفس پر اگر زیادہ بوجھ ڈالا جائے تو اس سے کم کے لئے وہ تیار ہو جاتا ہے لیکن یہاں چونکہ جسم کی ڈیمانڈ بھی پوری کرنی ہے۔ اس لئے اس کو پورا کرنے کے لئے بعد میں کچھ زیادہ جسم کو دینا پڑے گا۔ اس سے جسم کی قوت بحال ہوجائے گی لیکن مجاہدہ جو کیا ہوگا اس سے جسم مسنون مجاہدے پر تھوڑا بہت تیار ہوچکا ہوگا۔ اس لیے اب دوسری دفعہ کم اختیاری مجاہدہ کرنا پڑے گا یعنی مسنون مقدار سے پہلے سے کم کمی کرنی پڑے گی اور اس کو پورا کرنے کے لیے کم بڑھانا ہوگا۔ تیسری دفعہ اس سے بھی کم کی تبدیلی سے یہ کام ہوسکے گا اور کئی دفعہ اس طرح کرنے سے تبدیلی کی مقدار میں کمی ہوتے ہوتے مطلوبہ حیثیت یعنی مسنون مقدار پر رک جائے گا۔ یعنی جسم کی ضرورت اور نفس آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ متوازن صورت اختیار کرلیں گے۔ یہی نفس مطمئنہ کی حالت ہوگی جس پر روحانیت بھی رہے گی اور جسم بھی کمزور نہیں ہوگا۔ اس سے خواجہ نقشبندؒ کے طریقے پر بھی عمل ہوگیا کہ بالآخر مسنون مقدار پر ہی اکتفا کیا گیا لیکن اس تک پہنچنے کے لئے دوسرے بزرگوں کا طریقہ استعمال ہوا۔ اس سے سب طریقوں کی تطبیق ہوئی۔

2.1.2.1.2... کم سونا

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ "قُمِ اللَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا نِّصْفَهٗ اَوِنْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا" یعنی رات کو کھڑے رہا کرو، مگر تھوڑی سی رات یعنی نصف رات یا اس نصف سے کسی قدر کم کر دو۔ (المزمل:3-2) مذکورہ بالا آیت میں قیام لیل کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ ریاضت کے خوگر ہوں۔ جس سے نفس عبادت کے ساتھ

مانوس ہو جائے اور سستی دور ہو جائے۔ چونکہ رات کا اٹھنا اور جاگنا نفس کے کچلنے میں خوب مؤثر ہے اور دعا ہو یا قرأت ہو، نماز ہو یا ذکر ہو، ظاہراً و باطناً ہر بات خوب ٹھیک سے ادا ہوتی ہے۔ ظاہراً تو اس طرح کہ فرصت کا وقت ہوتا ہے، الفاظ خوب اطمینان سے ادا ہوتے ہیں۔ اور باطناً اس طرح کہ خوب جی لگتا ہے اور موافقت دل و زبان کا یہی مطلب ہے۔

اسی لئے رمضان المبارک میں نماز تراویح کا ادا کرنا شرعی حکم ہے جس سے نیند خودبخود کم ہو جاتی ہے۔ جس طرح روزے سے کم کھانے کی برکات حاصل ہوتی ہیں اسی طرح تراویح سے کم سونے کے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اور جس طرح روزہ میں کھانے کی عادت بدلنا ایک مجاہدہ ہے اسی طرح یہاں بھی رکعتوں کی تعداد کو بڑھا کر کم سونے کی عادت ڈالی جاتی ہے کیونکہ عام عادت یہی ہے کہ اکثر لوگ عشاء کے بعد فوراً سو جاتے ہیں تو نیند کے وقت میں تراویح کا امر کر کے عادت کو بدل دیا ہے جس سے نفس پر گرانی ہوتی ہے اور یہی مجاہدہ ہے۔ غرض شریعت نے تقلیل منام میں محض بیداری پر اکتفا نہیں کیا کہ خالی بیٹھے جاگتے رہو بلکہ اعمال کی تلقین فرمائی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نیک بندوں کی تعریف اس طرح فرماتے ہیں۔ "وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ" (الذاريات:18) یعنی وہ پچھلے حصہ رات میں استغفار کرتے ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے کہ "تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفاً وَّ طَمَعًا" (السجدة:16) اپنے بستروں سے اٹھ کر اپنے رب کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں مطلب یہ ہے کہ رات کو نماز پڑھتے ہیں، مگر طرز کلام سے عموم ظاہر ہے لہٰذا مطلق دعا و ذکر بھی مراد ہو سکتا ہے پھر اس میں دینی فوائد کے علاوہ دنیوی فوائد بھی ہیں۔

چنانچہ نیند کم ہونے سے رطوبت فضلیہ کم ہوتی ہے۔ جو صحت کے لئے معین ہے۔ نیز اس سے چہرے پر نور پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک محدث کا قول ہے۔ "مَنْ كَثُرَتْ صَلٰوتُهٗ فی اللَّيْلِ حَسُنَ وَجْهُهٗ فِي النَّهَارِ" (رواه تخريج الأحاديث والآثار الواقعة في تفسير الكشاف للزمخشري) یعنی جو رات کو نماز زیادہ پڑھے گا، دن میں اس کا چہرہ خوبصورت ہو جائے گا۔ اور حد سے زیادہ سونے سے برودت بڑھ

جاتی ہے جس سے قوت فکریہ کم ہو جاتی ہے۔ اور قوت فکریہ کی کمی سے دنیا اور دین دونوں کے کام خراب ہوتے ہیں۔ جس سے اُمورِ انتظامیہ میں خلل پڑتا ہے۔ ایسے شخص کو پابندی اوقات کبھی نصیب نہیں ہوتی۔

سونے میں اعتدال

اس مجاہدہ میں بھی اعتدال مطلوب ہے۔ چنانچہ آجکل چھ سات گھنٹہ ضرور سونا چاہیئے۔ اور اگر نیند بہت غالب ہو تو اس کو دفع نہ کیا جائے۔ وظیفہ کو چھوڑ کر سو رہنا چاہیئے۔ پھر دوسرے وقت پورا کر لیا جائے اور اگر زیادہ غلبہ نہ ہو تو ہمت کر کے جاگنا چاہیئے، غلبہ کی صورت میں اگر نیند کو دفع کیا جائے تو اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ دماغ میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے۔ صفرا میں اشتعال بڑھ جاتا ہے۔ سودا میں ترقی ہو جاتی ہے۔ خیالات فاسدہ آنے لگتے ہیں اور بعض اوقات وہ ان کو الہام سمجھ کر اپنے آپ کو بزرگ جاننے لگتا ہے۔ آخر یہ ہوتا ہے کہ جنون ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا "اِذا قام أحدكم من الليل فاستعجم القرآن على لسانه فلم يدر ما يقول فليضطجع" (سنن ابن ماجه:1372) یعنی جب تم میں سے کوئی شخص رات کو اٹھے پھر نیند کے غلبہ سے قرآن اس کی زبان سے صاف نہ نکلے اور کچھ خبر نہ ہو کہ کیا زبان سے نکل رہا ہے تو اس کو لیٹ جانا چاہیئے۔

بعض لوگ تقلیل منام وغیرہ میں بہت غلو کرتے ہیں کہ اس سے جو نقصان ہو سکتا ہے اس کی طرف بھی التفات نہیں کرتے۔ اس حدیث میں اس کی اصلاح ہے اور راز اس میں دو ہیں۔ ایک یہ کہ غلو سے بعض اوقاتِ جسمانی نقصان لاحق ہو جاتا ہے جیسا کہ اوپر گذرا اور پھر ضروری عبادت بھی نہیں ہو سکتی۔ دوسرا یہ کہ جب نیند کے غلبہ سے الفاظ صحیح نہیں نکلیں گے تو جو ثواب ان الفاظ سے متعلق ہے وہ بھی حاصل نہ ہو گا۔ پھر صرف جاگنے سے کیا فائدہ ہے؟ یہ دیکھا گیا کہ رمضان شریف کے اعتکاف میں بعض حضرات پوری رات جاگتے ہیں اور دن کو کچھ سوتے اور کچھ اعمال میں مشغول ہوتے ہیں۔ اس میں اگر ضروری نیند

پوری ہو سکے تو پھر تو یہ بہت اچھی بات ہے لیکن اگر ضروری نیند پوری نہ ہو اور دن کو اتنا نہ سونے دیا جائے کہ رات کی کسر پوری ہو تو ایسا کرنا بہت خطرناک ہے۔

حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ نے اعتکاف کو اصلاحی چلے کی شکل دی جس کے گوناگوں فوائد برآمد ہوئے جو کہ حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کا امت پر بہت احسان ہے چونکہ حضرتؒ کے وقت میں رمضان گرمیوں میں آرہا تھا اس لئے دن کو رات کی کسر نکل جاتی تھی لیکن اگر رمضان سردیوں میں آجائے تو راتیں لمبی اور دن چھوٹے ہوتے ہیں ان راتوں میں معمولات میں تبدیلی لازمی ہے تاکہ سالکوں کی نیند پوری ہو ورنہ ان کو دنیاوی نقصان پہنچنے کے ساتھ ساتھ دینی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

کم سونے کا جو مجاہدہ ہے، اس پر آنے میں طریقہ کار ذرا مختلف ہوگا۔ اول اس میں دیکھنا ہے کہ کم سونا صرف اس لئے مطلوب ہے کہ اتنی غفلت نہ ہو کہ ضروریات دین میں رکاوٹ پڑے۔ پس اگر دین اور دنیا کی ضروریات پوری ہوں تو طب کے قوانین کے مطابق کسی کو جتنی نیند کی ضرورت ہے اتنی نیند کرنے سے کوئی حرج نہیں۔ اس سے زیادہ نیند چونکہ سستی پیدا کرتی ہے اس لیے اس سے بچنا لازم ہوگا۔ اس میں صرف اتنا ضروری ہوگا کہ جس وقت دین یا جائز دنیا کے لیے جتنا جاگنے کی ضرورت ہے اتنا جاگ سکے۔ اس کا طریقہ یہ ہوگا مثلاً کسی کی ضرورت کم ازکم چھ گھنٹے کی نیند ہے وہ ایک دن چوبیس گھنٹے میں چار گھنٹے سو کر اگلے چوبیس گھنٹے میں آٹھ گھنٹے سو کر دکھائیں۔ پھر دو دن چار چار گھنٹے سو کر اگلے دن دس گھنٹے سو کر اپنی ضرورت پوری کرلیں۔ اس طرح تین دن چار چار گھنٹے سو کر اگلے چوبیس گھنٹوں میں بارہ گھنٹے سو کر اپنی ضرورت پوری کرلے۔ اس طرح کرنے سے نفس بھی قابو میں آئے گا اور ضرورت بھی پوری ہوگی۔

یہ ایک مثال کے طور پر دیا گیا ہے۔ نیند کی ضرورت ہر ایک کی مختلف ہوتی ہے اس لئے سب پر ایک قانون لاگو نہیں کیا جاسکتا البتہ ایسی ترتیب بنانا جس سے سستی اور کاہلی سے بچت ہو جائے اور ضرورت پوری ہو جائے ضروری ہے۔ نیند

کی وجہ سے جو بعض فرائض پر اثر پڑتا ہے اس سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ شیخ سالک کی دوسری عادتوں کو دیکھے کہ کہیں وہ دیر سے سونے کی وجہ سے ان فرائض سے غفلت کا مرتکب تو نہیں ہو رہا ہے، اگر ایسا ہے تو اس کی درستگی کی جائے مثلاً کھانے کے اوقات، مطالعہ اور گپ شپ اس کی ترتیب میں اگر کچھ مسئلہ ہے تو اس کو درست کرنے کی کوشش کی جائے۔

2.1.2.1.3... کم بولنا

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے "مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ" یعنی جو کچھ بات نہیں بولتا ہے، مگر اس کے نزدیک نگہبان تیار ہے۔ (ق:18) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "عَنْ مَالِكٍ أَنَّهٗ بَلَغَهٗ أَنَّ عيسىٰ بْن مَرْيَمَ قَالَ: لَا تُكْثِرُوْ الكلامَ بِغير ذكر الله تعالىٰ فتقسوا قلوبكم وَأَنَّ الْقَلْبَ القَاسِىَ بَعيْدٌ مِنَ الله ولكِنْ لَّا تعلَمُونَ ۔ الآخر" (تیسیر ص444، شعب الإيمان:4668) مطلب یہ ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ذکر اللہ کے سوا تم بہت کلام نہ کیا کرو کہ اس سے تمہارے دل سخت ہو جائیں گے یعنی ان میں خشوع نہ رہے گا۔ اور یہ بالکل تجربہ کی بات ہے اور جس دل میں قساوت ہو وہ اللہ تعالیٰ سے دور ہوتا ہے، لیکن تم کو اس کی خبر نہیں ہوتی (کہ اللہ تعالیٰ سے بُعد ہوگیا کیونکہ حقیقت تو اس کی آخرت میں مشاہد ہوگی اور آثار گو یہاں بھی مشاہد ہیں مگر ان کا ادراک بوجہ بےالتفاتی کے نہیں ہوتا)۔

تشریح

کم بولنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان جتنے کلام کرتا ہے بظاہر اس کی تین قسمیں ہوتی ہیں:

(1) مفید، جس میں کوئی دین یا دنیا کا کوئی فائدہ ہو

(2) مضر، جس میں دین یا دنیا کا کوئی نقصان ہو

(3) نہ مفید ہو نہ مضر، جس میں نہ کوئی فائدہ ہو نہ کوئی نقصان

اس تیسری قسم کو ہی حدیث میں لایعنی کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ لیکن جب ذرا غور سے کام لیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تیسری قسم بھی درحقیقت دوسری قسم یعنی مضر میں داخل ہے، کیونکہ وہ وقت جو ایسے کام یا کلام میں صرف کیا گیا کہ اس میں ایک دفعہ سُبْحَانَ اللہ کہہ لیتا تو میزان عمل کا آدھا پلڑا بھر جاتا، کوئی اور مفید کام کرتا تو گناہوں کا کفارہ اور نجاتِ آخرت کا ذریعہ کم از کم دنیا کی ضرورتوں سے بے فکری کا سبب بنتا، حدیث شریف میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، "انسان کا اسلام درست اور صحیح ہونے کی ایک علامت یہ ہے کہ بے فائدہ باتوں اور کاموں کو چھوڑ دے۔" احیاءالعلوم میں ہے کہ "لایعنی کلام کا حساب ہوگا اور جس چیز کا حساب اور مواخذہ ہو، اس سے خلاصی یقینی نہیں۔"

یہ تقلیل کلام کا مجاہدہ تقلیل طعام اور تقلیل منام دونوں مجاہدوں سے زیادہ مشکل ہے۔ کیونکہ کھانے میں کچھ تو اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ نیز اگر زیادہ بھی کھائے گا، ایک دو دفعہ کھالے گا پھر کہاں تک کھائے گا، جب ہضم نہ ہوگا خود ہی تقلیل ہو جائے گی اسی طرح کہاں تک سوئے گا، کبھی تو جاگے گا، بخلاف بولنے کے کہ اس میں کچھ اہتمام ہی نہیں کرنا پڑتا نہ زیادہ بولنے سے بدہضمی ہوتی ہے اور نہ زبان چلانے سے کوئی تکلیف ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسان جس قدر حظوظ اختیار کرتا ہے، لذت کے لئے کرتا ہے سو کلام کے سوا دوسرے جس قدر حظوظ ہیں اس میں کثرت کرنے سے لذت کم ہو جاتی ہے۔ پیٹ بھرنے کے بعد پھر کھانے میں مزا نہیں آتا، نیند بھر جانے کے بعد پھر سونے سے جی گھبراتا ہے جبکہ بولنے کی لذت ختم ہی نہیں ہوتی بلکہ جتنا بولتے جاؤ اتنی ہی لذت بڑھتی جاتی ہے۔

اسی لئے تقلیل کلام سب سے زیادہ دشوار ہے مگر باوجود دشواری کے اس میں آزادی اس لئے نہیں دی گئی کہ زیادہ بولنے میں نقصانات بہت ہیں اور ان سے کئی قسم کے گناہ وجود میں آسکتے ہیں جس میں جھوٹ، غیبت، کسی انسان کا تمسخر اور نہ جانے کیا کیا اس لئے اس کی تقلیل کو مجاہدے کا ایک مستقل رکن قرار

دیا گیا ہے۔ لیکن تقلیل کلام کا یہ مطلب نہیں کہ ضروری باتوں کو بھی کم کر دے بلکہ مطلب یہ ہے کہ فضول کلام چھوڑ دے گو مباح ہی ہو باقی جو باتیں حرام ہیں جیسے جھوٹ، غیبت و بہتان وغیرہ وہ تو اس سے خود ہی چھوٹ جائیں گے کیونکہ وہ تو مجاہدۂ حقیقیہ ہیں، جو شخص مجاہدۂ حکمیہ کرے گا وہ مجاہدۂ حقیقیہ کیسے ترک کر سکتا ہے، رہا ضروری کلام سو اس کا ترک کرنا جائز نہیں چونکہ اس سے ضرورت میں حرج ہوگا یا مخاطب کو تکلیف ہوگی۔ ضرورت کی تفسیر یہ ہے کہ "لَوْلَاہُ لَتَضَرَّرَ" یعنی بات کے نہ کرنے سے نقصان ہو۔

پس جس بات کے ترک کرنے سے دین یا دنیا کا نقصان ہو وہ بات ضروری ہے۔ مثلاً تاجر کے پاس کوئی خریدار گھنٹہ بھر تک چیزوں کی قیمتیں دریافت کرتا رہے اور تاجر کو امید ہے کہ یہ ضرور کچھ خرید لے گا تو جب تک یہ امید ہو اس وقت تک خریدار سے باتیں کرنا ضرورت میں داخل ہیں کیونکہ اس صورت میں خریدار سے باتیں نہ کرنے سے دنیا کا نقصان ہوتا ہے۔ اس لئے شریعت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہ تجارت کی باتیں کرے اور جو باتیں ضرورت میں داخل ہیں ان سے قلب میں ذرہ برابر ظلمت نہیں ہوتی چنانچہ حضرات عارفین کا مشاہدہ ہے کہ ضروری گفتگو دن بھر بھی ہوتی رہے تو اس سے قلب پر اثر نہیں ہوتا چنانچہ ایک ریڑھی والا اگر دن بھر "لے لو امرود" پکارتا پھرے تو اس سے قلب پر ذرہ برابر بھی ظلمت نہ آئے گی چونکہ یہ کلام بضرورت ہے اور بے ضرورت ایک جملہ بھی اگر زبان سے نکل جائے تو دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ شریعت نے تقلیل کلام کی وہ صورت تجویز نہیں کی کہ زبان بند کر کے بیٹھ جاؤ بلکہ اس کی یہ صورت تجویز کی کہ تلاوتِ قرآن مجید میں مشغول رہو یا ذکر کرتے رہو۔ جس سے مجاہدہ تقلیل کلام کا فائدہ بھی حاصل ہو جائے کہ زبان گناہوں سے بچی رہے فضول باتیں کرنے کی عادت کم ہو جائے اور اسی کے ساتھ ثواب بھی بے شمار ملتا رہے۔ جو خاموش رہنے میں کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

ایک اہم بات

ایک اور بات جس کی طرف توجہ دلانی ضروری ہے کہ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ مفید چیزوں کی بھی ایک حد ہوتی ہے کیونکہ اس کے بعد ان کی افادیت میں یا تو کمی ہو جاتی ہے یا بعض اوقات فائدے کی جگہ نقصان ہو جاتا ہے۔ دعوت دینے کے آداب کے بارے میں تفصیلی بات ہوگئی ہے، یہاں موضوع کے لحاظ سے ایک خاص بات کی طرف توجہ دی جاتی ہے کہ بعض دفعہ دعوت دینے میں ہماری کثرت کلام سے مدعو کو نقصان ہوسکتا ہے وہ ضد میں آکر صاف انکار کر سکتا ہے جس سے بعض دفعہ نوبت کفر تک آسکتی ہے اور بعض دفعہ اس سے ہمیں بھی نقصان ہوسکتاہے کہ افادہ یعنی دوسروں کو نفع پہنچانے کے جوش میں استفادہ یعنی خود دوسروں سے نفع حاصل کرنے سے ہم محروم ہوسکتے ہیں۔ خاتم النبیین ﷺ کو جب خلوت کے اعمال کا حکم دیا گیا تو دوسرے اس سے کیسے مستغنی ہو سکتے ہیں اس لئے اتنی دعوت دینا کہ نہ خود کو نقصان پہنچے اور نہ دوسروں کو بلکہ دونوں کو نفع پہنچے اس کا سیکھنا ضروری ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ہفتے میں دو دفعہ سے زیادہ وعظ کہنے سے منع فرمایا تھا۔

چونکہ اس مسئلے کا تعلق عوام کے ساتھ بھی ہے جو ان احتیاطوں کو خاطر میں لانا کم علمی سے ممکن ہے ضروری نہ سمجھے اس لئے مشائخ اور جماعت کے ذمہ داروں کو اس طرف خصوصی توجہ کرنی چاہیے۔ اس وقت اگر بعض حضرات نے بوجوہ تقلیل طعام اور تقلیل منام کے مجاہدے کو متروک سمجھا اور بعض حضرات نے اگر تقلیل کلام اور تقلیل خلط مع الانام کو متروک سمجھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجاہدہ سرے سے ختم ہی ہوا حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔ نہ تو تقلیل کلام اور تقلیل منام کلیتاً متروک ہے اور تقلیل کلام اور تقلیل خلط مع الانام سے غافل ہونا مناسب۔ یہ ہر شخص کے حال کے مطابق بات ہوتی ہے اس لئے سب کو چاہیے کہ اس مسئلے میں فیصلہ شیخ پر چھوڑا جائے کہ وہ کسی کے لئے کیا مجاہدہ تجویز کرتے ہیں، واللہ اعلم۔

طریق علاج

بات کرنے سے قبل تھوڑی دیر تامل کریں اور سوچیں کہ اس بات سے اللہ تعالیٰ جو کہ سمیع و بصیر ہیں ناخوش تو نہ ہونگے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ کوئی بات منہ سے گناہ کی نہ نکلے گی۔ اور اگر پھر بھی طبیعت میں ایسی بات کرنے کا تقاضا ہو تو اس وقت ہمت سے کام لے، اگر کوئی بات ایسی منہ سے نکل جائے تو اس کا تدارک اس طرح کرے کہ فوراً توبہ کرے اور اگر کسی کو گالی دی ہو یا کسی سے تمسخر کیا ہو یا چغل خوری یا غیبت کی ہو تو توبہ کے بعد اس صاحبِ حق سے بھی معافی مانگے اور اگر کسی وجہ سے معاف کرانا دشوار ہو تو اس شخص کے لئے اور اس کے ساتھ اپنے لئے استغفار کرتے رہیں۔ اس طرح "اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَنَا وَلَہٗ" یعنی اے اللہ ہماری اور اس کی مغفرت فرما۔ حضرت شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے ان دو شعروں میں خاموشی کے فوائد کے مضمون کو کس کمال جامعیت کے ساتھ بیان فرمایا ہے،

کوئی کام زیادہ لب سینے سے مؤثر نہیں سوجھا
خموشی سے مرے دل نے کوئی بہتر نہیں سوجھا

فوائد اس کے اتنے ہیں زبان پر آنہیں سکتے یعنی میرے ذہن میں خاموشی سے بہتر کوئی مضمون نہیں آتا اور خاموشی اتنے فوائد رکھتی ہے کہ ان کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔

سینہ ہارا خامشی گنجینہ گوہر کند
یاد دارم از صدف ایں نکتہ سر بستہ را

خامشی سینے کو گوہر سے مزین کرتی ہے
راز سربستہ یہ سیپی نے مجھے سمجھایا ہے

مطلب یہ ہے کہ سیپی پانی کے قطرے کو اپنے اندر لے کر بند ہو جاتی ہے

تو وہ پانی کا قطرہ موتی بن جاتا ہے، اس طرح انسان کا سینہ بھی لب بند کرنے سے حکمت کے موتیوں کا خزانہ بن جاتا ہے۔

ان سب پر عمل تب ہوسکتا ہے کہ خاموش رہنا آجائے اس لئے ابتدا میں خاموش رہنے کے لئے مجاہدہ کی ترتیب مناسب رہے گی۔ حدیث شریف میں آتا ہے "مَنْ صَمَتَ نَجَا" یعنی جو چپ رہا اس نے نجات پائی۔ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ آدمی بالکل بات نہ کرے لیکن یہ ضرور ہونا چاہیے کہ ایسی بات نہ کرے جس میں گناہ ہو اور لایعنی سے بچنے میں دین کی حفاظت ہے۔ اس لئے کم بولنے کی عادت ڈالنے کے لئے پہلے بالکل خاموش رہنے کی عادت ڈالنی ہوگی اور بعد میں ضرورت کے مطابق بولنے کی اجازت دی جائے گی۔

خاموش رہنے کا مجاہدہ

جہاں زوردار بحث ہو بالخصوص جو اپنی دلچسپی کا موضوع زیر بحث ہو وہاں بتکلف خاموش رہنا کم از کم دس منٹ تک اور دل دل میں دعا کرنا کہ اللہ تعالیٰ کسی اور ساتھی کے دل میں مناسب بات لے آئے اور وہ بیان کر لے۔ یہ مجاہدہ بتدریج آدھے گھنٹے تک بڑھایا جائے تاکہ پہلے تولیں پھر بولیں پر عمل کرنے کے لئے سوچنے کا وقت ملے۔ پھر اس پر عمل ہو۔

2.1.2.1.4... لوگوں کے ساتھ کم ملنا جلنا

حدیث شریف میں آتا ہے کہ بری صحبت سے خلوت اچھی ہے اور اچھی صحبت خلوت سے اچھی ہے(بیہقی)۔

معاشرے میں آنکھ کان منہ کا استعمال عموماً غلط ہوتا رہتا ہے جس سے دل متاثر ہوتا ہے دوسری طرف دل اگر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو تو آنکھ کان منہ ذہن صحیح استعمال ہوتے ہیں۔ اس سے پتا چلا کہ دل ان اعضاء کو متاثر کرتا ہے اور یہ اعضاء دل سے اثر لیتے ہیں لہٰذا ان کی اصلاح کی کیا صورت بن سکتی ہے۔ متقدمین صوفیاء اس کے لئے خلوت تجویز فرماتے تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ

یہ اعضاء غلط استعمال جب نہیں ہوتے اور ذکر اللہ کے ذریعے دل کی صفائی ہوتی تو دل اللہ تعالیٰ کی یاد کے ساتھ مانوس ہو جاتا اور بیدار ہو جاتا، ساتھ ساتھ شیخ کے ساتھ جلوت سے یہ مزید منور ہوتا اور جب ماحول میں باہر آتے تو دوسرے لوگ ان سے مستفید ہوتے لیکن ان کے ساتھ مشغول ہونے سے جو اثر ان کے قلوب پر پڑتا تو اس کو پھر مشائخ کی صحبت اور خلوت و اعتکاف کے ساتھ دور فرماتے۔ حضرت مولانا الیاسؒ سے بھی ایسا ہی منقول ہے کہ "جب میں گشت میں جاتا ہوں تو صلحاء کی جماعت کے ساتھ جاتا ہوں لیکن پھر بھی دل متاثر ہو جاتا ہے تو اس کے لئے پھر میں یا سہارنپور شریف جاتا ہوں یا رائے پور شریف جاتا ہوں یا پھر مسجد میں اعتکاف کرتا ہوں۔"

قلت خلط مع الانام کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں سے غیر ضروری میل جول نہ بڑھایا جائے، یاد رکھنا چاہیئے کہ ماسویٰ اللہ سے تین قسم کے تعلقات ہیں۔

(1) محمود تعلق: جس کا شریعت نے امر فرمایا ہے وہ تو عین اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے۔ اس کو ختم کرنا ناجائز ہے۔

(2) مذموم تعلق: جس کی شریعت میں ممانعت ہے۔ اس کو ختم کرنا واجب ہے۔

(3) مباح تعلق: جو نہ طاعت ہے نہ معصیت، اس کو بالکل ختم کرنا ضروری نہیں البتہ اس کو کم کرنا ضروری ہے۔

جہاں تعلق کو ختم کرنے کی تعلیم ہے وہاں مراد محمود تعلق نہیں بلکہ مذموم و مباح ہے۔ مگر مذموم کو تو ترک کیا جائے گا اور مباح کو کم کرنا ہوگا اور جب تک خالق کے ساتھ تعلق راسخ نہ ہو، تو مخلوق کے ساتھ بلا ضرورت تعلق سراسر نقصان ہے اور جو فائدہ اس میں سوچا جاتا ہے کہ اس میں مخلوق کے حقوق کی ادائیگی ہے تو مخلوق کا حق بھی جبھی ادا ہوتا ہے کہ خالق کے ساتھ تعلق راسخ ہو جائے۔ ورنہ نہ تو خالق کا حق ادا ہوتا ہے اور نہ لوگوں کا حق۔ یہ ایک کا نہیں بلکہ ہزاروں اہلِ بصیرت کا تجربہ ہے۔ اور ہم سے زیادہ اہلِ تمکین نے ایسے تعلقات کو چھوڑ دیا۔ حضرت ابراہیم بلخی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ شجاع کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کے واقعات

معلوم ہیں۔ خلفائے راشدین پر اپنے آپ کو قیاس نہ کیا جائے۔

خود کو پاکوں پہ کر قیاس نہیں

قول فیصل اس خلوت کے بارے میں یہ ہے کہ جس شخص کو کوئی ضروری حاجت دینی یا دنیوی دوسروں کے ساتھ نہ ہو اور نہ دوسروں کو کوئی ایسی دینی یا دنیوی حاجت اس شخص کے ساتھ ہو۔ اس کے لئے خلوت جائز ہے، بلکہ افضل ہے۔ خصوصاً فتنوں اور شرور کے دنوں میں جب کہ آپس میں ملنے جلنے کی مشکلات اور تشویشات و ایذاؤں پر صبر کرنے کی توقع و ہمت نہ ہو۔ احادیث میں جو ترغیب خلوت کی آئی ہے۔ وہ ایسی ہی حالت میں ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے "رَجُلٌ مُعْتَزِلٌ فِي شِعْبٍ مِنَ الشِّعَابِ يَعْبُدُ رَبَّهٗ وَيَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّهٖ" دوسری حدیث میں ہے کہ "يُوشِكُ أَنْ يَّكُونَ خَيْرَ مَالِ الْمُسْلِمِ غَنَمٌ يَتْبَعُ بِهَا شَعَفَ الْجِبَالِ وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ يَفِرُّ بِدِينِهٖ مِنْ الْفِتَنِ" (اخرجه البخاري) یعنی ایسا وقت نزدیک آنے والا ہے کہ مسلمان کا بہترین مال بکریاں ہوں گی، جن کو ساتھ لئے پہاڑیوں کی چوٹیوں اور بارش کے جمع ہونے کی جگہوں یعنی (نالوں میں جبکہ وہ خشک ہو جائیں) اپنے دین کو لئے ہوئے فتنوں سے بھاگا بھاگا پھرے گا۔ اصحابِ کہف کے واقعے سے بھی سبق حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اور جس شخص کا دوسروں کے ساتھ یا تو کوئی ضروری حاجت وابستہ ہو، خواہ دنیوی ہو جیسے اہل و عیال کے لئے نفقہ کی تلاش جبکہ توکل پر قادر نہ ہو یا دینی ہو، مثلاً تحصیل علوم ضروریہ وغیرہ۔ اس کے لئے خلوت جائز نہیں۔ اس طرح اگر اس کے ساتھ دوسروں کی حاجات دنیوی یا دینی متعلق ہوں تو بھی خلوت جائز نہیں اور بعض احادیث سے جو خلوت کی ممانعت سمجھ میں آتی ہے، وہ ایسی ہی دونوں حالتوں پر محمول ہے۔ جیسا کہ حضرت عثمان ابن مظعون کو تبتل یعنی کنارہ کشی سے منع فرمایا گیا کہ اس وقت ان کو بھی تحصیل علوم دین کی حاجت تھی۔ ادھر مسلمانوں کو بھی ان کی طرف دینی حاجت تھی بالخصوص اعلاء کلمۃ اللہ و ترقی اسلام ان کی بہت بڑی ضرورت تھی۔ یہ تفصیل اس خلوت کے بارے میں ہے

جس کو دائمی طور پر اختیار کرنا ہو۔ اگر اس سے مراد خلوت چند روزہ ہو تو اس کی ضرورت بسا اوقات مبتدی سالک کے لئے واقع ہوتی ہے۔

خلوت کے فائدے

گناہوں سے بھی اجتناب ہوتا ہے۔ بشرطیکہ ایسی گوشہ نشینی ہو جس میں نگاہ کی بھی حفاظت ہو، کان کی بھی حفاظت ہو، دل کی بھی حفاظت ہو، قصداً کسی غیر کا خیال دل میں نہ لائے، اگر آجائے تو ذکر میں مشغول ہو کر اس کو دفع کر دے۔ ایسی عزلت یعنی گوشہ نشینی میں واقعی گناہوں سے بہت حفاظت ہوگی۔ اور ظاہر ہے دفع مضرت جلب منفعت پر مقدم ہے یعنی موہوم فائدے پر یقینی نقصان سے بچنا مقدم ہے تو ایسی صورت میں گوشہ نشینی اختلاط پر مقدم کیوں نہ ہوگی۔ جبکہ اختلاط میں گو منافع بہت ہیں مگر ساتھ ہی یہ نقصان بھی ہے کہ اس میں اکثر گناہ ہو جاتے ہیں۔ دوسرے اختلاط کے ساتھ قلت کلام بہت دشوار ہے۔ یہ کام صدیقین و کاملین کا ہے ورنہ اکثر اختلاط میں فضول باتیں بہت کرنی پڑتی ہیں۔ جن لوگوں کا وقت خلوت کے لئے مخصوص نہیں ہوتا، رفتہ رفتہ ان کا قلب انوار سے بالکل خالی ہو جاتا ہے۔

اختلاط کے فائدے

اور جن حالات میں بعض افراد کے لئے جلوت یعنی اختلاط مفید ہے ان کے لئے اس کے یہ فوائد ہیں۔

(1) تعلیم و تعلم اس پر موقوف ہے۔ گوشہ نشینی سے تعلیم و تعلم کا باب بند ہو جاتا ہے۔

(2) اختلاط میں خدمت خلق کا موقع ملتا ہے۔

(3) جماعت کی فضیلت اختلاط ہی سے حاصل ہوسکتی ہے، جو شخص گوشہ نشین ہوگا وہ جماعت کا ثواب اور خدمت خلق کی فضیلت سے محروم رہے گا۔

(4) اس سے تواضع پیدا ہوتی ہے۔

(5) دین کا فیض ہوتا ہے۔ اختلاط کے بغیر بزرگوں سے فیض حاصل کرنا دشوار ہے۔

مختصر نتیجہ

سالکین کے لئے تو شیخ یہ تجویز کرے گا کہ اس کے لئے کن حالات میں خلوت مفید ہے اور کن حالات میں جلوت کیونکہ ہر ایک کے حالات مختلف ہوتے ہیں جن کا کسی کتاب میں احاطہ ممکن نہیں۔ مشائخ کے لئے البتہ افادے کے لئے جلوت مفید ہوتی ہے لیکن نسبت مع الخالق کو تازہ رکھنے کے لئے کچھ وقت بالخصوص رات کو جس میں افضل ترین رات کا آخری حصہ ہے نکالنا چاہیے جس میں وہ ہوں اور ان کا اللہ تعالیٰ

ہے عاشق و معشوق میں جو راز درمیاں
اس کی خبر کراماً کاتبین کو ہے کہاں

طریق کار

ہر کام اپنے اوقات مقررہ پر کریں۔ دنیا کا کام اپنے وقت میں اور وظائف اپنے وقت میں۔ حتیٰ کہ گاہ گاہ لطیف اور مختصر مزاح بھی اپنے اور دوسرے مسلمانوں کی تفریح و تطیب قلب کے لئے اپنے موقع میں کر لینا چاہئے۔ اس طرح سب کام چلتے رہیں گے ورنہ بالکل گوشہ نشین ہونے سے بعض اوقات طبیعت میں شوق اور امنگ کا مادہ ضعیف ہو جاتا ہے اور اس کے بغیر کام چلنا دشوار ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی خدمت کرنا سالک کے لئے بہت ہی نافع ہوتا ہے۔ مگر جتنی ضرورت ہو اتنا تو ٹھیک ہے اس سے زیادہ اختلاط نہیں ہونا چاہیے کہ اس سے روحانی نقصان کا خطرہ ہے۔ سالک کے لئے گوشہ نشینی بہتر ہے۔ زیادہ تعلقات نہیں بڑھانے چاہئے نہ دوستی نہ دشمنی، کہ ذکر اللہ میں خلل ہوگا۔ جب تک خلوت میں دل خدا تعالیٰ کے ساتھ لگا رہے، خلوت میں رہے اور جب خلوت میں انتشار اور ہجوم خطرات ہونے لگے تو مجمع میں بیٹھے۔ اس سے خطرات دفع

ہونگے اور اس وقت یہ جلوت بھی خلوت کے حکم میں ہے۔

یہ چار قسمیں قلت کلام، قلت طعام، قلت منام اور قلت اختلاط مع الانام اجمالی مجاہدہ کی ہیں۔ان اجمالی مجاہدات کے علاوہ بعض مجاہدات کی وقتی اہمیت بہت زیادہ ہے اس لئے ان کی بھی تفصیل دی جاتی ہے۔

2.1.2.1.5... حبِ جاہ کو کم کرنے کا مجاہدہ

(1) سلام میں پہل کرنا۔
(2) اپنے مخالفین کے لیے دعا کرنا۔
(3) ان کی جائز چیزوں کی تعریف کرنا۔
(4) مسجد والوں کی جوتیوں کو سیدھا کرنا۔
(5) لوگوں کے لیے بازار سے سودا لانے کی ممکن کوشش کرنا۔
(6) غریب لوگوں کے ساتھ اگر کوئی مفسدہ نہ ہو تو اصلاح کی نیت سے بیٹھنا۔

2.1.2.1.6... حبِ مال کو کم کرنا۔

(1) اللہ تعالیٰ کے راستے میں نفلی انفاق کرنا۔
(2) صالحین کی کبھی کبھی دعوت کرنا۔
(3) اس کے بارے میں اگر کوئی عالم ہو تو وہ مراقبہ میں اپنے آپ کو تلقین کرتے رہے اور مال اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کی ترغیبات کو تصور میں سامنے لاتا رہے۔

2.1.2.1.7... مجاہدہ غضِ بصر

یہ مجاہدہ آج کل بہت ضروری ہے۔ اس کے لئے خلوت میں پہلے دن پانچ منٹ نیچے دیکھنا ہوگا اور روزانہ پندرہ دن تک ایک ایک منٹ بڑھانا ہوگا۔ اس کے بعد جلوت میں آکر پانچ منٹ نیچے دیکھنا ہوگا اور پھر روزانہ پندرہ دن تک ایک ایک منٹ بڑھانا ہوگا۔ اس سے نظریں نیچے کرنے کی مشق ہو جائے گی جس کو

بعد میں برقرار رکھنا ہوگا۔

اس کے علاوہ کچھ نفسیاتی مجاہدات بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ان سب کی ضرورت صرف فرائض واجبات کی تکمیل اور حرام اور مکروہ تحریمی سے بچنے تک ہے۔ اس کے بعد سنتوں پر بتدریج عمل بڑھانا ہوتا ہے کیونکہ اس پر عمل بڑا مجاہدہ ہے۔ اس سے باقی تکمیل ہوجاتی ہے۔

2.1.2.2... فاعلہ

فاعلہ کی بھی دو قسمیں ہیں۔

2.1.2.2.1... جس میں خطرہ نہیں مثلاً ذکر، شغل اور مراقبہ

2.1.2.2.2... جس میں خطرہ ہے مثلاً تصورِ شیخ، عشقِ مجازی اور سماع

ان میں سے ہر دو کو ترتیب وار ذکر کیا جاتا ہے۔

2.1.2.2.1... وہ فاعلہ جس میں خطرہ نہیں

2.1.2.2.1.1... ذکر

صوفیاء کی اصطلاح میں ذکر سے مراد یہ ہے کہ انسان خدا کی یاد میں تمام غیرِ خدا کو بھول جائے اور دل کی توجہ سے خدا کا قرب اور معیت حاصل کرے جیسا کہ حدیثِ قدسی میں ہے کہ "أَنَا مَعَ عَبۡدِیۡ اِذَا ذَکَرَنِیۡ وَتَحَرَّکَتۡ بِیۡ شَفَتَاہُ" (رواه البخاري) کہ جب میرا بندہ مجھ کو یاد کرتا ہے اور میرے نام سے اس کے ہونٹ ہلتے ہیں تو میں اس کے ساتھ ہو جاتا ہوں "أَنَا جَلِیۡسُ مَنۡ ذَکَرَنِیۡ" (اثر مسند امام احمد کتاب الزھد) اور جو مجھے یاد کرتا ہے میں اس کا ہمنشین ہوں۔ اور ارشادِ ربانی ہے کہ "وَسَبِّحُوۡهُ بُكۡرَةً وَّ اَصِيۡلًا" (الاحزاب:42) اور خدا کی صبح شام تسبیح کیا کرو۔ نیز فرمایا کہ "فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰى جُنُوۡبِكُمۡ" (النساء:103) پس اٹھتے بیٹھتے، لیٹتے ہمہ وقت خدا کو یاد کرتے رہا کرو جیسا کہ محاورہ ہے کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو یاد کیا کرو۔ ان آیات و احادیث سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو ہمہ وقت ذکر مطلوب ہے۔ اس کی مدح بھی ہے، فضیلت بھی

ہے اور ترغیب بھی ہے۔

لہٰذا پوری توجہ سے یادِ الٰہی میں اس طرح منہمک ہونا چاہیے کہ بندہ اپنے آپ سے بالکل بے خبر ہو جائے۔ یہ حقیقی ذکر ہے کہ نفس کی خواہش سے کچھ بھی نہ کرے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اور اس کی خوشنودی کے لئے کرے۔ "كُلُّ مُطِيْعٍ لِلّٰهِ فَهُوَا ذَاكِرٌ" کے مطابق ہر عمل میں ذکر کا ظہور ہو جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت ذکر اللہ ہے۔ مثال سے اس کی وضاحت کی جاتی ہے کہ روزہ میں انسان جب تنہائی میں بھی کچھ نہیں کھاتا، کیوں؟ اس لئے کہ اس کو اللہ تعالیٰ یاد ہے اور نماز میں کس کے سامنے سجدہ ریز ہے یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے یاد ہے۔ یہی اصل ذکر ہے بشرطیکہ کہ کامل استحضار کے ساتھ ہو۔ علاجی ذکر اسی استحضار کو بڑھانے کا طریقہ ہے۔

ذکر کی قسمیں

ذکر کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن اس کی دو بڑی قسمیں مندرجہ ذیل ہیں۔ مسنون ذکر اور علاجی ذکر۔

2.1.2.2.1.1.1... مسنون ذکر

مسنون ذکر غذا کی طرح ہے اور علاجی ذکر دوا کی طرح۔ مسنون ذکر اصل ذکر ہے اس پر ثواب ہے اور کثرت سے اس کے کرنے کا حکم قرآن میں آیا ہے اور احادیثِ شریفہ میں اس کے بارے میں بے شمار فضائل موجود ہیں لیکن اس ذکر سے وہ فوائد تب حاصل ہوسکتے ہیں جب انسان روحانی طور پر بیمار نہ ہو جیسا کہ انسان کو غذا تب نفع پہنچاتی ہے جب صحت حاصل ہو۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ جب تک مطلوبہ روحانی صحت حاصل نہ ہو تو ذکر نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ذکر سے انسان کی روحانی جان کی بقا ہے آپ ﷺ نے فرمایا "مَثَلُ الَّذِی يَذْكُرُ رَبَّهٗ وَالَّذِی لَا يَذْكُرُ رَبَّهٗ ـ مَثَلُ الحَيِّ وَالمَيِّتِ" (رواه البخاري) یعنی جو اپنے رب کو یاد کرتا ہے اور جو نہیں کرتا ان کی مثال زندہ اور مردہ کی طرح ہے

اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے مولانا یحییٰؒ اور مولانا الیاسؒ سے ارشاد فرمایا کہ ذکر چاہے کتنا ہی غفلت سے کیا جائے سے فائدہ ہوتا ہے کیونکہ ذکر ہی غفلت کو دور کرنے والا ہے لیکن صحت کی حالت میں غذا کا جو فائدہ ہے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ روحانی صحت جب حاصل ہو تو پھر ذکر اللہ کا کتنا فائدہ ہوگا۔

2.1.2.2.1.1.2... علاجی ذکر

آقائے نامدار جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ:"إِنَّ لِكُلِّ شَيْءٍ صِقَالَةً، وَإِنَّ صِقَالَةَ الْقُلُوبِ ذِكْرُ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ، وَمَا مِنْ شَيْءٍ أَنْجَى مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ . قَالُوا: وَلَا الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ؟: قَالَ وَلَوْ أَنْ يَضْرِبَ بِسَيْفِهِ حَتَّى يَنْقَطِعَ (رواه البيهقي في الدعوات الكبير) (مشكوة المصابيح) ۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ وہ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا۔ ہر چیز کو صاف کرنے والی چیزیں ہوتی ہیں اور دلوں کو صاف کرنے والا اللہ کا ذکر ہے۔ "صقالہ" مانجھنے کو کہتے ہیں کہ جس سے تابنے، پیتل، لوہے کے برتن مانجھے جاتے ہیں۔ اور برتن میں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سے اللہ کے ذکر سے دل کا زنگ دور ہو جاتا ہے آگے فرماتے ہیں بندے کو کوئی شے زیادہ نجات دینے والی نہیں (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے) عرض کیا اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد بھی نہیں (آنحضور ﷺ نے) فرمایا یہاں تک تلوار چلائے کہ وہ ٹوٹ جائے تو بھی نہیں اس حدیث کو بیہقی نے دعوات کبیر میں روایت کیا۔

اصل میں ذکر سے اور تمام طاعات سے صحیح معنوں میں انسان تب فائدہ حاصل کرسکتا ہے جب اس میں اللہ تعالیٰ یاد ہو، اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہو اور آپ ﷺ کے طریقے پر ہو۔ اس مقصد کے لئے کہ ذکر میں اور ہر طاعت میں اللہ یاد ہو اور اسی کے لئے ہو، اس کے لئے وہ تمام موانع دور کرنے ضروری ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور اسی کے لئے ہر کام کو کرنے سے روکنے والے ہوں گے اور وہ ہیں نفس کی خواہشات اور دل کے منفی جذبات۔ یہ چیزیں دور ہوتی ہیں

مجاہدہ اور علاجی ذکر سے۔ حدیث شریف میں جو ذکر کو صقالہ فرمایا گیا ہے اس سے یہی علاجی ذکر مراد ہے کیونکہ دنیا کی محبت "حُبُ الدُّنْیَا رَأْسُ کُلِّ خَطِیئَۃ" کے مصداق ہر برائی کی جڑ ہے اور دل سے دنیا کی محبت کو نکالنے کے لئے علاجی اور اصلاحی ذکر کیا جاتا ہے۔

نماز سے اللہ تعالیٰ کی یاد حاصل ہوسکتی ہے لیکن دنیا کی محبت حائل، حج سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوسکتا ہے لیکن دنیا کی محبت حائل، جب تک اس حائل کو دور نہیں کیا جائے گا اس وقت تک ان عبادات کے ثمرات کو مکمل طور پر نہیں حاصل کیا جاسکتا۔خود مسنون ذکر سے بعض دفعہ عجب ہو جاتا ہے اور بجائے اللہ تعالیٰ کے اپنے اوپر نظر جاتی ہے کہ میں بڑا ذاکر ہوں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ علاجی ذکر سے ہی مسنون ذکر کے اور جملہ طاعتوں کے ثمرات حاصل کیے جاسکتے ہیں بشرطیکہ نفس کی بھی اصلاح ہو چکی ہے۔

علاجی ذکر اور اس میں ثواب

علاجی ذکر علاج کے لئے کیا جاتا ہے اس لئے اس سے علاج ہو جاتا ہے۔ اس سے ثواب بھی ہوتا ہے یا نہیں اس میں مشائخ کے مختلف اقوال ہیں بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ اس میں ثواب کی نیت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ یہ منصوص نہیں ہوتے تاکہ بدعت کا احتمال نہ ہو اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس میں الفاظ ذکر سے ثواب ہوتا ہے اور اس میں جو ضرب و جہر علاجاً شامل کیا گیا ہے اس میں ثواب کی نیت نہیں کرنی چاہیے۔ حضرت تھانویؒ سے ایک سالک نے پوچھا تھا کہ ذکر نفی و اثبات میں تجوید کے قواعد کا خیال نہیں رکھا جاتا فرمایا اس میں مقصود کیفیت حاصل کرنا ہے الفاظ نہیں یعنی اس میں الفاظ ذریعہ ہے کیفیت کے یہ بذات خود مقصود نہیں۔

علاجی ذکر میں اجتہاد

چونکہ یہ ذکر علاج ہے اور جیسا کہ طب میں اجتہاد کبھی بند نہیں ہوسکتا اس

لئے اس میں بھی اجتہاد کا سلسلہ جاری ہے کیونکہ یہ سب منصوص نہیں، تجرباتی ہیں۔ جس شیخ نے اس میں تجربے سے جو سیکھا آگے اس کو بڑھا دیا۔ جیسے فقہ میں مجتہد مطلق ہیں اور مجتہد فی المذھب ہیں اسی طرح اس میں سلسلوں کے جو بانی ہیں انہوں نے یہی کام کیا اور اپنے سلسلے کے بنیادی اصولوں کا تعین کیا۔ آگے ان کے متبعین نے وقت کے ساتھ ساتھ بضرورت اس میں کمی بیشی کی لیکن ان کا اصل رنگ چھایا رہا۔ اس لئے سلسلے باوجود اس کے کہ ان کے طرق میں کافی تبدیلیاں آچکی ہیں ان کی اصل بنیادیں موجود ہیں البتہ چونکہ یہ ذرائع کے طور پر ہیں اور مقصود نہیں اس لئے ان کو اس درجے سے آگے نہیں بڑھانا چاہیے اور کسی کا مقام اس بنیاد پر نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ کونسے سلسلے ہیں اس بنیاد پر ہو گا کہ ان کو تقویٰ کس درجہ کا حاصل ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ کا قرب کتنا حاصل ہے اور چونکہ اس کا حتمی پتا صرف اللہ تعالیٰ کو ہی ہوسکتا ہے اس لئے ہم بھی بس اس حد تک بات کرسکتے ہیں، حقیقت حال کا پتا اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

چونکہ علاجی ذکر اجتہادی اور حسبِ ضرورت ہوتا ہے اس لئے اس میں تبدیلی بھی اجتہادی اور حسبِ ضرورت ہوتی ہے اس لئے اگر مروجہ اذکار سے ضرورت پوری ہو رہی ہو تو اس میں تبدیلی بلا ضرورت ہوگی اور اگر پوری نہ ہو رہی ہو اور حالات کی تبدیلی کی وجہ سے اس میں تبدیلی ناگزیر ہو تو اس میں تبدیلی ضروری ہوگی اسی لئے آنے والے سطور میں مروجہ اذکار کی بعض قسمیں دی جا رہی ہیں تاکہ اگر ان سے استفادہ ممکن ہو تو ان سے استفادہ کیا جائے، بلاضرورت تبدیلی کر کے انتشار کے باعث نہ ہوں اور اگر دوسری صورت ہو تو پھر اجتہاد کا دروازہ تو کھلا ہے۔ ممکن ہے جو قسمیں ہم بیان کر رہے ہوں ان میں بعض مروجہ اذکار تک ہماری رسائی نہ ہوئی ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ ہمارے دیئے ہوئے اذکار ہی درست ہیں باقی غلط، حالات کو دیکھ کر ان سے استفادہ ممکن ہو تو بضرورت استفادہ کیا جائے۔

اذکار کا گرم اور سرد ہونا

جہاں تک اذکار کے گرم اور سرد ہونے کی بات ہے اس کے بارے میں جتنی باتیں ہیں وہ تجرباتی ہیں اس لئے نہ تو اس کا انکار ہے اور نہ ان پر اصرار ہے البتہ چونکہ طبعیتیں بھی مختلف ہیں اس لئے مختلف اذکار کا مختلف لوگوں پر مختلف اثر ہوگا اس لئے اس کے لئے کوئی حتمی قاعدہ کلیہ بنانا آسان نہیں تاہم یہ بات تو بالکل صاف ہے کہ شیخ کامل ہوتا اس لئے ہے کہ وہ مرید کا مزاج اور اس کے حالات دیکھ کر علاج کرے۔ کسی کو مجاہدہ کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے کسی کو ذکر مراقبہ کی اور ان میں بھی وقت کے ساتھ کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ حضرت حلیمی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ کسی شیخ کو کشف نہ بھی ہوتا ہو لیکن اگر وہ کامل ہو تو اس کو مرید کے بارے اتنا کشف ہوجاتا ہے جتنی کہ ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے شیخؒ سے ایک دن کسی نے جو باہر جارہا تھا پوچھا کہ کیا میں "اللّٰہُ اللہ" کرلیا کروں حضرتؒ نے فرمایا کہ ہاں کرو وہ باہر نکل گیا تو بعد میں حضرتؒ نے اس کو واپس بلایا اور فرمایا کہ نہیں تم "اللّٰہُ اللہ" کرنے کی بجائے درود شریف پڑھا لیا کرو۔ خود میرا ذکر مدت دراز تک حضرتؒ نے 100 دفعہ "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ"، 100 دفعہ "اللّٰہُ اللہ"، 100 "اللہ" سے زیادہ نہیں بڑھایا۔ میرے بار بار درخواست کرنے کے باوجود فرماتے کیا تیرے پاس وقت ہے اور نہیں بڑھایا کرتے۔ اس کے بعد "اِلَّا اللہ" 100 دفعہ کا اضافہ فرمایا اور کچھ عرصہ کے بعد پھر اچانک ایک دن فرمایا جونسا ذکر کرنا چاہو اور جتنی مرتبہ چاہو کرسکتے ہو۔ اس وقت میرے مراقبات خود بخود شروع ہوگئے تھے۔

علاجی ذکر کی مروجہ اقسام

غور طلب: یہ حصہ صرف مشائخ کرام کے لئے ہے زیر تربیت حضرات اس سے براہِ راست استفادہ کی کوشش نہ کریں۔

یوں تو ذکر کی اقسام بہت ہیں جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا لیکن چونکہ حدیث

شریف میں "اَفْضَلُ الذِّکْرِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" (ترمذی) آیا ہے اس لئے اکثر مشائخ اس ذکر سے ابتداء کرتے اور اس کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس کو نفی اثبات کا ذکر کہتے ہیں۔ کم و بیش ہر سلسلے میں یہ کسی نہ کسی رنگ میں موجود ہے چاہے لسانی چاہے جہری چاہے خفی۔ یہ سارے اذکار کی جان ہے، ایک تو یہ کہ یہ مسنون ذکر بھی ہے اور اس کی ضرب بھی آسان ہے اور اس کو کرنا بھی آسان ہے۔ قادریہ سلسلے میں اگر غور کیا جائے تو اس کی ابتدا میں سانس کے ساتھ جو "ھُو" کی ضرب تھی وہ ان کا خاص ذکر تھا، اسی سے قادری مشائخ نے "اللّٰہ ھُو" اور "ھُوَ اللّٰہ" کا ذکر بھی بنایا تھا۔ "ھُو" اسم ضمیر ہے اس لئے اس ذکر میں ذات کی طرف اشارہ ہے ذات کے نام کی طرف نہیں اس لئے اگر کسی کو اس سے مناسبت ہو تو اس سے ذاتِ باری تعالیٰ کا استحضار بغیر کیفیت و تشبیہ کے بہت جلدی نصیب ہوسکتا ہے۔ احقر نے اپنے اذکار میں قادریہ طریقے کی مناسبت سے جو "لَا إِلٰہَ اِلَّا ھُو" کا ذکر منتخب کیا ہے اس کی وجہ بھی ان دو اذکار نفی اثبات اور ھو کا جمع کرنا ہے۔

بعض حضرات کو اس ذکر سے اشکال ہوتا ہے کہ یہ ثابت ہے یا نہیں تو بندہ عرض کرتا ہے کہ اگر یہ ثابت نہیں تو پھر کونسا ذکر ثابت ہے۔ "ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ إِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُھَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ" (الحشر:23) یعنی اس آیت کریمہ کو اگر غور سے دیکھا جائے تو دائیں بائیں ہر دو جانب سے اس کلمہ "لَا إِلٰہَ اِلَّا ھُو" کا تعارف ہے کہ وہ اللہ ہے کہ اس کے بغیر کوئی الہٰ نہیں جو ملک قدوس ہے سلام مؤمن ہے مھیمن ہے عزیز ہے جبار ہے اور متکبر ہے۔ خط کشیدہ حصے پر اچھی طرح غور کیا جائے تاکہ یہ بات خوب سمجھ میں آجائے۔

سہروردی سلسلے کا خاص ذکر "حق اللّٰہ" تھا۔ اب بھی جو ملنگ لوگ ہیں یہ جوش میں ایک نعرہ مارتے ہیں "حق اللّٰہ" غالباً یہ اسی کی باقیات میں سے ہے، اسی سے بعد میں "حق ھُو" اور "ھُو حق" کا ذکر شروع ہوا۔ بارہ تسبیح میں جو

"اِلَّا اللّٰہ" کا ذکر ہے وہی چشتیہ سلسلے کا خاص ذکر ہے اس لئے جس کی نسبت چشتی ہو اس کو نفی اثبات جہر و ضرب کے ساتھ اور "اِلَّا اللّٰہ" جو ضرب کے ساتھ ہو، سے اس کو کافی فائدہ ہو گا۔ "اللّٰہ ھُو" اور "ھُو اللّٰہ" کا ذکر بھی سلسلوں کے امتزاج کے ساتھ جاری ہے۔ نقشبندی حضرات کے ہاں خفی ذکر، لطائف کے دور اور مراقبات کے ذریعے جذبِ مبتدی کا حصول ہوتا ہے۔ اب ذرا ذکر کی کچھ بنیادی باتیں بتائی جاتی ہیں۔

ذکر کی قسمیں

ذکر ناسوتی، ملکوتی، جبروتی، لاہوتی

ذکر کے لحاظ سے چار عالم سلسلوں میں متعارف ہیں۔

(1) ناسوت: اجسام و محسوسات کی دنیا

(2) ملکوت: فرشتوں اور نفوس و ارواح کی دنیا

(3) جبروت: آسمانی دنیا ستاروں سے اوپر کا مقام

(4) لاہوت: مقام محویت یا مقامِ فنا، یہ جہات و حدود سے منزہ ہے

ذکر کا مقصد چونکہ بندے کا نفس کی غلامی سے نکل کر نفس کے مالک کا بندہ بننا ہے اس لئے اس میں ترتیب کے ساتھ بندے کو نفس سے نکالنے اور اس کو حق کے پاس لے جانے کا خیال رکھا جاتا ہے جس کے چار مرحلے ہیں۔ یاد رہے اس ذکر کے فوائد کو حاصل کرنے کے لئے نفس کی جن آلائشوں کا علاج بغیر کسی خاص مجاہدہ کے ممکن نہ ہو ان مجاہدات سے بضرورت سالک کو گزارا جاتا ہے تاکہ ذکر کے فوائد اچھی طرح حاصل ہو جائیں۔ مثلاً غضِّ بصر کا مجاہدہ، کھانے پینے پر مناسب کنٹرول کا مجاہدہ، سونے جاگنے کے اوقات پر کنٹرول کا مجاہدہ وغیرہ جس کے بارے میں شیخ اپنی بصیرت سے فیصلہ کرتا ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک اول مرحلہ نفی و اثبات "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" دوسرا اثبات "اِلَّا اللّٰہ" تیسرا "اللّٰہ" اور چوتھا "ھُو" ہے۔ پہلے کو ناسوتی، دوسرے کو ملکوتی، تیسرے کو جبروتی اور چوتھے کو

لاہوتی کہتے ہیں۔ جیسا کہ عالم بھی چار ہیں۔

ذکرِ ناسوتی

"لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" ہے کہ اس میں ناسوتی اُمور، شہوات و لذات و خواہشات یعنی جو عالمِ دنیا سے متعلق ہیں اور نفس کو خود میں مشغول رکھتے ہیں، سے نفی ہے۔ ان سے نکل جانا اور اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہونا ہے یعنی "لَا اِلٰهَ" کی تلوار سے غیر اللہ کو فنا کرنا اور "اِلَّااللّٰه" کی ضرب سے اللہ تعالیٰ کی محبت کا حاصل کرنا ہے۔

ذکر ملکوتی

یعنی "اِلَّا اللّٰه" سے اس حقیقت کا ادراک حاصل کرنا ہے کہ ہم تو صرف اللہ کے لئے ہیں جیسا کہ فرشتے صرف اللہ تعالیٰ کے امر کے مطابق سب کچھ کرتے ہیں اور ان کا کسی اور طرف دھیان ہی نہیں ہوتا تو اس طرح ہمارا بھی دھیان صرف اللہ کی طرف ہو اور غیر اللہ کی طرف التفات کا شائبہ بھی نہ ہو حتیٰ کی اس کی نفی کی طرف بھی خیال نہ ہو۔

ذکر جبروتی

"اللّٰهُ اللّٰه" سے مراقبۂ ذات مع صفاتِ عظمت و احسان و رحمت و شفقت وغیرہ ہو یعنی حق کا ادراک دمادم ایسا ہو کہ ہر دم اس ادراک میں ترقی ہو اور قلب و ذہن اس میں مشغول ہو۔

ذکر لاہوتی

"اللّٰه" کا مقصد محض اللہ کی ذات کی طرف ایسی توجہ ہے کہ اس کی صفات کی طرف بھی دھیان نہ ہو۔ بعض حضرات ذکر جبروتی "اللّٰه" کے ذکر کو اور ذکر لاہوتی "ھُو" کے ذکر کو قرار دیتے ہیں۔ پہلا طریقہ عموماً اہلِ چشت کے ہاں ہوتا ہے اس کو بارہ تسبیح بھی کہتے ہیں۔ یہ حضرات پہلے دو سو بار ذکر ناسوتی، چار سو

بار ذکر ملکوتی، چھ سو بار ذکر جبروتی اور سو بار لاہوتی کراتے ہیں۔ اس سے گویا کہ روزانہ چار عالموں کی سیر ہوجایا کرتی ہے۔ روزانہ اس چھوٹی سیر کے ذریعے یعنی روزانہ سیر الی اللہ کی اجمالی سیر کے ذریعے بڑی سیر کی طرف یعنی پورے سلوک کی تکمیل کے لئے سالک رواں دواں ہوتا ہے جس کے لئے لیکن ذکر لاہوتی میں سالک کی استعداد کے مطابق روز افزوں ترقی کراتے کراتے اس کو بعض اوقات 24 ہزار تک بھی لے جاتے ہیں۔

دوسرا طریقہ عموماً قادریہ حضرات کے نزدیک چلتا ہے۔ ذکر علاجی میں اجتہاد جاری ہے۔ سلسلہ قادریہ کے بعض مشائخ کے ہاں یہ ترتیب بھی معمول ہے۔

درود شریف: "اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّآلِہٖ وَعِتْرَتِہٖ بعَدَدِ کُلِّ مَعْلُوْمٍ لَّكَ" 1000 مرتبہ، "أَسْتَغْفِرُاللهَ العَظِيمَ الَّذِي لَا اِلٰهَ إِلَّا هُوَ الحَيُّ القَيُّومُ وَأَتُوبُ إِلَيهِ" 313 مرتبہ، "لا اِلٰهَ اِلَّا الله" 1000 مرتبہ، (ہر 100 کے بعد "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ الله")، "اِلَّا الله" 1000 مرتبہ، "الله" 1000 مرتبہ، "هُو" 1000 مرتبہ، "الله هُو" 1000 مرتبہ، "هُو الله" 1000 مرتبہ، ذکرِ قلبی اسمِ ذات بصورت مراقبہ، "اَنْتَ الهَادِی اَنْتَ الحَق لَيْسَ الهَادِی اِلَّا هُو" 100 تا 1000 مرتبہ۔ بعض حضرات اس کو لطائف پر بھی کرتے ہیں مثلاً "لا اِلٰهَ اِلَّا الله" قلب پر، "اِلَّا الله" روح پر، "الله" سرّ پر، "هُو" خفی پر، "الله هُو" اخفٰی پر، "هُو الله" نفس پر اور "اَنْتَ الهَادِی اَنْتَ الحَق لَيْسَ الهَادِی اِلَّا هُو" قالب پر۔

طریقہ قادریہ راشدیہ میں تمام لطائف پر باری باری اسمِ ذات کی ضرب لگانے کا بھی معمول ہے۔ اس طرح ان کے قلب، روح اور سِرّ پر پاس انفاس کا بھی معمول ہے نیز "الله هُو" کے ذکر میں "الله" داہنے مونڈھے سے شروع کر کے روح اور سِرّ پر سے گزارتے ہوئے قلب پر "هُو" ختم کرتے ہیں۔ اس طرح اللہ تعالٰی کی سات صفات بصیر ۔ کلیم ۔ سمیع ۔ حی ۔ قدیر۔ مرید اور علیم کی خود سے نفی اور اللہ تعالٰی سے اثبات خفی طریقے سے کرایا جاتا ہے۔

سلسلہ چشتیہ نظامیہ مبارکہ میں بعض مشائخ کے ہاں یہ اسباق معمول ہیں۔
"لا اِلٰہَ اِلَّا اللہ" لسانی 200 مرتبہ، "اِلَّا اللہ" لسانی 400 مرتبہ، "اللہ" لسانی 600 مرتبہ، اس کے بعد اسمِ ذات بذریعہ تصور "اللہ" کو ناف سے شروع کر کے اُم الدماغ تک تصور سے لے جانا ہوتا ہے 1200 مرتبہ، "اللہ ھُو" 500 مرتبہ، "ھُو اللہ" 500 مرتبہ، "یا وَدُود یا وَھَّابُ" 100 مرتبہ۔ نظامیہ اذکار میں "لا اِلٰہَ اِلَّا اللہ" میں غیر اللہ کی نفی پر زیادہ زور ہے اور اثبات اس کے تابع ہے۔ "اِلَّا اللہ" میں زور اثبات پر ہے لیکن نفی ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ جیسا کہ جب ہم کہتے ہیں کہ یہ دن ہے تو ہم مانتے ہیں کہ رات بھی ہے ورنہ دن کا ذکر ہی نہ ہوتا اسلئے آگے اسمِ ذات "اللہ" کا مفرد ذکر ہے جہاں نفی کا امکان ہی نہیں ہے۔

اسمِ ذات میں جو تصور میں ہوتا ہے اس میں انسان کو "عالم صغیر" تصور کرتے ہوئے ناف کو "تحت الثریٰ" تصور کرتے ہیں اور ام الدماغ کو "زیرِ عرش"۔ اس خیال سے اسمِ ذات کو ناف سے شروع کر کے خیال میں ام الدماغ تک لیجاتے ہیں یعنی اس معنی میں کہ تحت الثریٰ سے عرش تک اسی مالک کی بادشاہت ہے اور اسی کے جلوے ہیں۔ اگر ذکر کے دوران اپنے باطن کو غبارے کی طرح خالی تصور کیا جائے تو ذکر آسانی سے جم جاتا ہے۔

"اللہ ھُو" ذکرِ عروج ہے۔ یعنی اسم سے مسمّیٰ کی طرف سیر۔ اور "ھُو اللہ" ذکرِ نزول ہے یعنی مسمّیٰ سے اسم کی طرف نزول۔

آخری مراقبہ ان کا "ذکرِ مذکور" ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ سالک اپنے ہی قلب کے آئینے میں اللہ کی ذاتی تجلیات کا مشاہدہ کرتا ہے۔

بعض مشائخ نے ذکرِ لسانی کو ناسوتی، ذکرِ قلبی کو ملکوتی، ذکرِ روح کو جبروتی اور ذکرِ سِرّ کو لاہوتی کہا ہے۔ بعض نے ذکرِ لسانی کو جسمی، فکر کے ذکر کو نفسی، مراقبہ کو ذکرِ قلبی، مشاہدہ کو ذکرِ روحی اور معائنہ کو ذکرِ سرّی کہا ہے۔

2.1.2.2.1.1.2.1... جلی اذکار

ذکر جلی و خفی

ذکرِ لسانی کو جلی اور ذکرِ قلبی کو خفی کہتے ہیں اور یہ بھی ہے کہ جہر کو جلی اور غیر جہر کو خفی کہتے ہیں۔ ذکرِ جلی کی ادنیٰ حد تو متعین ہے، وہ زبان کو حرکت دینا یا اپنے آپ کو سنانا ہے لیکن اکثر کی کوئی حد نہیں یہ اپنے اپنے نشاط پر ہے مگر اس کا خیال ضروری ہے کہ کسی نمازی یا سونے والے کو ایذا نہ ہو۔

ہمارے خاندانی اذکار

حضرت حلیم گل باباؒ جو ہمارے جدِ امجد حضرت کاکا صاحبؒ کے صاحبزادے ہیں ان کی کتاب مقاماتِ قطبیہ و مقالاتِ قدسیہ سے یہ اذکار دیئے جاتے ہیں۔

ذکرِ روح

التحیّات کی شکل میں بیٹھ کر یہ ذکر "هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ" کیا جائے۔ طریقہ یہ ہے کہ "هُوَ الْاَوَّلُ" کی ضرب دائیں طرف "هُوَ الْاٰخِرُ" کی ضرب بائیں طرف "هُوَ الظَّاهِرُ" دونوں زانوؤں کے بیچ میں اور "هُوَ الْبَاطِنُ" کی ضرب دل میں لگائی جائے۔

ذکرِ مقدّس

"اللہ" کا لفظ دل سے کھینچ کر دائیں شانے تک لیجائیں اور "اکبر" کی ضرب دل پر لگائیں (اللّٰہُ اکبر)۔ لفظ "سُبْحَان" کو دل سے کھینچ کر دائیں شانے تک لیجائیں اور اسم "اللہ" کی ضرب قلب پر لگائیں (سُبْحَانَ اللہ)۔ لفظ "اَلْحَمْدُ" کو دل سے کھینچ کر دائیں شانے تک لیجائیں اور"لِلّٰہ" کی ضرب قلب پر لگائیں (اَلْحَمْدُلِلّٰہ)۔ "لَا اِلٰہَ" کو دل سے کھینچ کر دائیں شانے تک لیجائیں اور "اِلَّا اللہ" کی ضرب قلب پر لگائیں (لَااِلٰہَ اِلَّا اللہ)۔

ذکرِ تجلّی

اسم "یا حَیُّ" دل سے کھینچ کر دائیں شانے تک لیجائیں اور "یا قَیُّوم" کی ضرب دل پر لگائیں۔

ذکرِ جبروتی

"یَا أحدُ" کی ضرب دونوں زانوؤں کے درمیان لگائیں اور "یَا وَاحِدُ" کی ضرب دل میں لگائیں۔

ذکرِ ملکوتی

"یَا بَدِیْعُ" کی ضرب دائیں گھٹنے پر "یَا بَاعِثُ" کی ضرب بائیں گھٹنے پر "یَا نُوْرُ" کی ضرب لطیفۂ روح پر "یَا شَھِیْدُ" کی ضرب قلب پر۔

ذکرِ فردوسی

دائیں جانب "فَادْخُلِي" کی ضرب، بائیں جانب "فِي عِبَادِي" کی ضرب آسمان کی جانب "وَادْخُلِي" کی ضرب اور دل پر "جَنَّتِي" کی ضرب۔

ذکرِ وحدت

دائیں جانب "لَیْسَ فِي الدّارینِ" کی ضرب اور دل پر "غیرُاللہ" کی ضرب۔

فنا اور بقا کا ذکر

دائیں جانب "مَا عِنْدَکُمْ " اور بائیں جانب "یَنْفَدُ" کی ضرب، آسمان کی جانب " وَمَا عِنْدَ اللّٰہِ" کی ضرب اور دل پر "بَاق" کی ضرب

ذکر نفی و اثبات یعنی "لاالٰہَ اِلّااللہ" کا طریقہ

کتابوں میں جو طریقہ لکھا ہے وہ یہ ہے کہ "لَا اِلٰہَ" کے "لَا" کو ناف سے ذرا طاقت سے کھینچ کر لفظ "اِلٰہَ" کو داہنے بازو تک لے جا کر سر کو پیٹھ کی طرف

تھوڑا سا جھکا کر یہ خیال کرے کہ میں نے غیر سے اپنے دل کو پاک کر کے تمام اغیار کو پسِ پشت ڈال دیا پھر "اِلَّا اللہ" کی ضرب ذرا زور سے دل پر لگائے یہ دو سو بار کہے اس طرح کہ ہر دس بار یا سانس ٹوٹنے پر "محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کہے۔ آج کل کے حالات کے پیشِ نظر ہمارے شیخ مولانا محمد اشرف صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس میں یہ ترمیم فرماتے تھے کہ "لَا" کو ناف سے طاقت کے ساتھ کھینچ کر "اِلٰہَ" سے دل کو دائیں بائیں یوں ہلائے کہ جس سے نفی کی قلبی کیفیت پیدا ہو جائے یعنی اس کے ساتھ ہی یہ سوچ کہ میرے دل سے غیر اللہ کی محبت نکل گئی اور "اِلَّا اللہ" سے دل پر سینے کی اندرون سے ایسی ضرب لگائی جائے کہ اس سے یہ کیفیت پیدا ہو جائے کہ میرے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوگئی۔ حضرت فرماتے تھے کہ آج کل لوگ خارجی ضرب کے متحمل نہیں۔

غور طلب

"لَا اِلٰہَ" کہتے وقت یہ سوچے کہ دل سے دنیا کی محبت نکل رہی ہے اور "اِلَّا اللہ" کہتے وقت یہ سوچے کہ دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت آرہی ہے اور تھوڑی دیر مراقب ہو کر خیال کرے کہ فیوضاتِ الٰہیہ قلب میں مسلسل حاصل ہو رہے ہیں اور تصور کرے کہ فیضانِ الٰہی عرش سے میرے سینہ میں آ رہا ہے خواہ چوکڑی بھر کر بیٹھے یا دو زانو جس میں سہولت ہو، ذوق کے مطابق کرے۔

ذکر "اِلااللہ" کا طریقہ

کتابوں میں "اِلَّا اللہ" کے ذکر کا طریقہ یہ ہے کہ پہلی بار "لَا اِلٰہَ" کہتے وقت ناف سے کھینچ کر سر کو دائیں شانہ کی طرف لے جا کر"اِلَّا اللہ" کی ضرب دل پر لگائے۔ اور پھر دل پر ہی بائیں جانب ضرب لگاتا رہے۔ یہ ذکر چار سو بار کرے پھر نفی و اثبات کی طرح مراقبہ کرے۔ آج کل کے حالات کے پیشِ نظر یہ مناسب ہے کہ "اِلَّا اللہ" کہتے ہوئے ضرب دائیں شانے کی جانب سے لیکن سینے میں دل کے قریب سے دل پر ضرب لگائی جائے۔ اس میں مراقبہ ملکوتی ہی

مناسب ہے کہ ہم تو اللہ ہی کے بندے ہیں۔ اس طریقے سے نہایت آسانی کے ساتھ مطلوبہ کیفیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس لئے بہت زوردار ضرب لگانے کی آج کل ضرورت نہیں بلکہ اس میں آج کل نقصان کا اندیشہ ہے۔

ذکر اسمِ ذات دو ضربی

"اَللّٰہُ اَللّٰہْ" اول "ہ" پیش کے ساتھ اور دوسری "ہ" جزم کے ساتھ۔ اس کا کتابوں میں لکھا ہوا طریقہ یہ ہے کہ دونوں آنکھیں بند کر کے سر داہنے کندھے کی طرف لے جا کر "اَللّٰہُ" (پیش کے ساتھ) دل پر ضرب لگائی جائے اور دوسرے لفظ اللّٰہْ (جزم کے ساتھ) سے بھی دل پر ضرب لگائی جائے۔ یہ چھ سو بار ہے۔ پھر اس طرح مراقبہ کرے کہ ہر دس یا زائد کے بعد "اللّٰہُ نَاظِرِیْ اللّٰہُ حَاضِرِی اللّٰہُ مَعِی" کہتا رہے تاکہ کیفیت و لذت اس کی حاصل ہو۔ اس میں بھی آج کل بہتر یہی ہے سر کو ہلائے بغیر جہاں سے "اِلَّا اللّٰہ" کی ضرب کا بتایا گیا وہیں سے یعنی سینے میں دائیں شانے کی جانب سے مگر قریب سے دل پر ضرب لگائی جائے۔ حضرت مولانا اشرف سلیمانیؒ اس کے ساتھ مراقبہ کے طور پر بتاتے تھے کہ یہ تصور کیا جائے کہ عرش سے زرد رنگ کا نور سالک کے قلب پر آرہا ہے۔ یہ اصل میں عرشِ اصغر کا عرشِ اکبر سے رابطہ کی کوشش ہے۔ اللہ تعالیٰ سارے سالکین کو اس میں کامیابی نصیب فرمائے۔

ذکر اسمِ ذات یک ضربی

اس کا طریقہ کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ لفظ "اللّٰہ" جزم کے ساتھ سر کو بائیں جانب لے کر دل پر ضرب کرے۔ یہ سو بار ہے۔ پھر مراقب ہو کر اس طرح کہے "اللّٰہُ نَاظِرِی" (اللہ مجھ کو دیکھ رہا ہے) "اللّٰہُ حَاضِرِی" (اللہ میرے پاس ہے) "اللّٰہ مَعِی" (اللہ میرے ساتھ ہے) اور معنیٰ کا خیال کرے۔ آج کل اس کے لئے بھی مناسب یہ ہے کہ یہ مراقبہ کرے میرا اللہ میرے دل کو محبت کے ساتھ دیکھ رہا ہے اور میرا دل بھی اس کی طرف متوجہ ہے اور میری زبان

کے ساتھ مل کر "اَللّٰہُ اَللّٰہْ" شوق میں کر رہا ہے۔ اس میں اوپر کے مراقبے بھی آگئے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف توجۂ قلبی بھی حاصل ہوگئی۔ جو تصور ذاتِ بخت کا پیش خیمہ بنے گا اِن شاء اللہ۔ اس پر بارہ تسبیح مکمل ہو جاتی ہے جو چشتیہ طریقے میں چلی آرہی ہے۔

ایک اور تشریح

بعض مشائخ نے اس کی تشریح یوں بھی کی ہے کہ سالک ذکر نفی و اثبات "لاالٰہَ اِلّاَاللّٰہ" میں اس قدر مشغول ہو کہ سوائے ذکر کے کچھ نہ رہے۔ کوئی سانس بغیر ذکر نہ نکلے۔ جب اس حالت کو سالک پہنچ گیا تو سالک عالمِ ناسوت سے عالم ملکوت میں پہنچ جاتا ہے جس کا ذکر "اِلّاَ اللّٰہ" ہے چونکہ یہ ذکر "اِلّاَاللّٰہ" دل کا ذکر ہے اس لئے اب "اِلّاَ اللّٰہ" کا تصور بحضورِ قلب چاہئے کہ اپنی ذات و صفات کو اللہ کی ذات و صفات کے ساتھ ربط ہو جائے۔ جب سالک اس مرتبہ کو پہنچ جاتا ہے تو مرتبہ دل سے گذر کر مرتبہ روح پر پہنچ جاتا ہے۔ اور روح کا ذکر اسمِ ذات اللہ کا ذکر ہے اس واسطے اس ذکر اسمِ ذات میں اس طرح انہماک ہو کہ الف لام جو "اللّٰہ" پر داخل ہے باقی نہ رہے صرف "ھُو" رہ جائے۔ اس مرتبہ پر پہنچنے سے سالک سراپا ذکر ہو جائے گا اور روح سے ترقی کر کے مرتبہ سِرّ پر پہنچ جائے گا اور مقام فناء الفناء پر فائز ہو جائے گا۔

اب سالک کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا تعلق ہو جاتا ہے کہ اب وہ مصداق حدیث شریف "بِیْ یَسْمَعُ"، "بِیْ یَبْصُرْ" ہو گا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اب وہ میرے ساتھ سنتا ہے میرے ہی ساتھ دیکھتا ہے "وَبِیْ یَبْطِشُ" میرے ہی ساتھ پکڑتا ہے "وَبِیْ یَمْشِیْ" میرے ہی ساتھ چلتا ہے یعنی اس کی ہر حرکت و سکون خدا کی مرضی کے مطابق ہوتی ہے۔ (دیکھنے میں بشر ہے لیکن بے شر ہے۔ سراپا نور ہے) اب اس کو "لَا اِلٰہَ اِلّاَ اللّٰہ" کی خوب معرفت ہو جائے گی۔ عبدیتِ کاملہ حاصل ہو جائے گی۔ عبدیت میں درجہ کمال اور بصرفِ ہمت عبادت میں مشغول

ہو گا۔ حفظِ مراتب اور احکامِ شریعت کا امراً و نہیاً امتثال کرے گا۔

"لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُو" کا ذکر۔

یہ بھی نفی اثبات کا ذکر ہے فرق صرف یہ ہے کہ اس میں اسمِ ذات "اللہ" کی جگہ "ھُو" ہے جو اسم ضمیر ہے اور "اللہ" کی طرف اشارہ کرتا ہے یعنی سب سے نفی کر کے صرف وہ یعنی ذاتِ الٰہی۔ یہ بے زبانی کی زبان بہت اونچی زبان ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی جملہ برکات نصیب فرمائے۔ آمین

حق کا ذکر

قرآن پاک میں کئی مقامات پر حق کو بہت زوردار طریقے سے لایا گیا ہے جیسے وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۔ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔ (الإسراء:81) اس میں حق کے ذریعے سے باطل کے بالکلیہ انہدام کی طرف اشارہ ہے۔ سالکین اس کو اپنے دل کے باطل بتوں کو جو دل کے کعبے میں ہم سجا چکے ہوتے ہیں ان کو اس ذکر کی پابندی کے ذریعے سے منہدم کرسکتے ہیں۔ اس کی تعداد حسبِ ضرورت شیخ تجویز کرتا ہے۔ سہروردیہ سلسلہ میں "حق اللہ" کے ذکر کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ یہ وہاں سے لیا گیا ہے۔

2.1.2.2.1.1.2.2... پاس انفاس

صوفیائے کرام کے نزدیک دائمی ذکر کی بڑی اہمیت ہے اور اس کی اصل قرآن کریم سے ثابت ہے جیسا کہ ارشاد ہے "رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ" ایسے آدمی جنہیں سوداگری اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتے۔ (النور:37) اور اسی طرح "اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ" وہ جو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے یاد کرتے ہیں۔ (آلِ عمران:191) ان آیات میں کھڑے، بیٹھے اور لیٹے (غرض ہر حال میں) ذکر کی ترغیب دی گئی ہے اور ایسے نیک بندوں کی تعریف کی گئی ہے جو ہر حال میں

اللہ تعالیٰ کو یاد رکھتے ہیں۔ اس کی اصل تو ظاہر ہے کہ یادداشت ہے (کہ ہر حال میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی یاد دل میں قائم رہے) لیکن تجربہ سے ثابت ہے کہ ایسی یاد کی یافت ذکر اسمی کی کثرت کے بغیر عادتاً مشکل ہے۔

صوفیائے کرام کو تجربہ سے معلوم ہوا کہ بدن میں ظاہراً دو نظام ایسے ہیں جو کہ خودبخود جاری رہتے ہیں، اگر ان میں ذکر کا اجراء ہو جائے تو ذکرِ دائم کی دولت نصیب ہوسکتی ہے۔ ایک دل کی دھڑکن اور دوسری سانس کی آمدورفت۔ پہلے میں ذکر کے اجراء کو ذکرِ قلبی کہتے ہیں اور دوسرے کو پاسِ انفاس (یعنی یہ مشق کہ ہر سانس ذکر سے معمور رہے۔ اسی کو 'ہوش در دم' بھی کہتے ہیں (یعنی یہ دھیان رکھنا کہ کوئی سانس غفلت میں نہ گزرے)۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "جو سانس اندر جاتا ہے ممدِ حیات ہے اور جو باہر آتا ہے مفرحِ ذات، پس ہر سانس پر شکر لازم ہے"۔ ذکر درحقیقت شکر ہی ہے اور ہر سانس میں اللہ کا نام لینا اسی کی ایک شکل ہے۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک مرید کو پاس انفاس کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "یہ ایک شغل شب و روز کی مشغولی کے لئے کافی ہے، ھم ذکر ھم شغل اس میں شامل ہے"۔

طریقہ

پاس انفاس کے طریقے بہت ہیں لیکن ایک بات سب میں مشترک ہے کہ ہر سانس ذکر سے معمور رہے چاہے جو بھی ذکر ہو:

(1) سانس باہر نکالتے ہوئے دل ہی دل میں زبان کو حرکت دیئے بغیر "لَآ اِلٰہَ" کہے اور سوچے کہ غیر اللہ کی محبت دل سے نکل رہی ہے اور سانس لیتے ہوئے "اِلَّا اللہ" کہے اور سوچے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی محبت دل میں داخل ہو رہی ہے۔

(2) سانس لیتے وقت اسم "اللہ" دل میں کہے اور سانس باہر نکالتے ہوئے بھی اسم "اللہ" دل میں کہے۔

(3) سانس اندر لیجاتے وقت دل میں "اللہ" کہے اور سانس باہر نکالتے وقت

"ھُو" کہے (ہمارے سلسلے میں یہی معمول ہے)

(4) احقر کے خیال میں آج کل یہ زیادہ مناسب ہے کہ "اللہ" سانس باہر نکالتے وقت اور "ھُو" سانس اندر لے جاتے وقت کہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "ھُو" اندر لے جاتے وقت تصور ذات بحت میں مدد دے گا۔

(5) اندر اور باہر دونوں سانسوں میں "ھُو" کا لفظ خیال میں گزارے۔

غرض اصل مقصد اس کا یہ ہے کہ ہر سانس ذاکر رہے تاکہ ذکرِ دائم اور ذکرِ حیات کی دولت حاصل ہو سکے۔ مشق سے یہ ذکر طبیعتِ ثانیہ بن جاتی ہے اور سالک ہر حال میں ذاکر رہتا ہے۔ اللہ پاک سب کو ذکرِ دائم کی حقیقت نصیب فرمائے۔ آمین

غور طلب

ذکرِ لسانی بھی ہوتا ہے، خفی بھی اور جہری بھی لیکن اگر یہ علاج کے لئے ہوں تو ان پر تجوید کے قواعد کا اطلاق ہوتا ہے اور نہ ہی ان کو بدعت کہا جاسکتا ہے۔ بدعت اس کو کہتے ہیں جن کو دین کے مقاصد میں شامل کیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ سب ذرائع کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اس لئے ان کے پڑھنے اور کرنے کے طریقوں کا منصوص ہونا بھی ضروری نہیں۔

جہری انفرادی بھی ہوتا ہے اور اجتماعی بھی ہوسکتا ہے بصوتِ واحد۔ دونوں کے مقاصد مختلف ہیں۔ انفرادی جہری ذکر میں کیفیت کی گہرائی حاصل کرنا ہوتی ہے اس لئے اس میں بے شک ایک ہی مجلس میں مختلف لوگ کر رہے ہوں کسی اور کے ساتھ آواز کا ملانا منع کیا جاتا ہے جبکہ اجتماعی جہری بصوتِ واحد ذکر میں تعلیم مقصود ہوتی ہے جیسا کہ تجوید کے قواعد طلباء کو ایک وقت میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اس صورت میں سب کا ایک آواز سے کرنا ضروری ہے تاکہ سیکھنے میں مشکل نہ ہو اور کرانے والے کی آواز سب سے نمایاں ہونی چاہیے۔

2.1.2.2.1.1.2.3... خفی ذکر

لطائفِ ستہ کی تعریف اور ضروری تفصیل

نقشبندی سلسلے میں تو لطائف کی باقاعدہ تعلیم کی جاتی ہے اور قادریہ سلسلے میں بھی اس سے کام لیا جاتا ہے اس لئے ان کے بارے میں جاننا سالک کے لئے مفید ہے۔ لطائف جمع کا صیغہ ہے۔ اس کا واحد لطیفہ ہے۔ یعنی وہ چیز جس میں کثافت نہ ہو مراد ان سے وہ چیزیں ہیں جو مادی نہ ہوں۔ مادہ سے مجرّد اور خالی ہوں۔ غیر مادی قوتیں جن کو انسانی اعضاء سے تعلق ہوتا ہے، ان کی تعداد چھ ہے۔

(1) لطیفۂ نفس (2) لطیفۂ قلب (3) لطیفۂ روح (4) لطیفۂ سِرّ (5) لطیفۂ خفی (6) لطیفۂ اخفیٰ

محققین اہلِ فن تصوف نے ان کے مقامات اور مواقع بھی متعین فرمائے ہیں۔ اور ان کے رنگ وغیرہ بھی بیان فرمائے ہیں اور افعال و آثار بھی۔ چنانچہ کہا ہے کہ لطیفۂ نفس کا محل ناف کے نیچے ہے اور اس کا رنگ زرد ہے۔ بعض نے پیشانی میں بتایا ہے اور لطیفۂ قلب کا محل قلب یعنی دل ہے جو بائیں پستان کے دو انگل نیچے ہے۔ اور اس کا رنگ سرخ ہے۔ اور لطیفۂ روح کا محل دائیں پستان کے دو انگل نیچے دل کے بالکل سامنے ہے (اسی لئے لطیفۂ قلب اور لطیفۂ روح دونوں کو ذاکر بنانے کے لئے دو ضربی ذکر کیا جاتا ہے)۔ اس کا رنگ سفید ہے۔ لطیفۂ سِرّ کا محل قلب اور روح کے درمیان سینہ کے بیچوں بیچ ہے۔ اس کا رنگ سبز ہے۔ لطیفۂ خفی کا محل دونوں ابروؤں کے درمیان ہے اس کا رنگ نیلگوں ہے۔ لطیفۂ اخفیٰ کا محل ام الدماغ ہے جو کہ دماغ میں ایک نقطہ ہے جس کو جوہر دماغ کا مرکز کہا جاتا ہے۔ اس لطیفہ کا رنگ سیاہ ہے۔ جیسے آنکھ کا تارا۔

حضرت خواجہ معصومؒ کی تحقیق کے مطابق لطیفۂ قلب کا محل قلب صنوبری ہے جو بائیں پستان کے دو انگل نیچے ہے۔ لطیفۂ روح کا محل دائیں پستان کے دو انگل نیچے ہے اورلطیفۂ قلب کے محاذی ہے۔ لطیفۂ سِرّ کا محل دل سے چار انگل

اوپر اور سینہ کی درمیانی لکیر کی طرف دو انگل کے فاصلے پر ہے۔ لطیفۂ خفی کا محل لطیفۂ روح کے مقام سے چار انگل اوپر اور دو انگل کے بقدر سینہ کی درمیانی لکیر کی طرف ہے۔ لطیفۂ اخفیٰ، لطیفۂ سِرّ، لطیفۂ خفی اور گلے کی جڑ تینوں مقامات سے برابر فاصلے پر ہے۔

لطائف کا ذکر

اس کو یوں کرنا ہوتا ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ جہاں ذکر کرانا ہے وہاں ذکر ہو رہا ہے۔ اس کو سننے کی کوشش ہو تصور سے کروانے کی کوشش نہیں کرنی۔ وقوفِ قلبی اس میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ نقشبندی سلوک میں نیت، وقوفِ قلبی جس کا ذکر آگے آ رہا ہے اور اس کے ساتھ نفس کے تزکیہ کی بڑی اہمیت ہے۔ یاد رکھنا ہے کہ دل پر اتنی ہی محنت ہو جتنا کہ نفس کا تزکیہ ہو۔ ان دونوں کے درمیان توازن اگر نہیں ہوگا تو سالک بغیر تکمیل کے اپنے آپ کو کامل سمجھ سکتا ہے جو طریقت میں سُمِ قاتل ہے۔

لطائفِ ستہ کے افعال

لطائف کی تعداد اور ان کے مقامات اور رنگ بیان ہو چکے، اب ان کے افعال بیان کئے جاتے ہیں۔

پہلا لطیفۂ نفس ہے سب سے پہلے اس کے افعال بیان کئے جاتے ہیں۔ اس کے تین درجے ہیں

(1) نفسِ امارہ (2) نفسِ لوامہ (3) نفسِ مطمئنہ

نفس کا اصل فعل غفلت اور شہوت ہے کیونکہ غفلت اور شہوت میں تلازم ہے یعنی غفلت سے شہوت پیدا ہوتی ہے اور شہوت سے غفلت۔ یہ غفلت و شہوت کلی مشکک ہے۔ اس لئے اس کے افراد شدت و ضعف میں مختلف ہیں۔ علاج بالضد کے قانون کے مطابق نفس کی اصلاح مجاہدات و طاعات سے ہوتی ہے یعنی ریاضت و تقویٰ سے شہوت و غفلت میں کمی ہو جاتی ہے اس کمی کا نام سکون

ہے جس کے تین درجے ہیں۔

(1) جس میں سکون بالکل نہ ہو

(2) نامکمل سکون کی حالت

(3) مکمل سکون کی حالت

پہلے درجے میں نفس کو نفس امارہ کہتے ہیں، دوسرے درجے میں اس کا نام لوامہ ہے اور تیسرے درجے میں اس کا نام مطمئنہ ہے۔ اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ نفس اصل میں تو لذات کا طالب ہوتا ہے اس لئے غفلت اور شہوت کی وجہ سے گناہ کی طرف مائل کرتا ہے اس حالت میں یہ "نفسِ امارہ بالسوء" کہلاتا ہے کیونکہ ہمیشہ سوء اور قباحت و شناعت کی راہ میں مبتلا رہتا ہے۔ جب کوئی شخص مجاہدہ کرتا ہے تو یہ نفس پر شاق ہوتا ہے لیکن مسلسل مجاہدے کے ساتھ نفس کچھ عادی ہوتا چلا جاتا ہے اگرچہ اس مقابلے میں بالکل مغلوب نہیں ہوتا بلکہ کبھی غالب کبھی مطیع کبھی مطاع ہوتا ہے تو اس حالت میں نفسِ لوامہ کہلاتا ہے کیونکہ اس حالت میں اور اس درجہ میں نفس افعالِ شنیعہ کے ارتکاب سے نادم بھی ہوتا ہے اور اپنے آپ کو ملامت بھی کرتا ہے اور اگر مزید مقابلہ کرتے کرتے نفس بالکل مغلوب ہوگیا اور اس میں بالکل شانِ اطاعت پیدا ہوگئی تو پھر نفسِ مطمئنہ کہلاتا ہے کیونکہ یہ حالت اطمینان کی ہے۔ شر کے صدور سے گونہ اطمینان ہوگیا۔

غور طلب

نفسِ مطمئنہ اُمورِ خیر میں مزاحمت و مقاومت تو نہیں کرتا مگر اس کو وساوس و خطرات پیش آ جاتے ہیں۔ جس سے انسان کی ترقی اور اس کے کمال میں ازدیاد ہوتا ہے۔ جیسے شائستہ تعلیم یافتہ گھوڑا کبھی کبھی شوخی کرتا ہے لیکن سوار کے اشارہ ہی سے درست ہو جاتا ہے اسی طرح نفسِ مطمئنہ وساوس و خطرات کے درجہ میں کبھی کبھی خفیف و ضعیف مقاومت کرتا ہے لیکن سالک کے اشارہ پر درست ہو جاتا ہے۔ تو چونکہ نفس کی مقاومت کو کالعدم قرار دیا ہے اور اس

حالت کو سکونِ تام سے تعبیر کیا گیا ہے یہ لطیفۂ نفس کے فعل کا حال بیان کیا گیا ہے۔

نفسِ مطمئنہ کی مزید تحقیق

بعض دفعہ کوئی خاص مجاہدہ کرنے سے نفس کو کسی خاص بات میں نفسِ مطمئنہ حاصل ہو جاتا ہے اور بعض دوسرے امور میں حاصل نہیں ہو پاتا مثلاً بعض کو عبادات میں نفسِ مطمئنہ حاصل ہو جاتا ہے لیکن معاملات میں کھوٹے ہوتے ہیں یا معاملات میں ہو جاتا ہے لیکن معاشرت میں نہیں اس طرح بعض کو اخلاق میں نہیں ہوتا اس لیے مکمل نفسِ مطمئنہ فنائے تام کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

جبلت اور نفس کے درمیان فرق

انسان کے اندر ایک نفس ہوتا ہے اور ایک اس کی جبلت ہوتی ہے۔ جبلت میں عناصر اربعہ کا اثر ہوتا ہے آگ، پانی، ہوا اور مٹی۔ ہر شخص میں ان کی مختلف ترکیب ہوتی ہے. اس لئے سیر الی اللہ کی تکمیل کے بعد بھی یہ باقی رہتے ہیں جیسے بعض جلالی ہوتے ہیں بعض جمالی وغیرہ۔ ان طبعیتوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف رنگ ہوتے ہیں اور اقوام کے مزاج بھی اسی کے لحاظ سے ہیں۔ اس لئے مشائخ کو ان کی معرفت ہونی چاہیے کیونکہ ان طبیعتوں کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا ہے جیسا کہ درج ذیل روایت میں ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ تبدیل کر سکتا ہے جبلت نہیں۔ اس لئے علاج نفس کا ہوتا ہے جبلت کا نہیں جیسا کہ ارشاد مبارک ہے۔ وَعَنْ اَبِیْ الدَّرْدَآءِ قَالَ بَیْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیه وسلم نَتَذَاکَرُ مَا یَکُوْنُ اِذْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیه وسلم "اِذَا سَمِعْتُمْ بِجَبَلٍ زَالَ عَنْ مَکَانِهٖ فَصَدِّقُوْهُ وَاِذَا سَمِعْتُمْ بِرَجُلٍ تَغَیَّرَ عَنْ خُلُقِهٖ فَلَا تُصَدِّقُوْا بِهٖ فَاِنَّه، یَصِیْرُ اِلٰی مَاجُبِلَ عَلَیْهِ"۔ (رواہ مسند احمد بن حنبل) اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے آئندہ وقوع پذیر

ہونے والی باتوں پر گفتگو کر رہے تھے رسول اللہ ﷺ نے (ہماری باتوں کو سن کر) فرمایا۔ "جب تم سنو کہ کوئی پہاڑ اپنی جگہ سے سرک گیا ہے تو اسے سچ مان لو لیکن جب تم یہ سنو کہ کسی آدمی کی خلقت بدل گئی ہے تو اس کا اعتبار نہ کرو اس لئے کہ انسان اسی چیز کی طرف جاتا ہے جس پر وہ پیدا کیا گیا ہے۔"

اس حدیث شریف میں جبلت کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ نہیں بدلا کرتی البتہ قرآن پاک میں نفس کی تربیت کا ثبوت موجود ہے کیونکہ نفس کے بارے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا یعنی یقیناً کامیاب ہوگیا جس نے نفس کو رذائل سے پاک کیا۔ اس سے پتا چلا کہ ایک تو ہر انسان کی وہ طبیعت ہے جس پر اس کو پیدا کیا جاتا ہے کیونکہ جیسا کہ اس حدیث شریف میں یہ خبر موجود ہے کہ جس جبلت پر کسی کو پیدا کیا جاتا ہے وہ بالآخر اسی طرف جاتا ہے لیکن ساتھ ہی قرآن میں نفس کی تین قسمیں نفسِ امارہ، نفسِ لوامہ اور نفسِ مطمئنہ بیان فرما کر اس کی تربیت کا امکان بیان کیا ہے اور اصل کامیابی بھی اسی پر بتائی گئی ہے اس لئے بظاہر جو لگتا ہے وہ یہ ہے کہ جو طبیعت نہیں بدلتی اس کو اگر ظرف مانا جائے اور اس کو چار عناصر کا مرکب قرار دیا جائے اور اس کے اندر جو پڑا ہے وہ مظروف بصورت رذائل جو ہے وہ بھی عناصر اربعہ سے ترکیب پا گیا ہے تو یہ جو ظرف ہے وہ تو نہیں بدلتا لیکن جو اس کا مظروف ہے وہ بدلا جا سکتا ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان ان رذائل کو صاف کرنے کا مکلف ہے کیونکہ یہی اس کی تربیت ہے لیکن اس ظرف کو نہیں بدلا جاسکتا ہے اس لئے جب شریعت پر وہ عمل کرتا ہے تو اپنی جبلت کی اس میں جب مخالفت کرتا ہے تو یہ اس کا مجاہدہ ہے جس پر اس کو اجر ملتا ہے گویا کہ تربیت سے اس نے تقویٰ کا مقام حاصل کر لیا اور جبلت سے شریعت پر عمل کرنے کا اجر حاصل کرتا ہے۔

تربیت میں بھی جو مظروف ہے وہ عناصر اربعہ سے چونکہ تشکیل پا چکا ہے اس لئے علاج بالضد کے طور پر ہر ایک کے لئے اتنا مجاہدہ اس کو کرنا پڑتا ہے جس سے اس کا جو عنصر جتنا اعتدال سے باہر ہے وہ اعتدال پر آجائے۔ پس نفس کا بگاڑ تو مجاہدہ کے ذریعے درست کیا جاسکتا ہے لیکن جبلت کی بے اعتدالی مجاہدہ کے ساتھ

درست نہیں ہوتی لیکن اس کی وجہ سے جو مجاہدہ کرنا پڑتا ہے وہ اجر کا باعث ہوتا ہے اور معصومین کا معاملہ اس میں مختلف ہے ان کی جبلت میں اعتدال ہوتا ہے لیکن دوسروں کی بے اعتدالی ان کے لئے مجاہدہ بنتی ہے۔

یہ سب کچھ یونانی حکماء کی اصطلاحات کے مطابق بتایا گیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک عناصر چار تھے۔ آج کل جو عنصر کی تعریف ہے اس کے مطابق نہیں۔ اس طرح اگر کہا جائے کہ چار طبیعتیں تھیں تو وہ بھی اس وقت کے یعنی یونانی حکماء کی تحقیق کے مطابق تھیں۔ یہ البتہ ہر وقت کہا جاسکتا ہے کہ ہر شخص کی جبلت کچھ خوبیوں اور کچھ خامیوں کا مجموعہ ہوتی ہے جس کی لاتعداد ترکیبیں بن سکتی ہیں۔ اس لئے کسی کی جبلت میں جو خامیاں ہیں اور خوبیاں ہوتی ہیں وہ برقرار رہتی ہیں اور جن کا نفس نفسِ مطمئنہ بن چکا ہو وہ ان خامیوں کے خلاف کام کرتا ہے جس سے وہ اجر پاتا ہے اور جو خوبیاں ہوتی ہیں ان کے ذریعے شرور سے بچا رہتا ہے۔

باقی پانچ لطائف کے افعال

ان سب کا فعل مقصودِ حقیقی کی طرف توجہ اور اس کا تصور ہے اسی تصور کو ذکر، یاد، دھیان، وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے تو ان پانچ لطائف کے فعلِ تصور کی اصل حقیقت اس قدر ہے کہ نفس ذات باری تعالیٰ کا تصور ذہنی قائم ہوجائے اور اس کے لئے ذکر مفرد کیا جائے اور لفظ اللہ کے لئے کسی صفت کا تصور جیسے "اللہ قادر، اللہ علیم، اللہ سمیع، اللہ بصیر" وغیرہ کہنا اصل ذکر کے تحقق کے لئے لازم نہیں۔ بس لفظ اللہ ہی کافی ہے۔ کیونکہ بالاتفاق ایسا ذکر یا اس کا تصور جائز ہے۔ کیونکہ علماء کرام کا ذکرِ قلبی جس میں کسی صفت کا ذکر نہ ہو، کے جائز ہونے پر اتفاق ہے تو اس سے اس کا ذکرِ لسانی میں بھی جواز ثابت ہوتا ہے کیونکہ ذکرِ لسانی تو ذکرِ قلبی ہی کا اظہار ہے تو اس میں کیا خرابی ہو سکتی ہے اس کو یوں سمجھا جائے کہ تصور کے درجات مختلف ہیں۔ باقی لطائف کے افعال جاننے کے لئے البتہ چند اصطلاحات کے جاننے کی ضرورت ہے اور وہ درج ذیل ہیں۔

ذکر، حضور، مکاشفہ، شہود، معائنہ

ان کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ

(1) ایک شخص کا اپنے محبوب جو موجود و حاضر نہ ہو بلکہ غائب اور غیر موجود ہو اس کو جب یاد کیا جائے۔

(2) وہ محبوب سامنے موجود ہو لیکن کافی دور ہو جس سے خط و خال اچھی طرح نظر نہ آ سکیں اس کا تصور کیا جائے۔

(3) وہ قریب اور سامنے ہو جس سے خط و خال اچھی طرح نظر آ سکیں اس کا تصور کیا جائے۔

(4) وہ شخص بالکل قریب موجود ہو اس کے تصور و دیدار میں اس قدر محویت ہو جائے کہ فرطِ عشق و محبت کی وجہ سے اپنی بھی خبر نہ رہے۔

(5) وہ محویت یہاں تک ترقی کرے کہ بے خبری کی بھی خبر نہ رہے۔

یہ تصور کے پانچ درجات ہیں۔ ان میں چوتھا اور پانچواں درجہ اونگھ اور نیند کے مشابہ ہے کیونکہ اونگھ میں اونگھنے والے کو یہ علم ہوتا ہے کہ میں اونگھ رہا ہوں۔ لیکن جسم و دماغ پر ایک نیم شعوری کی کیفیت چھائی رہتی ہے۔ گو دیگر اشیاء سے لاعلمی ہو مگر اس لاعلمی کا اس کو علم ہوتا ہے اور پانچواں درجہ بالکل نیند کی مانند ہے کہ سونے والے کو اس کا بھی علم نہیں ہوتا کہ میں سو رہا ہوں بس لایدری کا پورا مصداق ہوتا ہے۔ ورنہ وہ سونے والا نیند میں نہیں ہوگا۔ کیونکہ نیند کے لئے یہ لازم ہے کہ نیند سے بھی بے خبری ہو۔ جب تمثیل سے اتنی بات سمجھ میں آگئی تو اب تصوف کے پانچوں اصطلاحی درجوں کو ان سے سمجھا جائے۔

صوفیاء کے یہاں درجہ اول کا نام ذکر ہے۔ کیونکہ اس میں محض یاد ہے۔ دوسرے درجے کا نام حضور ہے کیونکہ اس میں جس کا تصور کیا جارہا ہے اس کی موجودگی محسوس ہو رہی ہوتی ہے۔ تیسرے درجے کا نام مکاشفہ ہے کیونکہ اس میں اس محبوب کے غایت قرب کی وجہ سے حضورِ تام اور کامل انکشاف ہوتا ہے۔

چوتھے درجے کا نام شہود و مشاہدہ ہے کیونکہ صوفیاء کی اصطلاح میں شہود و مشاہدہ حضور اتّم و اکمل کو کہتے ہیں اور اس درجہ میں حضور اتّم و اکمل سے غایت شیفتگی و فریفتگی اور حالتِ وفور والہانہ ہوتی ہے۔ اس درجہ کا نام فناء بھی ہے کیونکہ محویت کی وجہ سے اپنی ہستی کا علم نہیں ہوتا۔ پانچویں درجہ سے مراد معائنہ ہے۔ معائنہ سے مراد اصطلاحاً وہ حضور و معائنہ ہے جو شہود و اصطلاحی سے زائد ہو اور اس درجہ میں معائنہ شہود اصطلاحی سے زائد ہوتا ہے کیونکہ لاعلمی سے بھی لاعلمی ہوتی ہے اس وجہ سے اس کا نام فناء الفناء بھی ہے کیونکہ غایت محویت کی وجہ سے اپنی لاعلمی کا بھی علم نہیں ہوتا۔ اسی کو کسی نے کہا ہے کہ

اس میں گم ہو جانا ہی وصال ہے بس — یہ فنا ہے یہی کمال ہے بس
ہو فنا ذات میں کہ تو نہ رہے — تیری ہستی کا رنگ و بو نہ رہے

تو تصور مقصودِ حقیقی کے یہ پانچ درجات ہیں۔

(1) ذکر (2) حضور (3) مکاشفہ (4) شہود و مشاہدہ و فنا (5) معائنہ و فناءالفناء

اس کے بعد یہ سمجھا جائے کہ لطیفۂ قلب کا فعل ذکر ہے۔ لطیفۂ روح کا فعل حضور، لطیفۂ سر کا فعل مکاشفہ، لطیفۂ خفی کا فعل شہود و مشاہدہ و فناء، اور لطیفۂ اخفیٰ کا فعل معائنہ اور فناء الفناء اور یہی ان کے آثار بھی بتائے جاتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ نفسِ مطمئنہ کی غذا معاصی سے بچنا ہے۔ قلب کی غذا ذکر ہے۔ روح کی غذا حضوری ہے۔ سِرّ کی غذا انکشافِ حقائق ہے۔ خفی کی غذا شہود و فنا ہے۔ اخفیٰ کی غذا فناءالفناء ہے (بعض نے اس میں کسی قدر اختلاف کیا ہے)

ان افعال لطائف اور تصور کے درجات کے حاصل ہونے کے لئے حضرات مشائخ مختلف طریقوں سے تعلیم کرتے ہیں۔ بعض حضرات، طالبین و سالکین کو ذکر کے مخصوص طرز کے ساتھ اس قدر مشق کرنے کو فرماتے ہیں کہ یہ لطائفِ خمسہ علیحدہ علیحدہ ذاکر ہو جائیں۔ یہ سب افعال ان سے صادر ہونے لگیں اور بعض حضرات، صرف قلب سے ذکر کی مشق کرنے کو فرماتے ہیں جن سے ان سب

افعال کا صدور ہونے لگے۔ اس کی بالکل ضرورت نہیں سمجھتے کہ یہ بتایا جائے کہ یہ فعل کس لطیفہ کا ہے۔ کیونکہ یہ حضرات لطائف کی طرف تفصیلی توجہ کو بھی حجاب سمجھتے ہیں کیونکہ حدیث شریف میں بھی قلب کا ذکر وارد ہے۔ فرمایا کہ "اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ" (صحیح ابن حبان:297) بیشک اس جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے اگر وہ ٹھیک ہوگا تو سارا جسم ٹھیک ہوگا اور اگر یہ خراب ہوگیا تو سارا جسم خراب ہوگا۔ آگاہ ہو جاؤ یہ دل ہے۔ تو ایسے اُمور میں صرف قلب ہی کا ذکر وارد ہوا ہے۔ یہ چشتی مسلک ہے۔

اور وہ حضرات جو لطائف کے ساتھ مشغول ہوتے ہیں ان کے نزدیک بھی یہ لطائفِ خمسہ آپس میں متصل ہیں۔ اس لئے صرف ذکرِ قلبی سے بھی بقیہ لطائف میں آثار اور افعال مذکورہ سرایت کرتے جاتے ہیں کیونکہ یہ لطائف آپس میں ایک دوسرے سے انعکاسی طور پر اثر لیتے ہیں جیسے ایک آئینہ پر سورج کی شعاعیں پڑ رہی ہوں اس کے مقابلے میں دوسرا آئینہ اس طرح رکھا جائے کہ سورج کا عکس اس آئینہ میں اس آئینہ سے منعکس ہو۔ اس طرح پھر تیسرا پھر چوتھا آئینہ رکھا جائے تو جیسے ایک آئینہ سے دوسرے متصل آئینوں میں سورج کی روشنی آرہی ہوتی ہے ایسے ہی ذکرِ قلبی سے دوسرے لطائف پر بھی اثرات مرتب ہو رہے ہوتے ہیں۔

حضرات صوفیاء کے نزدیک حدیث شریف میں جس قلب کا ذکر ہے، گو اس سے لطیفۂ قلب مراد نہیں، مضغہ ہی مراد ہے۔ لیکن یہ حکم اصل میں اس لطیفہ کا ہے جس کو اس مضغہ کے ساتھ غایت تعلق ہے جیسے حالتِ ادراکیہ کو صورتِ علمیہ کے ساتھ ہوتی ہے۔

یہ گوشت کا دل جسدِ ظاہری کا جزو اور مادی شے ہے اور جو لطیفۂ قلب ہے وہ اور شے ہے۔ وہ مادی نہیں ہے مجرد ہے۔ اس لطیفہ کا دل سے تعلق افاضہ آثار و انوار کا ہے جیسا کہ حکماء بیان فرماتے ہیں کہ نفسِ ناطقہ جس کی تفصیل احقر کی کتاب "لطائف کی حقیقت" میں دی ہوئی ہے، مجرد ہے، جزوِ بدن نہیں مگر اس کا

تعلق بدن سے تصرف و تدبیر کا ہے تو جس طرح لطیفۂ قلب کو مادی جسم کے ایک خاص حصّے یعنی قلبِ صنوبری سے تعلق ہے اسی طرح بقیہ چاروں لطائف کو بھی جسمِ انسانی کے خاص خاص مقامات سے افاضۂ آثار و انوار کا تعلق ہے۔ اسی تعلق کی وجہ سے جب ذاکر لطائف سے ذکر کرنا چاہتا ہے تو ان لطائف کے خاص خاص مقامات جن کو ان لطائف سے تعلق ہے ان کی طرف بھی توجہ کرتا ہے۔ چنانچہ جب لطیفۂ قلب کو ذاکر بنایا جاتا ہے تو قلبِ صنوبری کی جانب توجہ کی جاتی ہے اسی طرح دوسرے لطائف کے ذاکر بنانے میں بھی ان کے محل و مقام کی طرف توجہ کی جاتی ہے البتہ توجہ کے طریقے مختلف ہیں جو عمل کرانے والے کی رائے پر موقوف ہیں وہ جس طریقہ کو مناسب سمجھتا ہے بتا دیتا ہے۔

اس ذکرِ لطائف کے سلسلے میں اصل تو ذکر ہی ہے اگرچہ اس کے ساتھ دوسری چیزوں کو بھی بیان کیا جاتا ہے۔ جیسے فکر، شغل، مراقبہ، تصور، یہ سب ذکر ہی کی قسمیں ہیں۔ ذکر ہی کے ذرائع ہیں۔ ذکر ہی کے رسوخ و ملکہ کے طریقے ہیں۔ ان سب کے مجموعہ کو اہلِ فن اصطلاحاً ذکر کہتے ہیں۔ ذکر سے مراد وہی ذکر ہے جو شریعت میں مذکور، ماثور و منقول اور معمول بہٖ اور مقصود ہے اور شغل وغیرہ سے مراد ہیئتِ ذکر ہے گویا کہ وہ ذکر کی علتِ صوریہ ہے یعنی یہ تصور کیا جائے کہ فلاں موقع جو فلاں لطیفہ کا محل ہے، مشغولِ ذکر ہے جیسے زبان ذاکر ہے اسی طرح یہ محل بھی ذاکر ہے۔

مثلاً لطیفۂ قلب میں لسانی ذکر کے ساتھ یہ تصور کیا جائے کہ یہ دل بھی ذکر کر رہا ہے تو لطائف کے ذکر میں اصطلاحی شغل بھی ہوتا ہے یعنی لطیفوں کے محل کے متعلق یہ تصور کیا جاتا ہے کہ ذکرِ الٰہی میں یہ محل بھی ہم نوائے لسان ہے اور اسی شغل کی تقویت اور اس کے کامیاب اور مؤثر بنانے کے لئے بعضے اور افعال بھی کئے جاتے ہیں۔ مثلاً کلماتِ ذکر کو سانس سے اوپر اٹھایا جاتا ہے پھر وہاں سے دماغ میں پہنچایا جاتا ہے اور وہاں پہنچا کر سانس کو روک لیا جاتا ہے۔ اور یہ تصور کیا جاتا ہے کہ ام الدماغ میں سانس بند ہے کیونکہ تجربہ سے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ حَبسِ دم کو دفعِ خطرات اور مطلوب کی جانب توجہ قوی

ہونے میں زیادہ دخل ہے چنانچہ شکار میں ہدف کو سامنے رکھنے کے لئے حَبْسِ دم ضروری سمجھا جاتا ہے اسی طرح ذکرِ لسانی یا ذکرِ قلبی میں مشغولیت کی جاتی ہے کہ ذکرِ لسانی کے علاوہ ذکرِ قلبی بھی ہوتا ہے کہ الفاظِ متخیلہ سے قلب کو ذاکر بنایا جاتا ہے جیسے آیت "وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً" اور اپنے رب کو اپنے دل میں عاجزی کرتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے یاد کرتا رہ۔ (الاعراف:205) میں ذکرِ قلبی مراد ہے۔ اور حدیث شریف "كَانَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ أَحْيَانِه" (سنن بن ماجة:302) یعنی آپ ﷺ ہر وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرتے تھے، سے علی الاطلاق ذکر اللہ سے ذکر ہی مستنبط ہوتا ہے کہ بول و غائط و جماع کی حالت میں ذکرِ لسانی کرنا ممنوع ہے تو اس وقت ذکرِ قلبی ہی ہوسکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ ذکر جس طرح لسانی ہوتا ہے قلبی بھی ہوتا ہے بلکہ اگر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ ذکرِ قلبی خود ذکرِ لسانی کی اصل ہے کیونکہ ذکرِ قلبی کلامِ نفسی ہے اور ذکرِ لسانی کلامِ لفظی ہے۔ اسی کو یوں کہا ہے اور یہ مسلم ہے کہ "اِنَّ الْكَلَامَ لَفِى الْفُؤَادِ وَاِنَّمَا جُعِلَ اللِّسَانُ عَلَى الفُؤَادِ دَلِيْلًا" کلام درحقیقت دل ہی میں ہوتا ہے اور زبان تو اس پر دلالت کرنے والی، بتلانے والی ترجمان ہے۔

چنانچہ شریعت نے بہت سے مواقع پر ذکرِ قلبی کو معتبر مانا ہے چنانچہ بالاتفاقِ امت گونگے کے ایمان کے لئے "إِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ" ضروری نہیں صرف توحید و رسالت کا تخیلِ جازم اور اعتقادِ کامل و تصدیقِ تام کافی ہے۔ اسی طرح جو شخص اپنے ارادے اور اختیار سے کفریہ مضامین کو اپنے خیال میں لاکر دل سے ان پر جم جائے وہ شریعت میں کافر ہے تو معلوم ہوا کہ ذکر جس طرح لسانی ہوتا ہے قلبی بھی ہوتا ہے۔ الفاظ متخیلہ سے قلب کو ذاکر بنایا جاتا ہے اور ذکر کو اس میں جمایا جاتا ہے کہ قلب اللہ کے ذکر سے، اللہ کی یاد سے، اللہ کے خیال سے، اللہ کے تصور سے، اللہ کے دھیان سے غافل نہ ہو۔ دل میں اللہ کی یاد ایسی جم جائے کہ کسی آن اس سے نہ اترے۔ اِلَّا ماشاءاللہ۔

حاصل یہ کہ ذکرِ لطائف اصطلاحاً دو چیزوں سے مرکب ہے۔ ذکر اور فکر۔

اسی فکر کو جو ذکر کے ساتھ اس خاص طریقے سے ہے شغل سے تعبیر کیا جاتا ہے پس ان دونوں کے مجموعہ سے یعنی ذکر کی مشق اور فکر کی استقامت سے لطائف کے محل میں مختلف اور نئے نئے آثار و کوائف محسوس ہوتے ہیں، خواہ وہ آثار و کوائف ان مقامات میں پہلے سے موجود ہوں اور احساس و ظہور اب ہوا ہو خواہ یہ آثار و کوائف اس فکر کے بعد پیدا ہوئے ہوں اور یہ آثار و کوائف کبھی حرکات کی شکل میں ظہور پذیر ہوتے ہیں اور کبھی آوازوں کی صورت میں رونما ہوتے ہیں۔ اور یہ آوازیں کبھی الفاظ کے بغیر ہوتی ہیں اور کبھی خاص خاص الفاظ ان مقامات میں محسوس ہوتے ہیں۔ اور یہ الفاظ بعض کے نزدیک صرف خیالی ہوتے ہیں اور بعض فرماتے ہیں کہ خیالی نہیں بلکہ حقیقتاً ان لطائف کے مقامات میں پہلے سے موجود و محفوظ ہیں۔ جیسا کہ قرآن شریف میں ہے کہ "وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ" (الاسراء:44) کہ ہر چیز اس کی حمد کی تسبیح کرتی ہے اور ذکر کرتی ہے۔

چونکہ لطائف کے مقامات بھی اشیاء ہیں اس لئے وہ بھی آیت شریفہ کے منطوق کے موافق تسبیح میں مشغول ہوں گے اور یہ تسبیحات ہی وہ الفاظ ہیں جو ذاکر کو اب ان مقامات میں محسوس ہو رہے ہوں اور کبھی یہ آثار و کوائف مختلف رنگوں میں نمایاں ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ذکر کی مشق اور فکر و شغل کی پابندی پر تینوں قسم کے آثار و کیفیات مرتب ہیں جو فکر کے سرایت کی علامت ہیں۔

(1) لطائف کی جگہوں میں حرکت

(2) ان لطائف کے مخصوص مقامات میں کسی آواز کا سنا جانا

(3) ان لطائف کے مخصوص مقامات میں کسی رنگ کا ظاہر ہونا۔

یہ تینوں آثار و کیفیات انتہاء مشق سے پیدا ہوتے ہیں اور سرایتِ ذکر کی علامات سمجھے جاتے ہیں۔

کبھی ذکر و فکر کی مشق پر یہ تینوں آثار مرتب ہوتے ہیں کبھی ایک یا دو پائے جاتے ہیں لیکن واضح رہے کہ یہ آثار سرایتِ ذکر کی محض علامات ہیں۔

سرایتِ ذکر کی حقیقت میں داخل یا اس کے لوازمات میں سے نہیں ہیں۔ ان تین علامات کے ظہور سے ولایت و مقبولیت پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ اصل مقصود تو ذکر و فکر و شغل کی پابندی سے یہ ہے کہ ذہول و غفلت کم ہو اور اکثر اوقات اس کی دھن اور دھیان نصیب ہو۔ ان آثار سے تقویت و تائید کا فائدہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات بعض طبعیتوں کو وساوس و خطرات کا ہجوم ہوتا ہے اور وہ یکسوئی و دفع وساوس کے طالب ہوتے ہیں اس لئے شیخ کامل اس ذکرِ لطائف کی مشق کراتا ہے تاکہ سکون و اطمینان حاصل ہو جائے اور طبیعت سے انتشار و وساوس تخیل کی پراگندگی دور ہو جائے۔

اس لئے بھی اہلِ طریق کبھی لفظ اللہ کاغذ پر لکھ کر اس پر نظر جماتے ہیں اور کبھی اس کو لکھتے رہنے کا عمل تجویز کرتے ہیں۔ یعنی لفظ اللہ برابر لکھتے چلے جائیں حتیٰ کہ یہ اسم اعظم قلب و ذہن میں اچھی طرح راسخ ہو جائے لیکن یہ سب طریقے مقصود بالذات نہیں بلکہ صرف یکسوئی کے وسیلے ہیں جو کہ ایک درجہ میں شرعاً بھی مطلوب ہیں۔ اس شرعی مطلوبیت کا درجہ اس سے واضح ہوتا ہے کہ کھانے کے تقاضا کے وقت نماز سے قبل کھانے سے فراغت حاصل کرنے کا حکم ہے تاکہ یکسوئی ہو جائے اور نماز اعتدال و اطمینان سے ادا کی جائے۔ تو کھانے سے فراغت مقصود بالذات نہیں بلکہ یکسوئی کا وسیلہ ہے تاکہ نماز اطمینانِ قلب سے ادا ہو سکے۔ اسی طرح لفظ اللہ لکھ کر کاغذ پر، اس پر نظر جمانا یا عمل استکتاب (بار بار لکھنا) مقصود بالذات نہیں بلکہ یکسوئی کا وسیلہ ہے مگر عبادت کا مقدمہ ہونے کی وجہ سے ان کا شمار حسنات ہی میں ہے اور ان پر اجر و ثواب ہوتا ہے جیسے نماز میں یکسوئی و اطمینان کی نیت سے کھانے سے فراغت پر اجر و ثواب ملتا ہے۔ پس یہ بات خوب یاد رکھنے کی ہے کہ یہ کیفیات اگر عبادت کا مقدمہ نہ بنائی جائیں تو پھر ان کا کچھ اجر نہیں اور مقاصد میں سے تو کسی حال میں داخل ہی نہیں۔ چنانچہ ان رنگوں وغیرہ کا انکشاف غیر مسلمین تک کو بھی یکسوئی سے حاصل ہو جاتا ہے حتیٰ کہ مجنونوں کو بھی جیسا کہ کتاب فنِ طب، شرح اسباب میں صراحتاً مذکور ہے کہ جنون میں کشف ہو جاتا ہے کیونکہ بعض

اوقات مجنوں کے تخیلات بھی کسی ایک مرکز پر مجتمع ہو جاتے ہیں۔ نیز اگر کسی شخص کو معصیت کے ارتکاب میں یکسوئی ہو جائے تب بھی اس کو حقائقِ کونیہ کا کشف ہو سکتا ہے بلکہ بعض لوگوں میں فطرتاً کشف سے مناسبت ہوتی ہے۔ ان کو یکسوئی کو حاصل کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی چہ جائیکہ اسلام کی، اسی لئے غیر مسلم اور گنہگار مسلمان کے لئے ایسے اُمور کو ایسے کشفیات اور صوری کرامات کو کہانت اور استدراج کہا جاتا ہے۔

نماز میں لطائفِ ستہ کے آثار

قرآن پاک میں آیا ہے إِنَّ الصَّلاةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللهِ أَكْبَرُ (العنکبوت:45) یعنی نماز بے حیائی کی باتوں اور منکرات سے روکتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی یاد تو بڑی چیز ہے۔ پس نماز کا پہلا اثر جوارح پر ہوگا یا دوسرے لفظوں میں جوارح نماز کے اندر اگر مشغول ہوں گے تو ان جوارح سے جو گناہ ہوتے ہیں تو ان سے بچت ہو جاتی ہے۔ جب نماز اس سے ترقی کرتی ہے تو اس کا اثر پھر نفس پر ہوگا یا نفس کو نماز کے لئے مجبور کیا جائے گا اور اس میں مشقت اٹھانے پر تیار کیا جائے گا تو ان آثار کے ظہور کی صورت یہ ہے کہ صلوٰۃ سات درجے کی ہے۔

(1) صلوٰۃ تن (2) صلوٰۃ نفس (3) صلوٰۃ قلب (4) صلوٰۃ روح (5) صلوٰۃ سِرّ (6) صلوٰۃ خفی (7) صلوٰۃ اخفیٰ۔

(1) صلوٰۃِ تن: گناہوں سے روکتی ہے۔

(2) صلوٰۃِ نفس: تعلقات سے روکتی ہے۔

(3) صلوٰۃِ قلب: غفلت میں پڑنے سے روکتی ہے۔

(4) صلوٰۃِ روح: غیر کے دیکھنے سے مانع ہوتی ہے۔

(5) صلوٰۃِ سرّ: غیر اللہ کی طرف نظر کرنے سے روکتی ہے۔

(6) صلوٰۃِ خفی: انسان کو مرتبہ انابت میں پہنچاتی ہے کہ اس سے اس پر

حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔

(7) صلوٰۃِ اخفیٰ: مشاہدہ ذاتِ بحت اور جامعیت مقام معراج ہوتی ہے۔

لطائفِ ستہ کے بیان کا خلاصہ

یہ لطائف کے سلسلے میں بیان تھا مگر طویل ہو گیا اس لئے اب خلاصہ کے طور پر لطائف کی تعداد، نام، محال، الوان اور افعال لکھے جاتے ہیں۔ لطائف چھ ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔

(1) لطیفۂ نفس (2) لطیفۂ قلب (3) لطیفۂ روح (4) لطیفۂ سِرّ (5) لطیفۂ خفی (6) لطیفۂ اخفیٰ

محل یعنی جگہیں

ان کی جگہیں یہ ہیں۔ لطیفۂ نفس کی جگہ زیرِ ناف ہے۔ لطیفۂ قلب کی جگہ قلبِ صنوبری ہے جو بائیں پستان کے دو انگل نیچے ہے۔ لطیفۂ روح کی جگہ دائیں پستان کے دو انگل نیچے اور لطیفۂ قلب کے محاذی ہے۔ لطیفۂ سِر کی جگہ ذقن کے نیچے سینہ کے بیچوں بیچ ہے۔ لطیفۂ خفی کا محل دونوں ابروؤں کے درمیان ہے۔ لطیفۂ اخفیٰ کا محل ام الدماغ (سَر کے اوپر کا حصہ) ہے۔ یہ حضرت مولانا آدم بنوریؒ کی تحقیق ہے حضرت خواجہ معصومؒ کی تحقیق کے مطابق لطیفۂ قلب کا محل قلبِ صنوبری ہے جو بائیں پستان کے دو انگل نیچے ہے۔ لطیفۂ روح کا محل دائیں پستان کے دو انگل نیچے ہے اور لطیفۂ قلب کے محاذی ہے۔ لطیفۂ سِر کا محل دل سے چار انگل اوپر اور سینہ کی درمیانی لکیر کی طرف دو انگل کے فاصلے پر ہے۔ لطیفۂ خفی کا محل لطیفۂ روح کے مقام سے چار انگل اوپر اور دو انگل کے بقدر سینہ کی درمیانی لکیر کی طرف ہے۔ لطیفۂ اخفیٰ لطیفۂ سِر، لطیفۂ خفی اور گلے کی جڑ تینوں مقامات سے برابر فاصلے پر ہے۔

لطائف کے دور میں مردوں اور عورتوں کا فرق

عورتوں کے لئے معصومیہ طریقے کے لطائف کا اجراء بہتر ہے کیونکہ یہ پانچوں سینے میں ہیں۔ عورتیں اعصابی لحاظ سے کمزور ہوتی ہیں تو بنوریہ لطائف میں چونکہ اخفیٰ سر میں واقع ہے اس لئے اس کے اجراء کے ساتھ ان کا سر ہل سکتا ہے جو عورتوں کے لئے پریشانی کا باعث ہو سکتا ہے۔ مردوں کو دونوں قسم کے دور کرائے جا سکتے ہیں تا کہ بعد میں اگر ان سے خواتین بیعت ہوں تو وہ معصومی طریقہ بھی جانتے ہوں۔ بنوری طریقے میں کچھ مخصوص فوائد ہونے کی وجہ سے ان سے یکسر اعراض کرنا مناسب نہیں ہوگا۔

لطائف کے رنگ

لطائف کے رنگ یہ ہیں۔ لطیفۂ نفس کا رنگ زرد، لطیفۂ قلب کا سرخ، لطیفۂ روح کا سفید، لطیفۂ سر کا سبز، لطیفۂ خفی کا نیلا اور لطیفۂ اخفیٰ کا سیاہ ہے۔

لطائف کے افعال و آثار

لطائف کے افعال و آثار یہ ہیں۔ لطیفۂ نفس کا فعل غفلت و شہوت ہے۔ مقاومت و مخالفتِ نفس کا ذریعہ انقطاع عن الخلق ہے۔ لطیفۂ قلب کا فعل ذکر ہے۔ لطیفۂ روح کا فعل حضور ہے۔ لطیفۂ سِر کا فعل مکاشفہ ہے، لطیفۂ خفی کا فعل شہود و مشاہدہ اور فناء ہے۔ لطیفۂ اخفیٰ کا فعل معائنہ اور فناء الفناء ہے۔

2.1.2.2.1.2... شغل

شغل کی حقیقت اتنی ہے کہ اگر ذکر میں وساوس تنگ کریں اور کسی طرح دور نہ ہوں تو دل کو کسی تدبیر سے جب کسی ایسی چیز کی طرف مائل کیا جائے کہ اس سے یکسوئی حاصل ہو اور وساوس دور ہوں شغل کہلاتا ہے۔ یاد رکھیئے کہ یہ مقصود نہیں لیکن معاون فی المقصود ہو سکتا ہے۔ اس کی اصل نماز میں نظر کا محبوس کرنا۔ بکاء کی کیفیت کو ضبط کرنا اور سترہ وغیرہ ہے۔ حبس دم بھی اس کی

ایک قسم ہے۔ یہ گو کہ جوگیوں سے لیا گیا ہے لیکن یہ ان کا کوئی مذہبی شعار نہیں تھا اس لئے ایک تدبیر کے طور پر اس کا لینا جائز تھا جیسا کہ جنگِ خندق میں خندق کا کھودنا۔

شغل اسمِ ذات

کاغذ کے ایک ٹکڑے پر دل کی تصویر بنا کر اس پر لفظ اللہ خوبصورت لکھا جائے اور پھر اس کو بغور مسلسل دیکھا جائے حتیٰ کہ اس کا نقش دل پر جم جائے۔ یا دل پر ایک خیالی قلم سے لفظ اللہ لکھنے کی کوشش کی جائے۔ عموماً اس میں پہلا طریقہ آسان اور دوسرا مشکل ہوتا ہے۔

سلطان الاذکار

یہ ایک ایسا شغل ہے جس میں ذاکر تمام اعضاء و جوارح کے متعلق ذکر کے وقت یہ اجمالی تصور کرتا ہے کہ یہ سب ذکر کر رہے ہیں ایسے ذکر و شغل کو اہلِ فن سلطان الاذکار کہتے ہیں۔ اس سلطان الاذکار سے بھی ایسی ہی حرکات و الوان و اصوات پیدا ہو جاتی ہیں کبھی چڑیوں کی سی آوازیں سنائی دیتی ہیں کبھی رعد و صاعقہ کی خطرناک گرجیں سنائی دیتی ہیں۔ بعض دفعہ ذاکر ان آثار کے ہجوم سے خائف و پریشان ہو جاتا ہے ایسے موقع پر شیخ کے کلماتِ تسلی اور الفاظِ تشفی سے ہی کشتی پار ہوتی ہے۔

مکتوباتِ قدوسیہ میں اس کیفیت کا بہت ذکر ہے۔ شیخ جلال الدین تھانسیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے حالات میں ان کیفیات کو بار بار لکھا ہے اور حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی تشفیات و تسلیات بھی موجود ہیں، انہیں وساوس کے خطرات و دفع ہجوم کے لئے اور سکون جمع خاطر کے لئے حبسِ دم سے بھی کام لیا جاتا ہے کیونکہ حبسِ دم سے یکسوئی میں اعانت ہوتی ہے البتہ حبسِ دم بہ اندازۂ ضبط و تحمل اور بقدر طاقت ہونا چاہئے اور وہ بھی شیخ کی تعلیم پر، از خود نہیں۔ اس وقت اکثر نے اس کو ترک کر دیا ہے کہ قویٰ و اعصاب میں تحمل نہیں۔

غور طلب

صوفیاء کی ان تعلیمات کے ترک پر اعتراض نہ ہونا چاہئے چونکہ ان حضرات محققین کا کوئی اس قسم کا طریقِ تعلیم خلافِ شرع نہیں ہوتا بلکہ شریعت سے اس کی اجازت ہوتی ہی ہے کہیں یقیناً کہیں ظناً کہیں احتمالاً۔ اس لئے اس کو خلافِ شریعت نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ "اِجْعَلْ بَصَرَكَ حَيْثُ تَسْجُدُ" (السنن الكبرى للبيهقي:2/ 284) کہ نماز کی حالت میں اپنی نظر کو سجدہ کی جگہ پر جمائے رکھو۔ تو یہ حکم جیسے ادب تعظیم کی رعایت کے لئے ہے اسی طرح یہ حکم جمعیتِ خاطر و اطمینانِ قلب اور یکسوئی حاصل کرنے کے لئے بھی ہے، اسی سے حضرات صوفیاء کرام نے اشغال کی اصل کا ثبوت نکالا ہے اور ایسے ظنی اُمور میں احتمال بھی کافی ہوتا ہے جو اجتہاد کے جوڑ سے راجح بھی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس احتمال سے اس امر کا تو یقین ہو جاتا ہے کہ صوفیاء کا تجویز کیا ہوا شغل شریعتِ مطہرہ میں بے اصل نہیں۔ جیسے حضرات مجتہدین و فقہاء صریح نصوص کے بغیر بعض احتمالات پر محض ذوق سے ظنی ظاہری احکام کا استنباط فرماتے ہیں۔ اسی طرح یہ حضرات بھی ظنی باطنی احکام کا استخراج کرتے ہیں، کیونکہ یہ حضرات بھی فنِ طریقت کے احکام میں مجتہد ہیں۔

الغرض ذکرِ لطائف و سلطان الاذکار حبسِ دم وغیرہ میں اصل مقصد یہ ہے کہ ذاکر کے دل و دماغ میں ایک راسخ ملکہٗ یاداشت پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے اکثر اوقات میں مقصود سے غفلت نہ ہو۔ بلکہ ذکر میں مشغول رہے۔ جو کہ مطلوب عنداللہ ہے۔ جس پر "لَا يَزَالُ لِسانُكَ رَطْباً مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ" (رواه الترمذي وصححه الألباني) یعنی تیری زبان ذکر اللہ سے ہر وقت تر رہنی چاہئے۔ اور "كُلُّ مُطِيْعٍ لِلّٰهِ فَهُوَ ذاكِرٌ" یعنی جو بھی اللہ تعالیٰ کا فرمان بردار ہے وہ ذاکر ہے، نیز آیت شریفہ صریحہ منصوصہ "فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ" پھر جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہونے کی حالت میں یاد کرو۔ (النساء:103) صریحۃ الدلالۃ ہیں۔ اور پھر

آیات و احادیث سے کثرتِ ذکر کا حکم ظاہر ہے۔ حتیٰ کہ ارشاد ہے کہ "عَنْ أَبِي سَعِيدٍ، عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ:"أَكْثِرُوا ذِكْرَ اللهِ حَتّٰى يَقُولُوا: مَجْنُونٌ" (أخرج أحمد وأبو يعلى وابن حبان والحاكم وصححه) اللہ تعالیٰ کے ذکر کو اس کثرت کے ساتھ کرو کہ لوگ تمہیں مجنون کہیں ۔اسی کثرتِ ذکر کو حضرات صوفیاء دوام ذکر سے تعبیر فرماتے ہیں پس جب تصریح قوم (صوفیاء) سے معلوم ہو چکا کہ تمام اذکار و اشغال سے مقصود اصلی یہ ہے کہ ذاکر کے دل و دماغ میں ایک مستحکم اور راسخ ملکہ یادداشت پیدا ہو جائے جس میں اکثر اوقات ذہول و غفلت نہ ہو تو اس ذکر میں قوت و ترقی ہو کر وہ درجات پیدا ہو جاتے ہیں جن کا ذکر کیا جا چکا ہے یعنی ذکر، حضور، مکاشفہ، شہود اور معائنہ۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو ان اشغال و مراقبات وغیرہ جیسی تدبیروں اور طریقوں کی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہ سید الانبیاء و المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انفاسِ طیبہ کی برکات اور صحبت کے فیوض سے اپنے قلوب اور ذہنوں میں ایسی قوی اور کامل استعداد رکھتے تھے کہ ان اُمور کو مقصود کا ذریعہ بنانے کی ان کو ضرورت نہ تھی۔ جن منصوص ذرائع کا ذکر گذرا ہے وہی ان کو کافی تھے۔یہی راز ہے کہ یہ علوم مروجہ خیرالقرون میں مدون نہیں ہوئے۔ جوں جوں خیرالقرون سے دوری ہوتی گئی ،مختلف مشکلات کے حل کے لئے علوم کی تدوین کی ضرورت کا احساس ہوتا گیا جس کو علماء امت نے خیرالقرون سے متصل قریبی زمانوں میں اچھے طریقہ سے انجام کو پہنچا دیا اور چونکہ ضرورتیں مختلف تھیں اس لئے فطرتاً تقسیم کار کی ضرورت محسوس کی گئی۔ چنانچہ بعض حضرات نے علمِ ظاہر کی جانب توجہ کی اور اس کے مختلف شعبوں میں سے کسی خاص شعبے کو اپنا مخصوص کام کا میدان بنا لیا گو اور شعبوں کی جانب بھی بقدرِ ضرورت متوجہ رہے اور بعض حضرات نے امانتِ باطنی کو سنبھالا اور اس خاص شعبہ شریعت کو مخصوص توجہات کا مرکز بنایا۔

اس طرح دونوں جماعتوں نے امتِ مرحومہ کی خدمت کی پس ہم میں چونکہ استعداد کی کمی ہے اور ہم ضعیف العقائد بھی ہیں، ہمارے دل و دماغ میں

دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے اس کا حسن و جمال مرکوز اور جما ہوا ہے، حقائق ہم سے چھپے ہوئے ہیں اس لئے ہم کو وصولی الی اللہ کے لئے اور قربِ حق کے لئے ان ذرائع اور خاص وسائل کی حاجت ہے اور شدید حاجت ہے اس لئے کتبِ تصوف کی تدوین ہوئی اور ان میں باطنی بیماریاں، ان کی وجوہات، تشخیص کے طریقے اور علاج کمالِ وسعت کے ساتھ مدون و مضبوط موجود ہیں، باوجود اس کے سالکین کو سلوک کے مراحل طے کرنے، اصلاحِ نفس اور تزکیہ اخلاق میں شیخ کامل کی سخت ضرورت ہوتی ہے جیسا کہ طب کی کتابیں ہوتے ہوئے حکیم ڈاکٹر کی ضرورت ہوتی ہے۔ شیخ کی تعلیم و تربیت کے بغیر شیطانی جالوں اور چالوں سے محفوظ رہنا اور صحیح سالم منزل مقصود پر پہنچنا کافی مشکل اور عادتاً محال ہے۔ شیخ کامل مختلف اذکار و اشغال وغیرہ میں سے اپنی بصیرت، فہم و فراست اور اپنے تجربات کی بنا پر اس راہِ سلوک کی ہر سمت میں علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین کے ساتھ سفر طے کر چکا ہوتا ہے تو اب وہ ہر سالک کے مزاج اور خصوصیات کے موافق ذکر و شغل وغیرہ تجویز کرتا ہے۔ جس سالک کی جس طریق سے مناسبت سمجھتا ہے اسی طریق کے ذریعے منزل مقصود کی جانب اس کی رہبری کرتا ہے۔ بالکل ایسی مثال ہے کہ طبِ ظاہری میں جسم کے علاج کے لئے متعدد ادویہ ایک اثر، ایک درجہ، ایک کیفیت اور ایک مزاج کی ہوتی ہیں لیکن طبیب حاذق مختلف اصحاب کے لئے خفی مناسبت کی بنا پر علیحدہ علیحدہ دوا تجویز کرتا ہے، اس پر اعتماد نہیں کرتا کہ یہ دوائیں خواص میں متحد ہیں اس لئے سب مریضوں کے لئے جو ایک ہی مرض میں مبتلا ہیں ایک ہی دوا تجویز کر دوں، تو دیکھئے کتب طبِ ظاہری میں بھی نہایت تفصیل کے ساتھ یہ دوائیں موجود ہیں لیکن مریضوں کے لئے اپنے معاملات میں صرف ان کا مطالعہ کافی نہیں سمجھا جاتا بلکہ ضرور ماہرِ فن طبیب کو تلاش کیا جاتا ہے خصوصاً پیچیدہ امراض میں حتیٰ کہ امراضِ شدیدہ میں تو خود ڈاکٹر بھی اپنے علاج کے لئے اکثر دوسرے ڈاکٹروں سے مشورہ لیتے ہیں پس جو نسبت مرضِ جسمانی اور طب کی کتابوں اور اطباء میں ہے وہی نسبت سالکین کے امراضِ روحانیہ و نفسانیہ اور کتبِ تصوف و مشائخ میں ہے۔

سلطان الاذکار کا طریقہ

اس کے کئی طریقے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ چھوٹے سے حجرہ میں جہاں شور و غل نہ ہو داخل ہو کر درود شریف اور استغفار اور اعوذ باللہ پڑھ کر "اللّٰھم أَعْطِنِیْ نُوْراً وَّ اجْعَلْ لِّیْ نُوْراً وَّ أَعْظِمْ لِیْ نُوْراً وَّ اجْعَلْنِیْ نُوْراً" تین بار حضورِ قلب و تصور کے ساتھ کہے پھر خواہ لیٹ کر یا بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر بدن کو ہلکا کرے اور مردہ تصور کرے اور پورا متوجہ اور باہمت ہو جائے اس کے بعد سانس لیتے وقت "اللہ" کا اور سانس باہر نکالتے وقت "ھُو" کا تصور کرے اور خیال کرے کہ سانس لیتے وقت اور باہر نکالتے وقت ہر بال بال سے "ھُو" نکل رہا ہے۔ یہاں تک مشغول ہو کہ اپنا خیال تک بھی جاتا رہے اور "ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ" کا ہر وقت تصور قائم ہو جائے اِن شاء اللہ تعالیٰ اس طرح سے کچھ عرصہ بعد جسم کا ہر رواں رواں ہر ہر بال ذاکر ہو جائے گا اور انوارِ تجلی سے منور ہو جائے گا۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ حواسِ خمسہ کو روئی سے یا انگلیوں سے اس طرح بند کرے کہ دونوں انگوٹھے دونوں کانوں کے سوراخوں میں دے اور دونوں انگلیاں شہادتین کی دونوں آنکھوں کے پپوٹے پر رکھے اور دونوں انگلیاں بیچ کی دونوں نتھنوں پر رکھے اور دونوں انگلی چھنگلی کے پاس کی اوپر کے ہونٹ پر اور چھنگلی نیچے کے ہونٹ پر رکھے اور اکڑوں بیٹھ کر یا جس طرح بیٹھنے کی سہولت ہے بیٹھ کر زبان کو تالو سے لگائے اور آہستہ آہستہ سانس لے کر حبسِ دم کرے یعنی سانس کو روکے اور لفظ "اللہ" خیال سے بلا حرکتِ لسان ناف سے کھینچ کر ام الدماغ یعنی سر کے بیچ میں روکے۔ جب تک بلا تکلف رک سکے اور وہاں سے دل میں لے جا کر اسمِ ذات "اللہ" خیال سے کہتا رہے۔ جب سانس لینے کا تقاضا ہو تو صرف نتھنوں سے انگلیاں ہٹا کر ناک سے آہستہ سانس چھوڑے تین سانس لے کر پھر حبسِ دم کرے اور پھر ایک ایک سانس بڑھا کر تحمل کی مقدار کو پہنچا دے۔

شغل سلطاناً نصیراً

اس کا طریقہ یہ ہے کہ صبح شام رو بقبلہ دو زانو بیٹھے اور اطمینانِ خاطر سے

دونوں آنکھیں یا ایک آنکھ بند کر کے دوسری آنکھ سے ناک کے نتھنے پر نظر ڈالے اور بغیر پلک جھپکائے جس طرح چراغ یا ستارہ کی روشنی کو دیکھتا ہے غیر معین نور کا تصور کرے اور استغراق ایسا ہو کہ وہ محو ہو جائے۔ ابتداء میں تو آنکھوں میں ضرور تکلیف ہوگی اور پانی بہے گا لیکن چند دن کے بعد جب عادت ہو جائے گی تو یہ تکلیف جاتی رہے گی اور اس کو اپنی صورت جس طرح آئینہ میں نظر آتی ہے نظر آنے لگے گی اور نورِ الٰہی سے منور ہو جائے گا۔ خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اس شغل کے فوائد بہت ہیں خصوصاً خطرات کے انسداد میں عجیب و غریب تاثیر رکھتا ہے۔

شغل سلطاناً محموداً

اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس طرح "سلطاناً نصیراً" کے ذکر میں نتھنوں پر نظر رکھتے ہیں اسی طرح اس شغل میں دونوں بھوؤں کے بیچ نظر رکھتے ہیں۔ اس شغل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذاکر کو اپنا سر نظر آنے لگتا ہے اور جب سر نظر آنے لگتا ہے تو عالمِ بالا کے حالات سے مطلع ہو جاتا ہے۔

شغل سہ پایہ

شغل سہ پایہ "اَللّٰهُ سَمِيْعٌ" "اَللّٰهُ بَصِيْرٌ" "اَللّٰهُ عَلِيْمٌ" کا ذکر ہے۔ طریقہ اس کا یہ ہے کہ چار زانو بیٹھ جائے اور سلطاناً نصیراً کا تصور کرے اور سانس روک کر ناف سے لے کر ام الدماغ تک پہنچائے۔ جب سانس ام الدماغ میں پہنچے تو "اَللّٰهُ سَمِيْعٌ" کہے اور "بِیْ يَسْمَعُ" (مجھے وہ سنتا ہے) کا تصور کرے پھر "اَللّٰهُ بَصِيْرٌ" کہے اور "بِیْ يَبْصُرُ" (مجھے وہ دیکھتا ہے) کا تصور کرے پھر ناف پر "اَللّٰهُ عَلِيْمٌ" کہے اور "بِیْ يَنْطِقُ" (مجھ سے وہ جیسے بات کرتا ہے) کا تصور کرے پھر اس کے بعد اس طرح شروع کرے کہ ام الدماغ میں "اَللّٰهُ عَلِيْمٌ" اور ناف پر "اَللّٰهُ سَمِيْعٌ" عروج و نزول کے طریقہ پر کہے یہاں تک کہ ایک سانس میں ایک سو ایک بار شغل سہ پایہ کرنے لگے۔

غور طلب

یہ شغل لکھ دیئے ہیں جس کی صحت عمدہ ہو، اعصاب میں ضعف نہ ہو اور سالک چاہے تو کرے لیکن شیخ کی تجویز ہر حالت میں ضروری اور مقدم ہے، اطلاع اور اتباع اصل ہے۔ ذکر و شغل یک ضربی، چہار ضربی، پنج ضربی، شش ضربی اور ہفت ضربی بھی ہے۔ لیکن اب بس یک ضربی اور دو ضربی پر کفایت کی جاتی ہے۔ نہ لوگوں میں اس کی طاقت ہے نہ ہی اتنا شوق ہے صرف تشتت کا باعث بن سکتے ہیں الا ماشاءاللہ اور جتنا بتایا گیا ہے اس میں بھی ان سب کو جن کو ان کے ساتھ مناسبت ہو ان شاءاللہ فائدہ ہو سکتا ہے۔

2.1.2.2.1.3... مراقبات

جب ذکرِ ضربی یا سری کی تکثیر سے سالک منور ہو جاتا ہے اور اس کی رگ رگ، رونگٹے رونگٹے میں ذکر سرایت کر جاتا ہے اور ایک محویت کی سی حالت پیدا ہو جاتی ہے تب مراقبات کی تعلیم کی نوبت آتی ہے۔ اصل یہی ہے۔ لیکن اب عوارض کے سبب ذکر کے ساتھ ساتھ ہی مراقبات بھی تعلیم کر دیئے جاتے ہیں۔ کسی ایسے مضمون کو سوچنا جو اللہ جلّ شانہُ تک پہنچانے والا ہو اس کے خیال رکھنے کو مراقبہ کہتے ہیں۔ لہٰذا مراقبہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے مدِ نظر رکھنے کو کہتے ہیں اور مراقبہ خاص یہ ہے کہ خدا کی ذات میں اس قدر فکر کرے کہ اپنے سے بے فکر و بے خبر ہو جائے۔ کبھی یاد دل سے نہ اترے خواہ جمال کے لحاظ سے ہو یا جلال کے لحاظ سے ہو۔ انس کے طور پر ہو یا خشیت کے ساتھ ہو، خوف کے ساتھ ہو یا رحمت کے ساتھ، محبت کے ساتھ ہو یا اس کے ساتھ ملنے کے شوق کے ساتھ۔

طریقہ اس کا یہ ہے کہ دو زانو نمازی کی طرح سر جھکا کر بیٹھے اور دل کو غیر اللہ سے خالی کر دے اور اللہ جل شانہ کی حضوری میں حاضر کر دے اور أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھ کر تین بار "اللّٰهُ حَاضِرِیْ" ، "اللّٰهُ نَاظِرِی" اور "اللّٰهُ مَعِیْ" زبان سے کہہ کر ان کے معنوں

(یعنی اللہ میرے ساتھ حاضر ہے، اللہ مجھے دیکھ رہا ہے اور اللہ میرے ساتھ ہے) کو دل میں ملاحظہ کرے، تصور کرے کہ اللہ تعالیٰ حاظر و ناظر ہے اور میرے پاس ہے، اس جاننے اور تصور کرنے میں اس قدر محو ہو کہ غیر حق کا تصور نہ رہے حتیٰ کہ اپنی بھی خبر نہ رہے۔ اس کے لئے وقوفِ قلبی بہت معتبر ہے۔

وقوفِ قلبی

اس سے مراد دل کا دھیان ہے۔ پہلے ذہن سے شروع ہوتا ہے یعنی ذہن سے دل پر توجہ کرتے ہیں جو بعد ازاں دل کی دل پر توجہ میں بدل جاتا ہے۔ یہ مشق سے آہستہ آہستہ حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیتِ حضوری اور کیفیتِ احسان کے حصول کے لئے ہوتا ہے تاہم اس سے اطمینان کی کیفیت جو حاصل ہوتی ہے وہ "اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ" خبردار! اللہ کی یاد ہی سے دل تسکین پاتے ہیں۔ (الرعد:28) کے ناطے اس کا خاصہ ہے لیکن اس کی نیت نہیں کرنی ہوتی، وہ بھی حاصل ہو تو اس پر شکر کے ساتھ ساتھ جاری رکھنا ہے۔ دل کا دھیان بڑی دولت ہے۔ یہ نصیب ہو جائے تو پھر چاہے پتا چلے یا نہیں روحانی ترقی ہوتی رہتی ہے۔

مراقبہ کی تعریف

کسی بھی چیز کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونے کا نام ہے۔ مثلاً کسی آواز کے سننے یا کسی چیز کو محسوس کرنے یا قلبی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کرنا۔ اس میں خود کچھ کرنا نہیں ہوتا بلکہ جو ہو رہا ہو اس کو محسوس کرنا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں دل پر کسی کو اختیار نہیں۔ اس لئے دل سے ہم کچھ نہیں کروا سکتے لیکن دل جو کچھ کر رہا ہے اس کو محسوس کرنے کی کوشش تو کر سکتے ہیں۔ اصل میں دل ایک لطیفہ ہے اور اس کی طرح جیسا کہ گزر چکا ہے اور بھی لطائف ہیں جیسے لطیفۂ روح، لطیفۂ سِرّ، لطیفۂ خفی، لطیفۂ اخفیٰ اور لطیفۂ نفس۔ ان لطائف کے اصول (جڑیں) عرش سے اوپر ہیں اور ان کے سرے (Sensing Points) ہمارے جسم کے اندر ہیں۔ چونکہ ان کا علم کشفاً ہوا ہے اس لئے ان کے مقامات کے تعین میں اختلاف بھی

ہوا ہے۔ ان لطائف کے حال کی طرف توجہ کرنے سے ہم پر بہت کچھ کھل سکتا ہے اگر ہم ان محسوسات کا صحیح استعمال کرلیں تو ہم کو وہ علوم و معارف حاصل ہوسکتے ہیں جن کا ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔یہاں ان ظلال پر توجہ کر کے ان پر ذکر کے ذریعے ان کے اصول تک پہنچنے کی کوشش کر سکتے ہیں اور پھر ان کے ذریعے مختلف مراقبات کے ذریعے ان علوم و معارف تک محض خدا کے فضل سے رسائی حاصل کرسکتے ہیں جس کے ذریعے ہمارا علم، حال میں بدل سکتا ہے اور یہی ان مراقبات کا ثانوی مقصد ہوتا ہے کیونکہ اصل میں تو شریعت پر کیفیتِ احسان کے ساتھ عمل مقصود ہے لیکن عمل کا درجہ اس کی معرفت کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی میں ہی فرق ہوتا ہے۔ ان محسوسات کی نیت کر کے بس پھر ان لطائف کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونا ہوتا ہے۔ ہمیں کروانا نہیں بلکہ اس نیت کے مطابق محسوس کرنا ہے۔ اگر ہم اس سے کچھ کروانے کی کوشش کریں گے تو اس میں ہماری سوچ کو دخل ہوگا جو محدود ہے اور یہ لطائف ہماری رینج سے بھی باہر ہیں اس لئے فائدہ نہیں ہوگا۔ نیز تھکاوٹ بھی ہوگی لیکن اگر جو ہو رہا ہے ہم اس کو محسوس کرنے کی کوشش کریں گے تو بہت کچھ ہوسکتا ہے۔ البتہ جو ہم محسوس کریں گے وہ امرِ واقعہ ہوگا محض خیال نہیں ہوگا لیکن اس کے امر واقعہ ہونے کے لئے دلیل کی ضرورت ہوگی۔ اپنے شیخ سے سیکھ کر ذکر کے ذریعے ان تمام لطائف کو زندہ کرنا ہوتا ہے یعنی ان کا اپنے اصول کے ساتھ رابطہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس کو عروج کہتے ہیں کیونکہ اس سے عالمِ بالا کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔ اس سے یہ لطائف منور ہوجاتے ہیں اور ان کا رنگ بھی اہل کشف کو محسوس ہوسکتا ہے۔

لطائف کا دور مکمل ہونے کے بعد ان کومزید مراقبات کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ان کی ترتیب شیخ کی بصیرت پر منحصر ہے کہ وہ کونسا مراقبہ کس ترتیب سے کرنے کو بتاتا ہے کیونکہ اس میں اصل مقصود کیفیتِ حضوری اور کیفیتِ احسان ہے۔ اس کے حصول کے لئے جو ترتیب شیخ کامل کے قلب پر مرید کے لئے وارد ہوگی وہی اس کے لئے بہتر ہوگی تاہم شیخ، دوسرے مشائخ کے تجربات سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس میں مرید کی پسند اور ناپسند کو نہیں دیکھا جائے گا بلکہ

اس کے مقصد کے حصول کو دیکھا جائے گا۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ اصل وجود اللہ تعالیٰ کی ذات کا ہے وہ واجب الوجود ہے یعنی جب کچھ بھی نہیں تھا تو وہ تھے اس کے پیدا کرنے سے سب کچھ پیدا ہوا۔ یہ سب جو پیدا ہوئے چاہے امر "کُنْ" سے ہوں یا تخلیق کے ذریعے، یہ سب ممکنات ہیں۔ اللہ تعالیٰ جو چاہے کرسکتا ہے۔ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہم جو گمان رکھیں گے تو "أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ" (البخاری) کے مطابق وہ ہمارے ساتھ وہی معاملہ رکھے گا پس اگر اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو ہمارے لئے ممکن بنایا ہو، ان کا اپنے آپ کو محتاج محض سمجھ کر متوجہ ہوں گے تو اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ ہمارا بھی اس میں حصہ ہوجائے البتہ دو چیزوں کی ضرورت ہوگی ایک اخلاصِ نیت کی اور دوسری متوجہ ہونے کی۔ آگے انتظار ہے۔ "رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ" اے میرے رب تو میری طرف جو اچھی چیز اتارے میں اس کا محتاج ہوں۔ (القصص:24) کے مطابق جو اس بڑے در سے، جہاں سب کچھ ہے، جو مل جائے اس کو نعمت عظمٰی سمجھ کر خوشی حاصل کریں۔

مراقبات کی قسمیں

2.1.2.2.1.3.1... مراقبہ احدیت

یہ نیت کر کے دل کی طرف متوجہ ہونا کہ اس ذات کی طرف سے فیض آرہا ہے جو کہ تمام نقائص و زوال سے پاک ہے اور ہر کمال سے متصف ہے فیض آرہا ہے آپ ﷺ کے دل کی طرف اور آپ ﷺ کے دل سے فیض آرہا ہے میرے شیخ کے دل کی طرف اور میرے شیخ کے دل سے میرے دل میں جو موردِ فیض ہے (وہ جگہ جہاں فیض آنے کا تصور کیا جاتا ہے)، فیض آرہا ہے۔ اس کو غور سے دیکھا جائے تو اس کے دو حصے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کا استحضار اور اس کی طرف سے فیض آنے کا استحضار۔ ان دونوں کو قلبی طور پر دہرانا مقصود نہیں جیسا

کہ بعض لوگ کرتے ہیں بلکہ ان دونوں کے علم کو حال کے طور پر محسوس کرنا ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھیں۔ میں اگر کسی بڑی ہستی کے سامنے بیٹھوں اور اس کی بات کی طرف دھیان کروں تو یہ ذہن میں نہیں دہراؤں گا کہ ایک بڑی ہستی کے سامنے بیٹھا ہوں اور اس کی بات سن رہا ہوں بلکہ اس کو جان رہا ہوں گا کہ بڑی ہستی کے سامنے بیٹھا ہوں اور اس کی بات کی طرف کان لگاؤں کہ کوئی بات سننے سے رہ نہ جائے۔ بس اس طرح اس ذات کا جو تمام نقائص و زوال سے پاک اور تمام کمالات سے متصف ہے کا دھیان دل میں جما کر جاؤں اور اس کی طرف سے فیض کے آنے کا قلب سے محسوس کرتا رہوں۔ اس میں جتنا بھی محسوس ہو نعمت ہے، اس پر شکر کروں اور مزید کے لئے دل کو کُھلا رکھوں کہ جس وقت فیض کا جو قطرہ بھی آئے مجھ سے غفلت کی وجہ سے ضائع نہ ہو۔ ساتھ ساتھ جس ذکر سے ان لطائف کا اجراء کیا ہو وہ چلتا رہے۔یہ غفلت سے بچنے کے لئے ہے ورنہ اس مراقبہ کا مطلوب تو فیض کے آنے کا احساس ہے۔ جب یہ مراقبہ پکا ہو جائے تو پھر صرف فیض کا دھیان ہوتا ہے ذکر بھی محسوس نہیں ہوتا یعنی سالک اسم سے مسمّٰی کی جانب ترقی کر لیتا ہے۔

اس مراقبہ کو دل سے شروع کیا جاتا ہے اور باقی لطائف پر بھی باری باری کرا دیا جاتا ہے۔ مراقبہ تو وہی ہے صرف موردِ فیض بدلتا رہتا ہے۔ اس مراقبہ میں اگر موردِ فیض اوپر کی جانب کھچاؤ محسوس کرے تو یہ اس کا نفسیاتی اثر ہے کیونکہ ہم عرش کو اوپر سمجھتے ہیں۔

2.1.2.2.1.3.2... مراقبہ تجلیاتِ افعالیہ

اس میں موردِ فیض "قلب" ہوتا ہے۔ اس میں ہم اس کا دھیان بناتے ہیں کہ فیض اُس ذات سے (جو "فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ" ہے) آپ ﷺ کے قلب پر آتا ہے، آپ ﷺ کے قلب سے شیخ کے قلب پر اور شیخ کے قلب سے سالک کے قلب پر۔ ہم ویسے جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ کرتا ہے اس مراقبہ میں اس جاننے کو حال کے درجے میں محسوس کیا جاتا ہے۔ ہر چھوٹی بڑی چیز، عزت

ذلت، کامیابی ناکامی، موت و حیات سب اس کے امر سے ہوتا ہے۔ اس کو توحیدِ افعالی کہتے ہیں اس کو درجہ حال میں حاصل کرنا ہوتا ہے۔

2.1.2.2.1.3.3... مراقبہ صفاتِ ثبوتیہ

اس میں موردِ فیض "لطیفۂ روح" ہوتا ہے۔ اس میں فیض آتا ہے اُس ذات سے جو حی و قیوم ہے، قادر سمیع و بصیر ہے جس کے پاس اصل علم ہے، اصل ارادہ اس کا ہے اس کا کلام اصل کلام ہے اور وہی ذات "کُنْ فَیَکُوْن" ہے، یہ فیض آپ ﷺ کے قلب پر اور آپ ﷺ کے قلبِ اطہر سے شیخ کے قلب پر اور وہاں سے سالک کے لطیفۂ روح پر آتا ہے۔ "یَآ اَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ" اے لوگو تم اللہ کی طرف محتاج ہو، اور اللہ بے نیاز تعریف کیا ہوا ہے۔ اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور نئی مخلوق لے آئے۔ اور یہ بات اللہ تعالیٰ پر کچھ مشکل نہیں۔ (فاطر:17-15) ہم ان سب کو عِلماً جانتے اور مانتے ہیں۔ حال کے درجے میں بھی حاصل ہوں اس کے لیے یہ مراقبہ ہے۔ یعنی آپ ﷺ نے جیسے ان کو عِلماً و حالاً پایا تو آپ ﷺ کے طفیل ہمیں بھی اس طرح حاصل ہو۔

2.1.2.2.1.3.4... مراقبہ شیونات ذاتیہ

اس میں موردِ فیض "لطیفۂ سِرّ" ہوتا ہے اور فیض آتا ہے اس ذات سے جس کی ہر لمحے ایک خاص شان ہوتی ہے آپ ﷺ کے قلب پر اور وہاں سے شیخ کے قلب پراور وہاں سے سالک کے سِرّ پر۔ شان سے صفات وجود میں آتی ہیں۔ صفات خارج میں علیحدہ وجود رکھتی ہیں جبکہ شان کا تعلق ذات کے ساتھ ہے۔ اس مراقبے میں مختلف صفات کی طرف جو توجہ ہوتی ہے اس کا رخ ذات کی طرف موڑا جاتا ہے جس کی شیونات (شیونات شان کی جمع ہے) سے مختلف صفات وجود میں آتی ہیں۔ "كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَأْنٍ" ہر روز وہ ایک (نئی) شان

ظاہر فرماتاہے۔ (الرحمٰن:29)

2.1.2.2.1.3.5... مراقبہ تنزیہ و صفاتِ سلبیہ

اس میں موردِ فیض "لطیفہ خفی" ہے۔ اس میں اس ذات سے فیض آتا ہے جو بے چون و بے چگون ہے (یعنی اس کو ذہن میں لانا کہ کیسے ہے ممکن نہیں)، اس کی طرح کوئی نہیں، وہ جسم سے پاک ہے، وراءالوراء ہے، قریب ہے لیکن ایسا نہیں جس طرح ہم کسی کو قریب سمجھتے ہیں، ساتھ ہے لیکن اس کا ساتھ ہونا ایسا نہیں جس طرح ہم کسی کو ساتھ سمجھتے ہیں۔ یہ فیض آپ ﷺ کے قلب پر اور وہاں سے شیخ کے قلب پر اور وہاں سے سالک کے سالک کے لطیفۂ خفی پر آتا ہے۔ اس مراقبہ میں ہم اللہ تعالیٰ جن چیزوں سے پاک ہے، کا دھیان حال کے درجے میں حاصل کرتے ہیں۔

2.1.2.2.1.3.6... مراقبہ شانِ جامع

اس میں موردِ فیض لطیفہ اخفیٰ ہوتا ہے اور فیض آتا ہے اس ذات سے جو اپنی شان کے مطابق تمام صفات و شیونات کی جامع ہے۔ فیض آپ ﷺ کے قلب سے شیخ کے قلب پر اور وہاں سے سالک کے لطیفہ اخفیٰ پر آتا ہے۔

غور طلب

چونکہ قلب قرآن و حدیث دونوں سے ثابت ہے اور باقی لطائف کشفی ہیں۔ آپ ﷺ کی طرف ایسی بات منسوب کرنا جو ظنی ہو سے بچنے کے لیے اگر ہم ہر مراقبہ میں یہ کہیں کہ فیض آپ ﷺ کے قلب پر آتا ہے تو اس میں زیادہ حفاظت نظر آتی ہے کیونکہ پہلے کہا گیا کہ ان ظنیات کے لیے دلیل کی ضرورت ہو گی۔

ان مراقبات سے حاصل یہ ہونا چاہیے کہ ہم "اللہ تعالیٰ کے اخلاق" اور "سنت رسول کی پیروی" سے متصف ہو جائیں۔ اللہ نصیب فرمائے۔ آمین

یہ سالکین کے مشارب(یعنی جہاں سے فیضِ خاص حاصل ہوتا ہو) ہیں اس لئے جس کی جس لطیفے کے ساتھ زیادہ مناسبت ہوگی وہ اس کے ذریعے زیادہ حاصل کرے گا۔

2.1.2.2.1.3.7... مراقبہ معیت

اس میں موردِ فیض "لطیفۂ قلب" ہے اور فیض آتا ہے اس ذات سے جو میرے ساتھ ہے اور کائنات کے ہر ذرہ کے ساتھ ہے جیسا کہ اس کی شان کے مطابق ہے۔

چونکہ بقول حضرت مجدد الف ثانیؒ معیتِ الٰہی متشابہات میں سے ہے اس لئے اس کی صحیح کیفیت کو اللہ تعالیٰ خود ہی جانتے ہیں۔ اس لئے مندرجہ بالا محتاط الفاظ کو حال کے درجے میں لانا ضروری ہے۔

2.1.2.2.1.3.8... مراقبہ حقیقتِ کعبہ

کعبہ مسجودِ حقیقی نہیں بلکہ مسجودِ مجازی ہے جیسا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم تھا تمام ملائکہ کو بشمول ابلیس، لیکن ابلیس نے سجدہ نہیں کیا تو مردود ہوا، تو کعبہ کی طرف سجدہ کرنے کا حکم ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی ایک خاص تجلی ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی کی شان لئے ہوئے ہوتی ہے، اس تجلی کی طرف سجدہ کرنے کا حکم ہے۔ اس مراقبہ میں موردِ فیض "قلب" ہے اور فیض مسجودِ حقیقی ذات سے اس تجلی کے ذریعے جو کعبہ کی طرف آرہی ہے سے آپ ﷺ کے قلب پر آرہا ہے اور وہاں سے شیخ کے قلب پر اور وہاں سے سالک کے ہیئتِ وحدانی (پورا جسم) پر آتا ہے۔

2.1.2.2.1.3.9... مراقبہ حقیقتِ قرآن

اس میں موردِ فیض، ہیئتِ وحدانی ہے۔ اس ذات سے جس کا علم لازوال، اصلی اور لامتناہی ہے، جس کا کلام اسی کی شان کے لائق ہے، اس ذات کے کلام، قرآن سے آپ ﷺ کے قلب پر آرہا ہے اور وہاں سے شیخ کے قلب پر اور

وہاں سے فیض سالک کے ہیئتِ وحدانی پر آتا ہے۔

اس مراقبہ سے قرآن کی حقیقت سالک پر کھلتی ہے۔ اس کے بعد عالمِ قرآن نہ صرف اس کے علم سے استفادہ کرتا ہے بلکہ اس کے نور سے بھی مستفید ہوتا ہے۔

2.1.2.2.1.3.10... مراقبہ حقیقتِ صلوٰۃ

نماز عبدیت کی ایک مخصوص صورت ہے۔"أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنّهٗ يَرَاكَ" (البخاري) کی عملی تشریح اس میں سب سے زیادہ آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہے۔ اس سے پہلے مراقبہ عبدیت بہتر رہے گا۔

2.1.2.2.1.3.11... مراقبہ عبدیت

یہ محسوس کرنا کہ میرا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ میں ہے۔

مراقبہ حقیقتِ صلوٰۃ میں مراقبہ عبدیت کا استعمال یوں ہوگا کہ یہ محسوس کیا جائے کہ نماز میں میرا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہے۔

2.1.2.2.1.3.12... مراقبہ احسان

اپنے آپ کا اللہ تعالیٰ کی ذات کے سامنے پانے کو محسوس کرنا۔

اس کے دو جزو ہیں۔ ایک میں اللہ تعالیٰ کی موجودگی کو اتنا محسوس کرنا گویا کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہو۔ اگر ایسا کوئی نہ کرسکے تو خود کو ایسا یقین کرانا کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہے ہیں۔ اس کا سلبِ سلب طریقہ زیادہ آسان ہے اور وہ یہ کہ خود محسوس کرے کہ کیا میں یا میری کوئی چیز خدا سے پوشیدہ ہوسکتی ہے؟ جواب نہیں میں ہوگا یہی اس کا اثبات ہے۔ اس کو پختہ کرنا ہے۔ اس کے علاوہ اور مراقبات بھی ہوسکتے ہیں۔ مثلاً

2.1.2.2.1.3.13... مراقبہ حبِ الٰہی

اس میں موردِ فیض لطیفۂ قلب ہے اور فیض آرہا ہے محبوبِ حقیقی کی طرف

سے آپ ﷺ کے قلب پر اور وہاں سے شیخ کے قلب پر اور وہاں سے سالک کے قلب پر، جس سے دل میں اللہ کی محبت مسلسل بڑھ رہی ہے اور ساتھ ہی برداشت کی قوت بھی عطا ہو رہی ہے۔

2.1.2.2.1.3.14... مراقبہ حب فی اللہ

اس میں موردِ فیض لطیفۂ قلب ہے اور فیض آتا ہے اس ذات سے جو محبوبِ حقیقی ہے آپ ﷺ کے قلب پر اور وہاں سے شیخ کے قلب پر اور وہاں سے سالک کے قلب پر جس سے دل میں اللہ والوں کی محبت مسلسل بڑھ رہی ہے اور ساتھ ہی برداشت کی قوت بھی عطا ہو رہی ہے۔

2.1.2.2.1.3.15... مراقبہ نور

جس میں یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ میں نور کے لامتناہی دریا میں کھڑا ہوں اور آہستہ آہستہ اس میں غرق ہو رہا ہوں۔

2.1.2.2.1.3.16... مراقبہ دعائیہ

اس میں سالک اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے محسوس کر کے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے۔

2.1.2.2.1.3.17... مراقبہ رویت

خدا کی رویت کا تصور کرے "أَلَمْ يَعْلَمْ بِأَنَّ اللهَ يَرٰى" کیا نہیں جانا کہ اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے۔ (العلق:14) اس پر غور کرے اور اس پر باقاعدگی کرے اور یہاں تک مشغول ہو کہ یہ مراقبہ پکا ہو جائے۔ مراقبہ معیت "هُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ" تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔ (الحدید:4) اس کے معنی کے ساتھ تصور اور یقین کرے کہ خلوت اور جلوت، بیماری اور تندرستی ہر حالت میں اللہ میرے ساتھ ہے۔ اسی خیال میں ڈوب جائے۔

2.1.2.2.1.3.18... مراقبہ اقربیت

"وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ" اور ہم انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ (ق:16) اس آیت پر معنی کے ساتھ غور کرے اور اس خیال میں محو ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے قریب ہے۔

2.1.2.2.1.3.19... مراقبہ وحدت

"هُوَ الْأَوَّلُ وَالْاٰخِرُ" (اس کا وجود ہر جگہ جلوہ فرما ابتداء اور انتہا میں وہی ہے) اس کو زبان سے کہے اور تصور کرے کہ اس کے سوا کوئی نہیں ہے اسی خیال میں مستغرق ہو جائے۔

2.1.2.2.1.3.20... مراقبہ فناء

"كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ" دنیا کی تمام چیزیں فانی ہیں اور اللہ بزرگ و برتر باقی رہے گا۔ (الرحمٰن:27-26) اس کے معنی کا تصور کرے کہ تمام چیزیں فناء ہو جائیں گی اور ذات باری ہی ہمیشہ رہے گی اور دل کی آنکھ سے دیکھے اور اس خیال میں محو ہو جائے تاکہ اس کے معنی خوب منکشف ہو جائیں اور اپنے وجود کو فنا اور علم و عقل کو اضمحلال ہو۔

ہو فنا ذات میں کہ تو نہ رہے — تری ہستی کا رنگ و بو نہ رہے
علم حق علم صوفی میں گم ہے — عام لوگوں کے سامنے مبہم ہے
ان میں گم ہو کہ ہے توحید یہی — اس کو بھی بھول جا، ہے تفرید یہی
گفت اس کا ہے مگر گفتِ خدا — ہے بظاہر بر لبِ عبداللہ

ترجمہ: خدا کا علم عارف صوفی کے علم میں مستور اور در پردہ ہوتا ہے اگرچہ عام لوگوں کو یہ بات مشکل سے معلوم ہوتی ہے۔ تو ان میں گم ہو جا کہ توحید یہی

ہے اور اپنے گم کرنے کو بھی گم کر کہ تفرید یہی ہے۔ ولی کی گفتار خدا کی گفتار ہوتی ہے اگرچہ بظاہر بندۂ خدا کے حلقوم سے ہی نکلتی ہے۔

2.1.2.2.1.3.21... صفاتِ باری تعالیٰ کے مراقبات

یہ سب حسبِ ضرورت کرائے جاسکتے ہیں اگر کسی کے لیے مفید ہوں۔

انوارات اور ان کی علامات

جب ذاکر باہتمام تقویٰ خدا کا ذکر کرنے لگتا ہے اور ذکر تمام اعضاء میں سرایت کر جاتا ہے اور غیر خدا سے دل پاک و صاف ہو جاتا ہے اور روحانیت سے تعلق خاص پیدا ہو جاتا ہے تو انوارِ الٰہی کا ظہور ہونے لگتا ہے اور وہ انوار کبھی خود اپنے میں دکھائی دینے لگتے ہیں اور کبھی اپنے سے باہر۔ اچھے انوار وہی ہیں جن کو سالک دل سینہ و سر یا دونوں طرف اور کبھی تمام بدن میں پائے یا کبھی دائیں بائیں ، کبھی سامنے سر کے پاس ظاہر ہوں وہ بھی اچھے ہیں لیکن ان کی طرف توجہ نہ کرنا چاہیئے کہ کہیں لطف اندوز و متلذذ ہو کر خسارہ اٹھائے۔ تفصیل یہ کہ

(1) اگر کسی رنگ کا نور داہنے شانے کے برابر ظاہر ہو تو وہ فرشتوں کا نور ہے۔ اگر سفید رنگ کا نور ہے تو کراماً کاتبین کا ہے۔ اگر سبز پوش خوبصورت آدمی یا کوئی اچھی صورت ظاہر ہو تو وہ فرشتہ ہے جو ذاکر کی حفاظت کے لئے آیا ہے۔

(2) اگر داہنے شانے سے کچھ ہٹا ہو یا آنکھ کے برابر ہے تو مرشد کا نور ہے۔ اور سامنے ہے تو وہ نورِ محمدی ہے جو راہ مستقیم کی تعلیم فرماتا ہے۔

(3) اگر بائیں شانے کے متصل ظاہر ہو تو کاتب فرشتوں کا سینہ ہے۔ اگر بائیں شانے سے دور ظاہر ہو خواہ کسی رنگ کا ہو شیطان کا نور ہے یا دنیا کا نور ہے۔

(4) اگر پیچھے یا بائیں طرف آواز ہو یا صورت ہو وہ شیطان کا دھوکہ ہے "لَا

حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمْ" پڑھنا چاہئے۔ أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ پڑھے توجہ نہ کرے۔

(5) اگر نور اوپر سے یا پیچھے سے آئے تو وہ نور ان فرشتوں کا ہے جو حفاظت کے لئے مقرر ہیں۔

(6) اگر کسی خاص سمت کے ادراک کے بغیر نور ظاہر ہو اور دل میں خوف پیدا کرے اور اس کے رفع ہو جانے کے بعد دل کا اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان نہ رہے تو وہ نور شیطان کا ہے۔ "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمْ" پڑھنا چاہیے۔

(7) اگر بغیر کسی خاص سمت کے نور ظاہر ہو اور اس کے زوال کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف دل کے دھیان کی لذت نہ جائے اور اشتیاق و طلب اسی طرح غالب رہے تو وہی مطلوب نور ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عطا فرمائے (آمین)

(8) اگر دھویں یا آگ کے رنگ کا نور سینہ یا ناف کے اوپر ظاہر ہو تو وہ خناس کا نور ہے۔ "أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْم" پڑھنا چاہئے۔

(9) اگر سینہ کے اندر یا دل پر ظاہر ہو تو وہ صفائی قلب کا نور ہے۔

(10) اگر سرخ یا سفید زردی مائل نور دل سے ظاہر ہو تو دل کا نور ہے۔ اگر خالص سفید ہے تو روح کا نور ہے جس نے طالب کے دل میں تجلی کر کے اپنی ہستی کو ظاہر کیا ہے۔ اگر سر کی جانب سے ہے تو وہ بھی روح کا نور ہے۔

(11) اگر آفتاب کے رنگ کا نور ہے اور سامنے سے ہے تو وہ بھی روح کا نور ہے۔

(12) اگر اوپر سے آفتاب کے رنگ کا نور ہے تو نورِ ذات ہے۔ اگر چاند جیسا نور ہے تو دل کا ہے۔

(13) اگر چاند جیسا نور ہے اور سامنے سے ہے تو نورِ محمدی ﷺ ہے۔

(14) اگر کاجل کی سیاہی کی طرح تاریک اور اس کے گرد باریک اور مکدّر نورانی خطوط ہیں تو وہ نور نفی کا ہے۔ اس طرف توجہ سے نفی حاصل ہوگی اور ماسویٰ اللہ سے قلب کا صاف ہونا اور تجلی افعالی اور تجلی صفاتی میں محویت اور فناء کا حصول ہے جو مقصدِ اصلی ہے۔

(15) اگر آنکھ کی سیاہی کے مانند بلا گرداگرد باریک مکدر نورانی خطوط کے ہے تو وہ نور تجلی ذاتی کا نور ہے اس میں عارف کا فناء الفناء ہے اور بقاء کا حصول ہے۔

پہلے کہا جا چکا ہے اب پھر تاکید کی جاتی ہے کہ سالک کو چاہئے کہ انوار میں سوائے مطلوب کے کسی طرف نہ متوجہ ہو اور سرور و لطف حاصل نہ کرے بلکہ صرف نورِ الٰہی میں ترقی کرے کیونکہ خدا کی تجلی کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

آج کل کے حالات کے مطابق اصلاح کی کوشش کا ایک نظام

چاروں سلسلوں کے اشتراک سے یہ نظام ہمارے سلسلے میں الحمدللہ بہت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔مشائخ کی خدمت میں ایک تجربے کے طور پر اس کو یہاں تحریر کیا جاتا ہے تاکہ اگرکسی کو مناسب محسوس ہو تو اس کو تعلیم میں شامل کرسکے۔

دو صورتیں اس کی ممکن ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ سادہ ذکر اور صحبت سے سالکین کو پہلے شریعت پہ چلنے پر آمادہ کیا جائے اور ان کو فرضِ عین علم سکھا کر شریعت پر اچھی طرح چلایا جائے۔ اس سے شرعی مجاہدہ کی موجودگی میں علاجی مجاہدہ کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس کے بعد مراقبات کے ذریعے ان کے دل کی اصلاح کر کے ان کے اعمال میں جان پیدا کی جائے۔ اس سے ان کی تکمیل ہو جائے گی۔ یہ گویا کہ تصوف کی ابتدائی صورت کو آج کل کے دور میں حاصل کر کے اسی طرز پر تکمیل کی کوشش ہوگی اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پہلے مراقبات کے ذریعے ان کے قلب کا اتنا تزکیہ کرایا جائے کہ وہ شریعت پر چلنے کے لئے تیار ہو

جائیں اور آخر میں سلوک طے کرایا جائے جس سے ان کی تکمیل ہو۔ مؤخرالذکر طریقہ حضرت خواجہ نقشبندؒ نے دریافت کیا تھا کیونکہ اس وقت لوگ شریعت پر نہیں چل رہے تھے کیونکہ قلب کا تزکیہ اگر ہو چکا ہو تو ایک طرف اگر ان مقامات کا ادراک آسان ہو جاتا ہے تو دوسری طرف نفس تزکیہ کیلئے آسانی کے ساتھ آمادہ ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں نفس کے تزکیہ سے اعراض اگر ایک طرف اپنی محنت پر پانی پھیرنا ہے تو دوسری طرف نفس کی خواہشات سے اثر لے کر گمراہ ہوسکتا ہے اور اس کی گمراہی کے لئے میدان زیادہ تیار ہوتا ہے کیونکہ نفس کی سرکشی اس کے قلب کی صفائی نہ صرف کسی اور رنگ میں دکھا سکتی ہے بلکہ کچھ ہی عرصے میں سرکش نفس قلب کو نفسانی خواہشات سے پھر آلودہ کرسکتا ہے۔

پہلی صورت میں یہ بتایا گیا کہ فرضِ عین علم سکھا کر شریعت پر اچھی طرح چلایا جائے تب ان کے لئے صرف دل کی اصلاح کافی ہوگی یعنی نفس کا اتنا تزکیہ ہو چکا ہو کہ شریعت پر عمل کرنے کو تیار ہو۔ پہلے دور میں اگر ایسا نہیں ہوتا تھا تو ان سے اسی وقت مجاہدہ کروا کر نفس کی سرکشی کو ختم کرایا جاتا تھا جیسا کہ شاہ ابوسعیدؒ کا واقعہ تفصیل سے کتابوں میں موجود ہے کیونکہ بعض اوقات سالکین عبادات کی حد تک تو شریعت پر چلتے ہیں معاملات میں نہیں، بعض ان دونوں میں لیکن معاشرت میں نہیں اور بعض ان تینوں میں لیکن اخلاق میں نہیں۔ الغرض ان چاروں میں سے جس میں بھی کمی کسی بھی وجہ سے پائی جائے اور محض سادہ ذکر اور صحبت سے اس کی اصلاح ممکن نہ ہوسکے تو اس کا علاج مجاہدہ ہے۔ اب مجاہدہ چاہے پہلے کرایا جائے چاہے بعد میں لیکن نفس کو اطاعت پر لانے کے لئے اس کی ضرورت ہوگی۔

اس دور میں ایک طرف ذہنی انتشار ہے تو دوسری طرف نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے سامان بہت عام ہیں۔ اس پر مزید یہ کہ علمائے سوء کی وجہ سے عوام سے اصلی علم اوجھل ہوگیا ہے جس سے جاہل لوگ علماء کو جاہل کہنے لگے ہیں۔ ان حالات میں عوام میں صحیح چیز کی طلب کا پیدا کرنا بھی بہت بڑا کام

ہے۔ اس کے بعد جن میں طلب پیدا ہو ان کی اصلاح کرنا ممکن ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد جیسا کہ کہا گیا کہ نفس کو اطاعت پر لانے کے لئے مجاہدہ کی ضرورت ہو گی چاہے وہ دل کی اصلاح سے پہلے ہو یا بعد میں۔

آج کل کے دور میں مجاہدہ بھی ضروری ہے لیکن دل کی اصلاح میں بھی زیادہ دیر نہیں کی جاسکتی کیونکہ اس صورت میں بعض چیزوں کی اصلاح کے لئے جس مجاہدے کی ضرورت ہے اگر وہ سالک کے دل پر نہ کھلی ہوں تو وہ اس کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اس لئے آج کل کے دور کے لئے مجاہدے کو دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑے گا، یعنی دل کی اصلاح سے قبل اور دل کی اصلاح کے بعد۔ دوسرے لفظوں میں سلوک کا ایک حصہ جذب سے پہلے اور دوسرا حصہ جذب کے بعد۔ جو جذب سے پہلے والا سلوک ہے وہ جذب کے لئے تیاری ہے اور جذب سے بعد والا حصہ جذب کو کنٹرول کرنے کے لئے ہے۔ پہلے والا حصہ عروج کے لئے ہے اور دوسرا نزول کے لئے ہے۔ موجودہ تبلیغی جماعت میں بیانات اور حرکت کے ذریعے پہلا حصہ طے ہو جاتا ہے اور قربانی کے بقدر جذب بھی حاصل ہو جاتا ہے لیکن ان کے جذب کا ایک خاص رنگ ہے۔ اس کو مطلوبہ رنگ دینے کے لئے مراقبات کی ضرورت ہو گی تب ان کو نزول والا سلوک طے کرایا جا سکے گا بصورت دیگر، عدم تکمیل میں ہی تکمیل محسوس کر رہے ہوں گے۔ خانقاہوں والے حضرات بھی پہلے سلوک، ذکر، صحبت اور مناسب مجاہدات کے ذریعے سلوک طے کر کے مراقبات کے ذریعے جذب حاصل کرسکتے ہیں اور اس کے بعد نزول والا سلوک طے کر کے تکمیل تک پہنچ سکتے ہیں۔ آگے تفصیلات ہیں جس کا یہ موقع نہیں۔

ہمارے ہاں یہ تجربہ بہت کامیاب رہا ہے کہ پہلے ہم بارہ تسبیح تک بتدریج بڑھاتے ہیں جس کے ساتھ ایک تسبیح اسمِ ذات کی بھی شامل ہے۔ پھر اسمِ ذات مناسب تعداد تک بڑھایا جاتا ہے جس کو پھر ذکر خفی سے بدل دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر لطائف کا دور شروع کرواتے ہیں اور سلطان الاذکار سے ہوتے ہوئے

مزید مراقبات تک ان کو بڑھا دیتے ہیں۔ اس ترتیب سے مراقبات با آسانی شروع ہو جاتے ہیں۔ آگے پھر نقشبندی طریقے سے سلوک پورا کرواتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذکرِ جہری سے یکسوئی حاصل ہوتی ہے۔ آدمی باہر کے شور سے منقطع ہو جاتا ہے اور اتنے خیالات بھی نہیں آتے جس سے یکسوئی جلدی حاصل ہو جاتی ہے۔

یہ کوئی نئی بات بھی نہیں نقشبندی سلسلے کا قادری سلسلے کے ساتھ ایک خوبصورت جوڑ سلسلہ راشدیہ کی صورت میں پہلے سے موجود رہا ہے۔ اس میں لطائف پر جہر کے ساتھ ذکر (اللہ ھو) کرایا جاتا ہے۔ پھر چونکہ قادری اور چشتی سلوک بالخصوص چشتی نظامی سلوک میں برائے نام ہی فرق ہے، اسلئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ تین سلسلوں کا مجموعہ ہوگیا۔ بنوریہ طریقہ بھی نقشبندی طریقہ ہی ہے جس میں لطائف کی تفصیل مجددیہ معصومیہ سے مختلف ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ حالات بدل جاتے ہیں۔ اس لئے اصلاح کے طریقوں میں بھی اجتہادی تبدیلیاں کرنی پڑتی ہیں تو جیسا کہ اوپر بتایا گیا کہ لطائف کا اجراء ذہنی انتشار کی وجہ سے آج کل براہِ راست ہونا مشکل ہوگیا ہے اس لئے اگر چشتیہ طریقے سے، راشدیہ طریقے سے یا آج کل ایک طریقہ ہمارے ہاں جو شروع ہو چکا ہے اس کے ذریعے سے جہری ذکر سے ابتدا کی جائے اور پھر اسمِ ذات کے ذریعے لطائف کا اجراء کیا جائے تو یہ ایک آسان عملی صورت ہے۔

ابتدائی سلوک

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے سلوک کے دس مقامات یعنی توبہ، انابت، زہد، ریاضت، تقویٰ، قناعت، توکل، تسلیم، صبر اور رضا کو تفصیلی طے کرنے کا فرمایا ہے۔ ان میں توبہ اور انابت کے ابتدائی اسباق دیئے جائیں گے جن کے ساتھ متعلقہ مجاہدات بھی ہوں گے مثلاً صلوٰۃ توبہ روزانہ پڑھنے کو کہا جائے گا، جو بھی غلطی ہوئی ہو اس کی تلافی کے لئے اس کے بقدر نیک عمل کرنے کو کہا جائے گا۔

نصف جیب خرچ پر گزارہ کرنے کی تعلیم دی جائے گی، تہجد شروع کرائی جائے گی۔ دوسروں کی سخت باتوں کو برداشت کرنے کا بتایا جائے گا۔ مسجد یا خانقاہ میں جھاڑو دینے کو کہا جائے گا۔ آخر میں ان کو اور باقی آٹھ کو تفصیلی طور پر طے کرایا جائے گا۔

ذکر کا مجوزہ طریقہ

پہلے لسانی ذکر ایک چلے کے لئے کرایا جائے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ تین سو دفعہ کلمہ سوم کا پہلا حصہ یعنی "سبحان اللّٰہِ والحمد لِلّٰہِ وَ لا الہ الا اللہ واللہ اکبر" اور دو سو دفعہ دوسرا حصہ یعنی "لاحول ولا قوۃ الاباللّٰہِ العلیِّ العظیم" پڑھایا جاتا ہے۔ ساتھ ہر نماز کے بعد تسبیحاتِ فاطمی بتایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ تین دفعہ کلمہ طیبہ، تین دفعہ درود ابراھیمی، تین دفعہ استغفار اور ایک دفعہ آیت الکرسی۔ ساتھ ذکر جہری کرایا جائے گا جیساکہ اوپر بتایا گیا۔ بعد میں اسمِ ذات کا ذکر بتدریج بڑھایا جائے گا۔ پھر ان سے لطائف کا اجراء کیا جائے گا۔ ہمارے ہاں پہلے چشتیہ صابریہ کی بارہ تسبیح کا ذکر کرایا جاتا تھا۔ اب چاروں سلسلوں کا مجموعہ بارہ تسبیح کرایا جاتا ہے جس میں "لا الہ الااللہ"، "لا الہ الا ھُو"، "حق" اور "اللہ" کی ایک ایک تسبیح سے شروع کرایا جاتا ہے۔ اگلے مہینے یہ دو تسبیح، دو تسبیح، دو تسبیح اور ایک تسبیح، اس سے اگلے مہینے دو، تین، تین اور ایک تسبیح، اس سے اگلے مہینے، دو، چار، چار اور ایک تسبیح، اس سے اگلے مہینے دو، چار، چھ اور ایک تسبیح، اس سے اگلے مہینے دو، چار، چھ اور تین تسبیح، اس سے اگلے مہینے دو، چار، چھ اور پانچ تسبیح۔ اس کے بعد دو، چار، چھ تسبیح ذکرِ جہر تو رہیں گے البتہ پانچ تسبیح کی جگہ اسمِ ذات قلبی تعلیم کیا جائے گا۔ جب یہ شروع ہو جائے تو اس کے بعد اس کے ذریعے سے تمام لطائف کا اجراء کرایا جائے گا ان شاء اللہ۔

نوٹ۔ یہ خط کشیدہ حصہ نمونے کے طور پر دیا گیا ہے کیونکہ یہ ہمارے ہاں چل رہا ہے لیکن باقی مشائخ اس کے پابند نہیں وہ اس تمام بیان میں غور کر کے جو ان کا شرح صدر ہو اس کے مطابق سالکین کو تعلیم کریں۔

خواتین کیلئے ایک علیحدہ کتاب سلوک النساء شائع ہو چکی ہے ان کے لئے اس
کا مطالعہ مفید رہے گا۔

2.1.2.2.2... وہ فاعلات جن میں خطرہ ہے

2.1.2.2.2.1... تصورِ شیخ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں گویا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہا ہوں کہ ایک نبی کی انبیاء میں حکایت بیان فرماتے ہیں جن کو ان کی قوم نے مارا تھا اور خون آلودہ کر دیا تھا اور وہ اپنے چہرے سے خون پونچھتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ اے اللہ میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ جانتے نہیں۔ اس حدیث شریف سے یہ ثابت ہوا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مثلِ حاضر تھے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت سامنے نہیں تھے اور یہ غایت محبت کی وجہ سے ہے۔

شیخ کی مجلس اور صحبت میں بیٹھنے کا جو اثر ہوتا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں البتہ شیخ کی غیر موجودگی میں اس نعمت کو کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے تو اس کے لئے ایک بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تصور کی ایک طاقت دی ہے جس سے وہ اپنے آپ پر وہ کیفیت قدرے طاری کرسکتا ہے جو فی الحقیقت وہاں موجودگی میں حاصل ہوتی جس کی طرف اشارہ اس حدیث شریف سے بھی ہوسکتا ہے "أَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ"۔(البخاري) یعنی دیکھنے کی حالت میں جس کیفیت میں عبادت ہوتی ہے ایسی عبادت کرو اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کبھی ایسا حکم نہیں دیتے جو ممکن نہ ہو جیسا کہ فرماتے ہیں "لاَ يُكَلِّفُ اللهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا" اللہ کسی کو اس کی طاقت کے سوا تکلیف نہیں دیتا۔ (البقرة:286) پس ایسا کرنا ممکن ہے تبھی ایسا کہلوایا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات منجانب اللہ وحی سے ہوتی ہے۔ تو اپنے آپ کو شیخ کی غیر موجودگی میں تصور کے ذریعے صحبت میں بیٹھے تصور کرنا تصورِ شیخ کہلاتا ہے۔ اس کی بے انتہا برکات ہیں۔

ہم تصور میں شیخ کو دیکھیں اور شیخ کے فیض سے ملے ہم کو خدا
شرک کیسے یہ تصور ہے کہ اس سے کیا ہوتے ہیں خدا سے جدا

یہ تو اک پل ہے جس پہ ہم گزر کے آگے پا جائیں منزل مقصود
شیخ کا کام ہے ملانا اس سے فرض اپنا کرتے ہیں وہ اس سے ادا

ہاں مگر جس میں احتیاط نہیں، نہیں جائز اسے تصور یہ
ممکن ہے اس کے منہ سے نکلے کبھی غیب میں بصیغۂ حاضر کچھ ندا

اس لئے اپنے بزرگ دیتے نہیں یہ تصور عوام کو آج کل
کسی ناسمجھ کے کلام سے نہ ہو کوئی لفظ شرک کا کبھی ہویدا

ہاں مگر خودبخود کسی کو ملے اس کو روکتے بھی نہیں اس سے کہ
اپنی نعمت کی لاج رکھتے ہیں وہ شبیر اس کی یہ عادت ہے سدا

اصل تصور تو اللہ تعالیٰ کا ہے لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات نظر نہیں آسکتی اس لئے اس کا تصور آسانی سے جمتا نہیں اس لئے وساوس آتے ہیں۔ ان وساوس کو دفع کرنے کے لئے کیونکہ شیخ محبوب ہوتا ہے اور اس کا تصور باقی تمام خیالات کو دفع کرسکتا ہے اس لئے بعض حضرات کے ہاں تصورِ شیخ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن چونکہ بعد میں طبائع میں فساد آگیا اس لئے متاخرین مشائخ نے اس کے مفاسد پر نظر کرتے ہوئے اس کو چھوڑ دیا۔

جن حضرات کے ہاں یہ تعلیم تھی تو وہ بھی اس کو مقاصد میں نہیں سمجھتے تھے بلکہ ایک ذریعہ کے طور پر سمجھتے تھے کہ اس سے یکسوئی حاصل ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے تصور تک رسائی حاصل ہو۔ پس جب مقصود حاصل ہو جاتا تو اس کو چھوڑ دیا جاتا۔ اس کی مثال مکان میں جھاڑو دینے کی طرح ہے کہ بجائے ایک

ایک تنکا کو جمع کرنے کے سب کو جھاڑو سے جمع کر کے اس کو جلا دیا۔ پس تمام محبتوں کو تو شیخ کی محبت سے ختم کیا اور شیخ کی محبت کو اللہ تعالیٰ کی محبت میں فنا کیا تو مقصود تک جلد رسائی ہوئی۔

اس دور کے مجدد حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ شغل خواص کے لئے تو مفید ہے لیکن عوام کے لئے سخت مضر کیونکہ اس میں صورت پرستی تک بات جا سکتی ہے جو کہ شرک کا زینہ ہے۔ کثرتِ تصور سے بعض اوقات کوئی صورتِ مثالیہ ظاہر ہوسکتی ہے جو بعض اوقات محض خیال ہوتا ہے اور بعض دفعہ کوئی لطیفہء غیبی اس شکل میں متمثل ہو جاتا ہے جس کا بسا اوقات شیخ کو پتا بھی نہیں ہوتا لیکن سالک اس کو حاضر ناظر سمجھ کر اپنا نقصان کرسکتا ہے۔ اس لئے اس سے بچنا اولیٰ ہے۔ اس کے مقاصد کو حاصل کرنے کا اچھا طریقہ یہ ہے کہ شیخ کے لئے دعا کریں، اس کی محبت اللہ تعالیٰ سے مانگیں، شیخ کے ملفوظات اور کتابیں پڑھے یا پھر اپنے پیر بھائیوں سے اس کا تذکرہ وغیرہ کرے۔ ان میں چونکہ یہ مفاسد نہیں اس لئے ان کا کوئی حرج نہیں اور فائدے میں کوئی کمی بھی نہیں ہوتی۔

2.1.2.2.2.2... عشقِ مجازی

مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

متاب از عشق رد گرچہ مجازیست — کہ آں بہرحقیقت کارسازیست

یعنی عشق سے اعراض نہ کرو چاہے مجازی ہی کیوں نہ ہو کیونکہ وہ عشقِ حقیقی کے لئے سبب ہے۔ اس طرح مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

عاشقی گر زیں سرو گرزاں سرست — عاقبت مارا بداں شہ رہبرست

عشق اگر اس شے کا ہو یا اس شے کا آخر ہمارے لئے محبوبِ حقیقی کے لئے رہبر ہے۔ یہ اور اس طرح کے بزرگوں کے واقعات کے بارے میں بعض

لوگ بتاتے رہتے ہیں جس سے بعض لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان اصل بات کو چھپا دیتا ہے اور اس کا غلط مطلب دل میں بٹھا دیتا ہے حالانکہ تھوڑا سا غور کیا جائے تو بات بالکل صاف ہے، یہ اشعار جن بزرگوں کی طرف منسوب ہیں تو کیا ان کے صرف یہی اشعار ہیں یا ان کے اور اشعار بھی ہیں۔ اگر ان اشعار میں ایسے مضامین ہیں جو کہ ان لوگوں کے غلط خیالات کا توڑ کرتے ہیں تو ان کے ان اشعار کو کیوں نہیں لیا جاتا مثلاً حضرت مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر

دلے باید کہ در صورت نمانی   و زیں پل زود کود را بگزرانی

یعنی یہ ضرور ہے کہ کہیں تو صورت ہی میں نہ رہ جائے کیونکہ یہ پل کی طرح ہے اور اس پل سے جلدی گزرنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عشقِ مجازی مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تو ایک پل کی طرح ہے اور اس سے جلدی نکلنا چاہیے ورنہ عشقِ حقیقی سے محروم ہو جائے گا۔ اور حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

عشق با مردہ نباشد پائدار   عشق را باحی و باقیوم دار

یعنی فانی شے کے ساتھ عشق نہیں کرنا چاہیے کیونکہ وہ تو فانی ہے عشق تو حیّ و قیوم ذات کے ساتھ کرنا چاہیے کیونکہ وہ باقی ہے۔ اب ان دو بزرگوں اور دوسرے بزرگوں کے اقوال کی تطبیق (مطابقت کی کوشش) کیسے ہوگی تو وہ کوئی مشکل نہیں بالکل آسان ہے۔ ان بزرگوں کا عشقِ مجازی کی تائید سے صرف اتنا مراد ہے کہ اگر خدانخواستہ کسی کو عشقِ مجازی ہو جائے تو پھر اس سے کام لینا چاہیے تاکہ اسی کو ہی عشقِ حقیقی کا ذریعہ بنایا جائے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس مردار کے ساتھ تو بالکل تعلق نہ رکھا جائے بلکہ ہوسکے تو تعلق توڑ دیا جائے اور اس سے جو سوز و گداز پیدا ہو، اس کو عشقِ حقیقی کے لئے استعمال کیا جائے۔ سب سے بہتر طریقہ تو اس میں یہ ہے کہ اگر شیخ کامل ہو تو اس کی رہنمائی حاصل کی

جائے۔ ورنہ وضو کر کے خوشبو لگا کر خوب دل کے ساتھ 500 سے ایک ہزار تک ذکر نفی اثبات اس طرح کرے کہ "لا اِلٰہَ" کے ساتھ سوچے کہ میں نے اس مردار کی محبت کو دل سے نکال دیا اور " اِلا اللہ" کے ساتھ یہ تصور کرے کہ اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کو داخل کیا۔ اس میں ضرب بھی ہو۔ اور کچھ دیر یہ مراقبہ کرے کہ ایک بارُعب اور محبوب ہستی میرے دل سے اس مردار کی محبت کھرچ کھرچ کر نکال پھینک رہی ہے اور اس مردار کے ساتھ جو طبعی تبدیلیاں بڑھاپے اور بیماریوں کی صورت میں آسکتی ہیں ان کا تصور کرے کہ اس کی شکل بہت گندی ہوگئی ہے اور مجھے اس سے نفرت ہے۔ اس میں کام کرنے پر توجہ کی جائے اور نتیجے میں جلدی نہ کریں۔ ذہنی طور پر اس کے لئے تیار رہے کہ چاہے ساری عمر یہ کرنا پڑے تو یہ کروں گا۔ اس میں اگر جان بھی چلی جائے تو اعلیٰ درجہ کی شہادت ہے۔ ان دنوں کوئی حدیث کی کتاب یا کوئی بھی کتاب جس میں دوزخ اور عذابِ الٰہی جو نافرمانوں کو ہوگا کا ذکر ہو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

2.1.2.2.2.3... سماع

غزوہ خندق یا احزاب میں جب آپ ﷺ خندق کھود رہے تھے تو انصار اور مہاجرین کا دل بڑھانے کے لئے یہ اشعار پڑھے۔ (رواه البخاري)

اللّٰھُمّ لاَ عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الآخِرَۃِ فاغفر للأنصار و المهاجرة

صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کا جواب دیا۔

نحن الذين بايعوا محمدًا على الجهاد ما بقينا أبدًا

بعض اہل طریق کا یہ مذاق رہا ہے کہ جب اسبابِ عارضہ سے طبعیت میں کسل (بوریت) آئے تو اس کو دور کرنے کے لئے خوش آوازی کے ساتھ کسی اچھے کلام کو شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے سن لیتے ہیں۔ سماع کی بس یہی حقیقت ہے۔ جہاں تک اس کے ساتھ مزامیر کا تعلق ہے تو آپ ﷺ کا صریح ارشادِ پاک ہے کہ میں مزامیر کو توڑنے کے لئے مبعوث ہوا ہوں۔ بات یہاں پر

ختم ہونی چاہیے تھی کیونکہ آپ ﷺ کے ارشادِ پاک کے سامنے کسی اور کی بات کی ضرورت ہی نہیں ہے لیکن چونکہ معاملہ یہاں ایسے نادانوں کے ساتھ ہے جن کی متاع ان کے سامنے لوٹی جا رہی ہے اور وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہے ہیں اس لئے چند ایسے بزرگوں کے ارشادات بھی لکھے جاتے ہیں جن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سماع سنتے تھے۔ ان میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا نام زیادہ مشہور ہے۔ آپ ہی کے ملفوظات جو باب نمبر 27 در نظامی میں مذکور ہیں میں یہ ملفوظ بھی ہے۔ فرمایا:

"سماع کی چار قسمیں ہیں، حلال، حرام، مکروہ اور مباح۔ اگر صاحب وجد کا میلان حقیقت کی طرف زیادہ ہے تو مباح، اگر مجاز کی طرف زیادہ ہے تو مکروہ، اگر بالکل حقیقت کی طرف ہے تو حلال اور اگر بالکل مجاز کی طرف ہے تو حرام۔" فرمایا:

"سماع کے واسطے کئی باتیں درکار ہیں جب یہ موجود ہوں تب سنیں۔ مسمع، مستمع مسموع اور آلہ سماع۔ مسع یعنی گانے والا پورا مرد ہو، عورت یا امرد نہ ہو۔ مستمع یعنی سننے والا بھی یادِ حق میں مشغول ہو، مسموع یعنی گانا فحش یا کسی کی ہجو نہ ہو، آلہ سماع (یعنی مزامیر) نہ ہو تب یہ سماع مباح ہے۔"

حضرت کے مریدین میں ایک مرید نے کہا کہ مولانا رکن الدین ایسی مجلس میں شریک ہوئے۔ آپ نے دریافت فرمایا۔ عرض کیا کہ اس مجلس میں بندہ کا کوئی دوست نہیں تھا جو میری تائید کرتا اور گمان یہ تھا کہ اگر منع کرتا تو باز نہ آتے حضرت نے فرمایا -تم منع کرو وہ لوگ باز آئیں تو ٹھیک نہیں تو تم وہاں سے اٹھ کھڑے ہو۔ بعض حضرات نے جن میں قاضی حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر بھی آتا ہے سماع دردِ دل کی دوا کے طور پر سنتے تھے اور اس کو تداوی بالحرام (حرام دوائی کے ذریعے علاج) میں داخل سمجھتے تھے۔ علامہ سنجری رحمۃ اللہ علیہ کے بقول شیخ سیف الدین سماع سنتے تھے لیکن باقاعدہ مجلس مرتب نہ کرتے جب کوئی وقت خوش دیکھتے تو فرماتے کوئی ہے۔ اس وقت جو ہوتا، آتے اور کچھ کہتے۔ ہمارے شیخ

مولانا اشرف صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی کبھی کبھی طبعیت جب اس کے لئے مناسب سمجھتے تو فرماتے کوئی ہے جو کچھ سنائے؟ ایک دفعہ کوئی اور اچھا پڑھنے والا نہیں تھا میں موجود تھا میری آواز تو اچھی نہیں تھی لیکن پشتو کی ادائیگی اچھی تھی اس لئے میں نے رحمٰن بابا کے اشعار کتاب سے سنائے۔

اصل میں ہر چیز کی اپنی حدود ہوتی ہیں۔ آج کل تو بعض ظالموں نے حد کر دی مسجد میں بھی مزامیر کے ساتھ قوالی کرتے ہیں۔ مسجد کا تو ہندو بھی احترام کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ بچائے۔ پیٹ کے دھندے نے انسان کو کس حد تک گرا دیا۔ یہی غالباً وہ وقت ہے کہ اس کی مباح صورتوں پر بھی پابندی لگائی جائے کیونکہ حفظِ حدود کی لوگوں میں صلاحیت نہ رہی۔ جن فقہاء نے اس کی جائز صورتوں کو منع فرمایا تھا ان کی نظر مستقبل پر تھی اور جنہوں نے اس کو مباح سمجھا ان کی نظر حال پر تھی۔ حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سماع مباح تھا لیکن قاضی ضیاالدین سنامی رحمۃ اللہ علیہ اس کو روکتے تھے۔ وجہ یہی تھی۔ آج لوگ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جائز سماع سے استدلال کر کے ناجائز سماع پر ڈٹے ہوئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سماع ایک طاقت ور محرک ہے جو انسان کے اندر کی کیفیت کو باہر بہت قوت کے ساتھ منتقل کرتی ہے۔ اگر اس کو معرفت حاصل ہے تو اس کا عرفان ظاہر ہوگا اور اگر وہ باطن میں خبیث ہے تو اس کا خبث بہت تیزی کے ساتھ ظاہر ہوگا۔ آج کل لوگ خود دیکھیں کہ لوگوں پر کونسی چیز غالب ہے اس لئے سماع کے قریب بھی نہیں جانا چاہیے تاکہ پردہ تو پڑا رہے۔ واللہ اعلم۔

2.2... توابع یعنی احوال(Side effects) کا بیان

طریقت کے بنیادی مقاصد کو حاصل کرنے کے دوران بعض کیفیات غیر اختیاری طور پر حاصل ہوتی ہیں۔ ان کو احوال کہتے ہیں۔ یہ مقصود نہیں ہوتے۔ مقصود مقامات ہیں جو اختیار سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ یہ احوال جیسے خودبخود حاصل ہوتے ہیں۔ اس طرح خودبخود چلے بھی جاتے ہیں یعنی ان کے آنے پر اختیار نہ ان کے باقی رہنے پر اختیار۔ اگر یہ طاعت میں استعمال ہو جائیں تو محمود ہیں اور اگر خدانخواستہ معصیت میں استعمال ہو جائیں تو مذموم۔ ان میں چونکہ بعض احوال میں بڑا مزہ ہوتا ہے اس لئے مبتدی کو ان سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے۔ حقیقت یہ کہ جیسے بچے کو ابتدا میں مٹھائی کھلائی جاتی ہے لیکن جب چل پڑتا ہے تو پھر ایسا نہیں ہوتا اس لئے ابتدا میں طفلانِ طریقت کو بھی شوق و ذوق اور رقت و گریہ کی طرف زیادہ مائل کیا جاتا ہے جس سے وہ چل پڑتے ہیں اس لئے ان کے لئے یہ محمود ہوتے ہیں لیکن جس وقت یہ نہ ہوں تو اس کا غم نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ مقصود نہیں ہوتے۔

ہر عمل کا ایک مبداء (origin) ہوتا ہے جو اس عمل کا محرک ہوتا ہے اور ایک منتہا جو عمل میں مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً اہلِ مصیبت کے ساتھ مدد کرنا مقصود ہے پس اہلِ مصیبت کو دیکھ کر آدمی کا دل کڑھتا ہے اور اس میں اس کے ساتھ مدد کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے یہ تاثر ہے جو عمل کی وجہ بنا۔ پھر وہ عمل آدمی کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ مبادی سے پاک ہے اس لئے جو کرنا چاہتا ہے بغیر تاثر کے کر لیتا ہے۔ پس اگر کوئی شخص اس کڑھنے کی کیفیت سے گزرے بغیر اہلِ مصیبت کی مدد کرتا ہے تو اس کے اخلاق اللہ تعالیٰ کے اخلاق کا عکس ہیں اور وہ زیادہ کامل ہے بمقابلہ اس کے جو اس کیفیت سے گزرنے کے بعد وہ عمل کرے۔ پس اگر کسی کو مقامات بغیر کیفیات کے حاصل ہیں تو وہ زیادہ کامل ہے۔ اس بات کو خوب سمجھنا چاہیے۔ احوال میں بعض وہ ہوتے ہیں جن میں کسی نقصان کا اندیشہ نہیں ہوتا ان کو احوال غیر محتملۃ الضرر کہتے ہیں اور بعض میں نقصان کا اندیشہ

ہوتا ہے ان کو احوال محتملۃ الضرر کہتے ہیں۔

2.2.1... وہ احوال جن میں نقصان کا اندیشہ نہیں

2.2.1.1... اجابتِ دعا

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ "أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ" (البقرة:186) جس کا مفہوم یہ کہ اللہ تعالیٰ دعا مانگنے والوں کی دعا قبول فرماتے ہیں۔ اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے تین دعائیں مانگیں سو دو تو منظور کیں اور ایک نامنظور ہوئی۔ دعا مانگنے کا حکم ہے اس لئے دعا ضرور کرنی چاہیے اور ایک حدیث شریف کے مطابق دعا کرتے وقت یہ یقین ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ دعا قبول فرماتے ہیں۔ دعا کی قبولیت اونچے درجے کی حالت میں سے ہے لیکن ولایت کا ان پر انحصار نہیں کیونکہ مندرجہ بالا حدیث شریف میں آپ ﷺ خود ارشاد فرماتے ہیں کہ ایک دعا منظور نہیں ہوئی۔ دعا کے بارے میں جاننے کے لئے دو باتوں کا جاننا لازمی ہے۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ علیم و قدیر ہے سب کچھ جانتا ہے اور سب کچھ کرسکتا ہے لیکن ساتھ حکیم بھی ہے اور ہمارے اوپر ہم سے زیادہ مہربان ہے اس لئے اس نے جو ہمارے بارے میں فیصلہ کیا وہ ہمارے فیصلے سے بہتر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم عاجز ہیں۔ اپنا بھلا برا نہیں جانتے۔

یہ باتیں اگر سمجھ میں آجائیں تو پھر دیکھیں خدا تعالیٰ نے ہمیں اختیار دیا کہ ہم جس چیز کو اپنے لئے بہتر سمجھیں اور وہ جائز ہو تو اس کو اللہ تعالیٰ سے اس یقین کے ساتھ مانگ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ میری دعا سنتے ہیں اور قبول فرماتے ہیں۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ سب چیزوں پر قادر ہے اور جو ہم نے مانگا ہمیں وہ بھی دے سکتا ہے لیکن چونکہ ہمارے اوپر ہم سے زیادہ مہربان ہے اس لئے اگر ہم نے وہ چیز نہیں مانگی جو ہمارے لئے بہتر ہے تو وہ اس کے بدلے ہمیں وہ چیز دے دیتا ہے جو ہمارے لئے بہتر ہے۔ اس لئے کبھی کوئی آنے والی مصیبت اس کی وجہ سے ہٹا دیتے ہیں اور کبھی ہمارے لئے اس کو آخرت میں ذخیرہ کر دیتے ہیں۔

انسان کو چاہیے کہ جتنے اسباب اختیار کر سکتے ہیں ان کو اختیار کرنے کے بعد نتیجے کے لئے دعا کریں تاکہ جو اختیار میں نہیں اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد ہو کیونکہ بعض دفعہ اللہ تعالیٰ ناکافی اسباب سے بھی دعا کی برکت سے کام کر دیتا ہے۔ پس اجابتِ دعا احوالِ رفیعہ میں سے ہے لیکن لوازمِ ولایت میں سے نہیں۔

2.2.1.2... الہام

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں عمر ہوں اور تم پر حکومت کرنے کی مجھے خواہش نہیں تھی لیکن مجھ کو متوفی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کی وصیت کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے قلب میں اس کا القا فرمایا تھا۔ اگر بغیر کسی واسطہ کے دل میں کوئی بات حقائق میں سے آجائے یا ہاتفِ غیبی سے آواز آئے تو اس کو الہام کہتے ہیں۔ مندرجہ بالا اثر سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ بعض اولیاء اللہ کا صاحبِ الہام ہونا منقول ہے اس لئے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ صاحبِ الہام کو الہام کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے۔ اس کی مخالفت گناہ تو نہیں لیکن بعض کیفیات کا اس سے زوال ہو سکتا ہے جس سے بعض اعمال بھی متاثر ہو سکتے ہیں اِلّا کہ صاحبِ الہام قوی الارادہ ہو اور شوق و ذوق کے بغیر بھی اعمال میں کوئی کمی نہ ہو۔ بعض دفعہ الہام کی مخالفت سے کوئی اور دنیاوی نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ جیسے ایک صاحب کو الہام ہوا کہ فلاں جگہ نہ جاؤ لیکن وہ چل پڑے تو وہ گرے اور پیر ٹوٹ گیا۔

2.2.1.3... رویائے صالحہ

صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبشرات کیا ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صالح خواب اور یہی تفسیر ہے "لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" (یونس:64) کی یعنی ان کے لئے خوشخبری ہے دنیا کی زندگی میں۔ سچا خواب ایک حالتِ محمود ہے۔ حدیث شریف سے یہ ثابت ہے۔ محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ خواب کی تین قسمیں ہیں۔

(1) حدیث نفس یعنی اپنے خیالات

(2) وسوسہ شیطان یعنی شیطان خواب میں ڈرانے کے لئے مکروہ خواب دکھاتا ہے یا کسی جھوٹے زعم میں مبتلا کرتا ہے یا کسی خیر سے محروم کرنے کے لئے اہلِ خیر سے بدظن کرتا ہے یا اہلِ شر کی طرف متوجہ کرتا ہے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تم میں کوئی برا خواب دیکھے تو بائیں طرف تین بار تھتکار دے اور تین بار اعوذ باللہ پڑھے اور جس کروٹ پر تھا اس کو بدل دے۔ اس کو مسلم نے روایت کیا۔

(3) بشارت من اللہ یعنی مبشرات۔ جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلی ملتی ہے کسی خیر کی خبر یا شر سے بچنے کے لئے کوئی خبر یا نظم دکھایا جاتا ہے۔

خواب کی تعبیر ہر ایک سے نہیں پوچھنی چاہیے کیونکہ خواب دو آدمیوں کے کشف پر مبنی ہے ایک خواب دیکھنے والے کا اور ایک تعبیر دینے والے کا پس جس کو خوابوں کی تعبیر کا علم نہیں دیا گیا وہ کیسے خواب کی تعبیر دے سکتا ہے۔ اس طرح بعض لوگوں کو خوابوں پر بہت نظر ہوتی ہے۔ اچھے خوابوں کی کمی ہو جاتی ہے تو پریشان ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دوری کی علامت سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ غلطی پر ہیں۔ ان کو اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔ ان کو سمجھنا چاہیے کہ یہ مقصود نہیں اگر اچھا خواب آئے تو وہ محمود ہوسکتا ہے لیکن مقصود تو نہیں۔ ہمیں فکر مقصود کی کرنی چاہیے۔ طریق میں جو چیز اختیاری نہیں اس کے درپے نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے لئے لوگوں کو بیداری کی باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ فرماتے ہیں

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
من ہمہ ز آفتابم و ز آفتاب گویم

نہ میں رات نہ رات کا عاشق کہ کروں میں خواب کی باتیں
میں ہوں آفتاب کے ساتھ بس کروں آفتاب کی باتیں

یہ بھی جاننا چاہیے کہ خواب خود تو مؤثر نہیں البتہ کسی نیک اور بدعمل کا اثر ہوسکتا ہے اس لئے اعمال پر زیادہ توجہ دینا چاہیے خوابوں پر نہیں۔ بعض لوگوں

کے لئے خواب البتہ تربیت کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر کسی کا شیخ اس سے کام لے لے تو ٹھیک۔ خود سے اس کا بہت زیادہ خیال نہیں رکھنا چاہیے۔

2.2.1.4... فراست صادقہ

رسول کریم ﷺ کے ارشادِ مبارک کا مفہوم ہے کہ "مؤمن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ نورِ الٰہی سے دیکھتا ہے۔" (رواہ ترمذی) فراستِ صادقہ سچی اٹکل کو کہتے ہیں اور احوالِ رفیعہ میں سے ہے۔ یہ ایک قسم کا کشف ہے جو ذکراللہ کی کثرت پر استقامت، حلال طعام اور تقویٰ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس سے واقعات کے حقائق اور اشخاص کے حالات منکشف ہوتے ہیں جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ایک شخص کی زنا کی حالت ان کی آنکھوں سے معلوم ہوئی۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے جہاں جہاں مسجدیں بنائی ہیں ان کا قبلہ بالکل درست نکلتا ہے حالانکہ نہ ان کے پاس قطب نما تھا نہ نقشہ وغیرہ۔ مشائخ کو بعض دفعہ اس فراستِ صادقہ کی برکت سے گفتگو اور خط وغیرہ سے مریدوں کا اندرونی حال معلوم ہو جاتا ہے۔

2.2.1.5... فنا

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ" اور میں نے جن اور انسان کو بنایا ہے تو صرف اپنی بندگی کے لیے۔ (الذاریات:56) کی تفسیر حضرت عبداللہ بن عباسؓ "ای لیعرفون" سے کرتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کی عبادت اور معرفت کے لئے جو رکاوٹیں ہیں ان کو دور کئے بغیر یہ حاصل نہیں ہوسکتے۔ ان تمام رکاوٹوں کا ختم ہونا تب ممکن ہے جب انسان اپنا سب کچھ محسوس غیر محسوس اللہ تعالیٰ پر قربان کرے یعنی اس کا نفس، عقل اور قلب کوئی ایسا کام جذبہ اور سوچ تحریک نہ کرسکے جو اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے مقابلے میں آسکے۔ اور یہ تب ممکن ہے کہ انسان کو صرف وہی یاد ہو اور کچھ یاد نہ رہے۔ اس حالت کو فنا کہتے ہیں۔ اس کا مکمل تعین محال ہے کیونکہ اس کا ادراک فنا کے خلاف ہے اور بغیر ادراک کے کچھ معلوم نہیں ہوسکتا اس لئے یہ مقامِ حیرت و

محویتِ محض ہے۔

جو ابتدائی جذب ہوتا ہے اس میں دل کی قدرے اصلاح ہوچکی ہوتی ہے اس میں انسان اپنے دل کے جذب کے زور پر سلوک کے بغیر بھی اپنی کچھ خواہشات کو دبانے کے قابل ہو جاتا ہے یعنی قلبی طور پر اس قدر فنا اس کو حاصل ہو جاتی ہے لیکن چونکہ اس کی نفس کی اصلاح ابھی نہیں ہوچکی ہوتی ہے تو واپس لوٹنے کا خطرہ ہوتا ہے تو یہ جو ابتدائی جوش و جذبہ ہے اس کے ماند پڑتے ہی چونکہ ابھی نفس و روح آپس میں ملے ہوئے ہیں اس لئے وہ ارادہ جو اس کو حاصل ہوا ہے اپنے نفس کے ارادے کے مقابلے میں وہ ختم ہو جاتا ہے تو سلوک کے ذریعے جو فنا حاصل ہوتی ہے وہ اس وجہ سے ہوتی ہے کہ اس کا نفس روح سے علیحدہ ہو جاتا ہے جس سے ارادے کی فنا حاصل ہو جاتی ہے جس میں پھر نفس واپس اس جگہ پر نہیں آسکتا یہی فنائے کامل ہوتی ہے۔

ایک فنا جو شروع میں حاصل ہوتی ہے یعنی شروع کے جذب سے جو حاصل ہوتی ہے اور وہ ناقص ہوتی ہے اور عارضی ہوتی ہے اور اس پر بقا کا اطلاق نہیں ہوتا لیکن سلوک طے کرنے کی وجہ سے جب نفس اپنی جگہ یعنی عبدیت کے مقام پر آ جاتا ہے تو پھر انسان کو اس کو دبانے کے لئے، اپنے دل کے ارادے کی ضرورت نہیں ہوتی اس لیے عمل کے لیے جس فنا کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس وقت کامل طور پر حاصل ہو جاتی ہے اس لئے واپس لوٹنے کا خطرہ بھی پھر نہیں ہوتا۔

2.2.1.6... بقا

اس حالت سے گزرنے کے بعد جب اللہ تعالیٰ اس کو واپس احساس لوٹا دے اور فنا کا اثر اتنا باقی رہے کہ اس کا ہر عمل فنا کے خط کشیدہ حصے سے مستفاد ہو تو یہ حالت بقا کہلاتی ہے۔ اس وقت سالک سب احکامات پر عمل کرتا ہے لیکن اس کی نسبت اپنی طرف نہیں کرتا۔ یعنی عبدیتِ محض اس کا خاصہ بن جاتی ہے۔

انسان کو دوام حاصل ہو جائے اللہ پاک کے احکام میں اور اطمینان حاصل ہو

جائے اور تمکین حاصل ہو جائے تو یہ بھی ایک بقا ہے۔ یہ بھی اللہ پاک کا انعام ہی ہے اور دوسرا یہ کہ اللہ پاک کی طرف سے قبولیتِ تامہ نصیب ہو جائے تو یہ بھی بقا کی ایک شکل ہے کیونکہ یہ اکثر فنا ہی کا نتیجہ ہوتی ہے جس کو بقا کہتے ہیں۔

2.2.1.7... وجد

بخاری اور مسلم کی روایت ہے کہ میں بھی یہ چاہتا ہوں کہ دوسرے کی زبان سے قرآن مجید سنوں سو میں نے پڑھ کر سنایا اور اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کے آنسو بہنے لگے۔ "حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سلف (صحابہ و تابعین) میں سے تلاوتِ قرآن کے وقت نہ کسی پر بے ہوشی طاری ہوتی تھی نہ کوئی چیختا تھا۔ صرف رویا کرتے تھے اور ان کے بدن پر رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے۔ پھر خدا کی یاد کی طرف ان کے پوست اور قلوب نرم ہو جاتے تھے۔ جسم کا کسی کیفیت سے ایسا متاثر ہونا کہ اس کا اثر ظاہر ہو وجد کہلاتا ہے۔ حدیث شریف میں تذرفان سے اس کی اصل ثابت ہے اور قرآن مجید میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔ البتہ خواص کو اس درجہ کا وجد نہیں ہوتا جتنا کہ عوام کو ہوتا ہے۔ وجہ اس کی قوتِ برداشت ہے۔ ایک تنکا تھوڑے سے پانی کے ساتھ بھی بہہ پڑتا ہے لیکن وہی پانی شہتیر کو نہیں بہا سکتا۔ اس کے برعکس آبشار شہتیروں کو بھی بہا کر لے جاتی ہے۔ اس لئے عوام تو معمولی وارد کا تحمل بھی نہیں کر پاتے اور چیخنا شروع کرلیتے ہیں۔ کاملین اتنے وارد کا تو تحمل کرلیتے ہیں لیکن وارد ہی اگر بہت تیز ہو تو پھر کاملین کو بھی تغیر ہو جاتا ہے جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیہوش ہوئے تھے۔ کہتے ہیں کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ایک دفعہ مجلس میں بیٹھے تھے، ایک شعر پر پوری مجلس کو وجد آگیا لیکن حضرت اسی طرح استقلال کے پہاڑ بنے بیٹھے رہے۔ کسی نے پوچھا حضرت آپ پر اثر نہیں ہوا۔ حضرت نے اس سے فرمایا کہ میرے جسم کے کسی حصے کو ہاتھ لگاؤ تو اس نے جب ہاتھ لگایا تو وہاں سے خون نکلا۔ حضرت نے فرمایا اندر تو تغیر ہوتا ہے لیکن اس کو باہر نہیں آنے دیتے۔ اگر سالک خود میں تغیر پیدا کر دے تو یہ تواجد کہلاتا ہے

جس سے اگر دنیا مقصود ہو تو گناہ ہو گا جیسے رومی رقص وغیرہ۔

اس میں پہلے قصود (قصد کرنا) ہوتا ہے، پھر ورود (وارد کا طاری کرنا)، پھر شہود (مشاہدہ کرنا) پھر وجود (بے خود ہونا) اور پھر خمود (مستغرق ہو جانا)۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کسی نے دریا پر آنے کا قصد کیا پھر آپہنچا، پھر اس کو دیکھا، پھر اس میں کودا اور پھر ڈوب گیا۔

2.2.1.8... سکر کے بغیر وحدۃ الوجود

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ابنِ آدم مجھے آزردہ کرتا ہے کہ زمانے کو برا کہتا ہے حالانکہ زمانہ تو میں ہوں۔ آگے اس کی تفسیر ہے کہ میرے ہی قبضے میں سب کام ہیں جو کہ زمانہ میں واقع ہوتے ہیں۔ زمانہ اگرچہ بالکل مختلف چیز ہے لیکن چونکہ اس پر اللہ تعالیٰ کا کامل تصرف ہے اس لئے اس کی نسبت اپنی طرف کردی۔ پس سالک پر جب حق تعالیٰ کے وجود کی تجلی اتنی غالب ہو کہ ماسویٰ سے اس کو غافل کر دے تو وہ بزبانِ حال یہ کہتا ہے کہ صرف وہی موجود ہے۔ اسی کیفیت کو وحدۃ الوجود کہتے ہیں۔ یہ ایک حال ہے جس کو بعض لوگوں نے فلسفہ بنایا۔ نقصان اس سے ہوا کہ لوگوں نے اس کی فلسفیانہ تشریحات شروع کیں حالانکہ یہ بالکل سادہ سی بات تھی کہ جب سورج موجود ہوتا ہے تو تارے ہرگز نظر نہیں آتے اس لئے اگر کوئی اپنا مشاہدہ یہ بتائے کہ صرف سورج موجود ہے تارے نہیں ہیں تو وہ اگرچہ حقیقت کے خلاف ہے لیکن کہنے والا بھی جھوٹا نہیں ہے وہ تو اس وقت یہی کہے گا پس جب اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کی موجودگی کا ادراک ہی نہ ہو تو اس حالت کو وحدت الوجود کہتے ہیں ایسا اگر سکر کی حالت میں ہوتواس کو وحدت الوجود بالسکر کہتے ہیں البتہ جو حقیقت سے واقف ہے وہ اس کی بات کی تاویل تو کرے گا لیکن اس کی بات سے تاروں کے وجود کا انکار نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ خالق ہے اور اس نے مخلوق کو پیدا کیا۔ قرآن میں ان مخلوقات کا ذکر ہے۔ شریعت کا ایک مستقل نظام ہے جو انسانوں کے لئے ہے پس ان سارے حقائق سے کون ہوش و حواس میں انکار کرسکتا ہے۔ دل پر اثر

تو ایک کا رہے لیکن مخلوقات اور موجودات کی موجودگی، ان کا باہمی تعلق اور متعلقہ احکامات کے ادراک کے ساتھ ہو تو اس کو وحدت الوجود بدون سکر کہتے ہیں، اسی کا نام حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے بعد میں وحدت الشہود رکھا یعنی ایک کا مشہود ہونا جو کہ اس کیفیت کی زیادہ بہتر تشریح ہے کیونکہ وحدت الوجود کی بعض غلط تشریحات اس کی فلسفیانہ انداز سے مروج ہوچکی تھیں۔ اس مسئلے کی اتنی تشریح پر عوام کو قناعت کرنی چاہیے، اس میں زیادہ خوض کرنے سے نقصان کا اندیشہ ہے۔

2.2.2... جن احوال میں نقصان کا اندیشہ ہے

2.2.2.1... استغراق

لوگوں نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ یہ لڑکی آپ رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی جو آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھ جارہی تھی آپ کی ہے؟ تو آپ اس کو بہت غور سے دیکھ کر فرماتے ہیں۔ کہ ہاں گھر والے کہتے تو تھے کہ یہ میری لڑکی ہے یعنی یہ بھی یاد نہیں رہا کہ یہ میری لڑکی ہے گھر والوں کے قول سے استدلال کیا۔ کیفیت استغراقیہ اصل میں فناء کی ہی ایک حالت ہے۔ اس میں انسان کو جن چیزوں کا علم ہوتا ہے اس سے وہ بے خبر ہو جاتا ہے یا وہ بہت کمزور ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی کمال نہیں۔ اکثر یہ متوسطین کو ہوتا ہے ہاں اگر وارد بہت قوی ہو تو کاملین کو بھی ہوسکتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ نماز کو طول دوں مگر نماز میں کسی بچہ کی آواز سن کر نماز میں تخفیف کر دیتا ہوں کہ اس کی ماں پریشان نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو استغراق نہیں ہوتا تھا لیکن اگر اس استغراق سے اعمالِ شریعت میں کوئی کمی نہ آئے تو محمود ضرور ہے جیسا کہ حضرت عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے خادم کے ذمہ یہ کام کیا تھا کہ نماز کے وقت اس کو مطلع کیا جایا کرے اور وہ آپ کے کان میں حق حق کی آواز لگا کر آپ کو اس کیفیت سے باہر نکالتے۔ راستہ میں بھی حق حق کے نعرے سے

مسجد کی طرف رہنمائی کرتے۔

2.2.2.2... تصرف و تاثیر المعروف بہ توجہ

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے ایک لمبی حدیث میں روایت ہے کہ "جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میری یہ حالت دیکھی جو مجھ پر غالب ہو رہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے پر ہاتھ مارا، میں پسینہ پسینہ ہوگیا اور خوف سے میری یہ حالت ہوگئی کہ گویا میں اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں۔"

یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تصرف تھا۔ بعض لوگ فطرتاً صالح التصرف ہوتے ہیں گو صاحبِ نسبت نہ ہوں، اس کا طریق صرفِ ہمت کو صرف کرنا ہے دوسرے کی بھی ہمت اگر قوی ہو تو اس کو روک سکتا ہے۔ یہ مشق کے ذریعے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ توجہ متعارف اسی کو کہتے ہیں۔ اس سے بعض حضرات القاء نسبت کا کام لیتے ہیں۔ اس میں تمام طرف سے اپنے آپ کو یکسو کر کے مرید پر توجہ کی جاتی ہے۔

مسمیرزم وغیرہ بھی یہی چیز ہے لیکن اس کا استعمال غلط جگہ پر ہے۔ ہمارے اکابر کو اس میں یہ اشکال ہے کہ گو اس کا استعمال صحیح بھی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی توجہ ہٹانا چاہے تھوڑی دیر کے لئے کیوں نہ ہو عجیب ہے کیونکہ یہ توجہ ہٹانا بالارادہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس کو متعارف توجہ دی جاتی ہے بعض اوقات وہ اسی پر ہی تکیہ کرلیتا ہے اور خود کام چھوڑ دیتا ہے حالانکہ یہ دیرپا نہیں ہوتا۔ اس کی مثال تو ایسی ہے کہ جیسے گاڑی گڑھے میں پھنس گئی تو لوگوں کو ساتھ ملا کر دھکے سے گاڑی نکلوائی۔ جب گاڑی نکلی تو اب تو اس کو خود چلنا چاہیے نہ کہ گاڑی کو بند کر کے دھکا پر تکیہ کر کے بیٹھا رہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ لوگ اس کو بزرگی سمجھتے ہیں اس لئے شہرت ہو جاتی ہے جس کے کئی مفاسد ہیں۔ چوتھے یہ کہ اس سے فاعل کے قلب کو نقصان بھی ہوسکتا ہے جو آخر عمر میں ظاہر ہوتا ہے۔

توجہ کا احسن طریقہ یہ ہے کہ مرید کے لئے دل سے دعا کی جائے کہ اس

کو نسبت القاء ہو جائے۔ یہ قلبی دعا توجہ کی طرح ہوتی ہے لیکن اس میں توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے۔ ذکر بالجہر بیک آواز میں بھی توجہ کی تاثیر ہوتی ہے۔ اس لئے جو لوگ انفرادی طور پر ذکر میں نہیں چلتے اجتماعی ذکر میں چل پڑتے ہیں۔

جو توجہ ہے بس وہ قلبی دعا ہوتی ہے — جو کسی کے لئے کسی کی اک آہ ہوتی ہے
جو پھنسا ہو کسی حال میں، سے نکالنے کے لئے — کسی محسن کے دل کے لب سے ادا ہوتی ہے
اک توجہ ہے کہ لوٹ پوٹ کسی کو کر دے — یہ توجہ اس توجہ سے جدا ہوتی ہے
یہ توجہ کہاں مانگے سے ملا کرتی ہے — یہ توجہ اک تعلق سے پیدا ہوتی ہے
اسکو بازار کی دنیا میں نہیں لانا شبیر — یہ تو بس عشق کے میدان کی ندا ہوتی ہے

2.2.2.3... سکر

رسول کریم ﷺ سے جبرئیل علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ اے محمد ﷺ اگر آپ مجھے اس وقت دیکھتے تو تعجب فرماتے کہ میں دریا کے کیچڑ کو فرعون کے منہ میں ٹھونستا تھا اس اندیشہ سے کہ اس کو رحمت الٰہیہ نہ پالیوے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا یہ عمل غلبۂ سکر سے تھا اور اس کی وجہ بغض فی اللہ تھا۔ وارد غیبی کے ظاہری اور باطنی احکامات میں امتیاز کا اٹھ جانا سکر کہلاتا ہے اور اس امتیاز کا موجود ہونا صحو کہلاتا ہے۔ اس کا غلبہ گو کہ اکثر ناقصین پر ہوتا ہے لیکن گاہے کاملین پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عبداللہ بن ابی کے جنازہ کے بارے میں آپ ﷺ سے یہ کہنا کہ آپ ﷺ کو تو اس کا جنازہ پڑھنے سے منع کیا گیا۔ بعد میں حالتِ صحو میں آنے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی جرأت پر تعجب ہوا۔ آپ ﷺ کا غزوہ بدر کے موقع پر یوں دعا فرمانا کہ اگر یہ مختصر جماعت ہلاک ہوگئی جو اس وقت میرے ساتھ ہے تو پھر آج کے بعد کوئی آپ کا نام نہیں لے گا۔

حالتِ صحو میں ضبط واجب ہے اور ایسی حالت میں اخفاء کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ اہلِ زمانہ فتنہ انگیز ہیں اور ایسے اُمور میں فتنہ بپا کردیتے ہیں۔ خود فتنہ میں پڑنا یا دوسروں کو فتنہ میں ڈالنا درست نہیں اور غلبہء حال میں اگر کچھ ایسی باتیں ناکردنی سرزد ہو جائیں تو اشکِ ندامت سے اس کا تدارک کرنا چاہیے کیونکہ کامل سکر کا یقین کرنا مشکل ہے اور استغفار ہر حالت میں مفید ہے۔ یہ اس لئے کہ مخلوق گمراہی سے بچ جائے جیسا کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے حالتِ سکر میں جب یہ کلمہ "سبحاني ما أعظم شاني" نکلا اور صحو میں آنے کے بعد آپ کو جب بتایا گیا تو آپ نے فوراً فرمایا اوہ اس طرح کہنے سے تو میں مجوسی ہوگیا۔ میں زنار کو توڑتا ہوں اور کلمہ شہادت پڑھتا ہوں۔ حالتِ صحو میں اگر کسی نے اہلِ سکر کے حالتِ سکر کے کلمات کی نقل کی تو اگر وہ کلمہ گناہ کا ہے تو اس کو گناہ ہوگا اور اگر کلمہ کفر ہے تو اس سے کافر ہو جائے گا۔ اس لئے اس سے بہت احتیاط چاہیے۔

2.2.2.4... قبض و بسط

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایک طویل روایت میں مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم (ابتدائے نبوت میں جب وحی میں توقف ہوا) تو اس قدر مغموم ہوئے کہ غم کے سبب کئی بار اس ارادہ سے تشریف لے گئے کہ پہاڑ کی بلندی سے گر کر جان دے دیں سو جب کسی پہاڑ کی چوٹی پر اپنے آپ کو گرانے کی نیت سے چڑھتے تو جبرائیل علیہ السلام آپ کو نظر آتے اور فرماتے۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مغموم نہ ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تو سچ مچ اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کو سکون ہو جاتا اور جی ٹھہر جاتا۔

دل پر خوش کن واردات کی کمی یا ختم ہونا جو کسی مصلحت سے ہو قبض کہلاتا ہے۔ حدیث شریف سے یہ ثابت ہے۔ محبوب کی جلالی تجلی یعنی اس کی عظمت اور استغناء کا ادراک دل پر غالب ہونے سے سالک کے دل پر جو بوجھ آ جاتا ہے۔ اس کو قبض کہتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن کعب رضی اللہ عنہ کے واقعہ تخلف عن التبوک

میں ضیق ارض اور ضیق النفس سے تعبیر کیا گیا۔ قبض کے مقابلے میں حالتِ بسط ہے جس میں آثارِ لطف و فضل سے دل مسرور ہوتا ہے۔

کبھی کبھی سوء اعمال سے بھی اعمال کی لذت ختم ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی فتور و ملال و کسل جس کو آج کل کے دور میں ڈپریشن کہتے ہیں یہ حالت پیش آتی ہے۔ اس لئے جب اس قسم کی حالت ہو تو سب کا حق ادا کیا جائے۔ یعنی توبہ اور استغفار کیا جائے۔ مفرحات کا استعمال کیا جائے اور اس حالت پر صبر کی نیت کی جائے۔ اپنے شیخ سے رابطہ رکھا جائے وہ جیسے تجویز فرمائیں اس پر عمل کیا جائے۔ اس دوران "یا باسط" کا ورد کثرت سے کرنا چاہیے۔ قبض میں منافع بسط سے زیادہ ہیں۔ اس سے کبر اور عجب کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ تواضع اور عاجزی نصیب ہوتی ہے۔ گناہوں سے توبہ کی توفیق نصیب ہوتی ہے۔ عبدیت کا کامل مشاہدہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت جو اعمال کئے جاتے ہیں اس میں نفس کا ذرہ بھر حصہ نہیں ہوتا اس لئے اس کی قبولیت کا امکان سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ حضرت مولانا یعقوب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک واقعہ مروی ہے کہ ایک شیخ پر قبض کی حالت طاری ہوگئی اور وہ سمجھنے لگا کہ میں شیطان ہوں۔ ایک اور شیخ کے پاس گئے ان سے جب یہ کہا تو انہوں نے کہا کہ اگر شیطان ہوگئے ہو تو "لاحول ولا قوۃ اِلا باللہ" اس سے وہ اتنے دل گرفتہ ہوئے کہ اپنے ایک مرید سے کہا کہ اب ایک شیخ نے بھی اس کی تصدیق کی اس لئے میں خودکشی کرتا ہوں اور کرلی۔ حضرت مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے جس شیخ کے پاس وہ گئے تھے میں سمجھتا تھا کہ وہ شیخ کامل ہے لیکن اس سے تو پتا چلا کہ کامل نہیں ناقص ہے۔ اگر میرے پاس آتا تو میں اس سے کہتا کہ کوئی بات نہیں شیطان بھی خدا کا بندہ ہے۔ اس سے اس کا قبض مائل بہ بسط ہو جاتا۔ اس لئے شیخ کامل کی رہنمائی اس موقعے پر لازمی ہے۔

2.2.2.5... مشاہدہ

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ سے ایک لمبی حدیث میں روایت ہے۔ "میں نے کہا کہ

ہم لوگ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کی خدمت میں جو ہوتے ہیں اور آپ ﷺ ہمیں دوزخ و بہشت یاد دلاتے ہیں تو اس وقت ایسے ہوتے ہیں گویا کھلی آنکھوں سے ان کو دیکھ رہے ہیں۔" مشاہدۂ (حق) کی دو قسمیں ہیں:

(1) ایک مشاہدہ تام جو کہ جنت میں ہوگا اِن شاءاللہ۔

(2) دوسرا مشاہدہ ناقص یعنی استحضارِ تام یہ دنیا میں ہوسکتا ہے۔

اس سے مراد غلبہء استحضار ہے۔ اس کا مطلب وہ نہیں جو لغت میں عام طور پر لیا جاتا ہے یعنی تام سے مراد غلبہ ہے فقط۔ اگرچہ مشاہدۂ تام کے سامنے یہ استحضارِ تام استتار کے زمرے میں آتا ہے لیکن اثر کے لحاظ سے یہ کافی ہے کیونکہ یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ اس میں اگر استحضارِ کامل بھی حاصل ہو جائے تو بہت بڑی بات ہے۔ کیفیتِ احسان بھی تو اسی استحضار ہی کا نام ہے جس کا حدیث شریف میں حکم ہے۔ دنیا میں چونکہ انسان میں تحمل نہیں اس لئے اگر تجلی دائمی ہوتی تو استغراق کی حالت ہوتی۔ اس لئے تجلی کو استتار میں تبدیل کرلیتے ہیں تاکہ تحمل کرسکے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک محبوب نے عاشق کو دیکھا کہ یہ بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا ہے کہیں یہ شوق سے مر نہ جائے تو ایک صورت تو یہ تھی کہ اس کو مشاہدے سے روکتے تو یہ صورت تو عاشق پر بہت سخت ہوتی اس لئے یہ تو نہیں کیا لیکن اس کو کسی کام سے بازار بھیج دیا پس عاشق خوش ہے کہ میں محبوب کے کام میں مشغول ہوں لیکن استتار کا مقصد بھی حل ہوگیا۔ پس یہاں بھی عاشق کو دوسرے کاموں کی طرف متوجہ کردیا۔ اس سے ایک گونہ استتار بھی ہوگیا تاکہ اس کا شوق معتدل رہے۔

2.2.2.6... کرامت

"قَالَ يٰمَرْيَمُ أَنّٰى لَكِ هٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللهِ" (آلِ عمران: 37) حضرت زکریا علیہ السلام یوں فرماتے کہ اے مریم یہ چیزیں تمہارے پاس کہاں سے آئیں وہ کہتیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے آئیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث شریف میں روایت ہے کہ حارث کی ایک دختر سے منقول ہے کہ میں

نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو انگور کا خوشہ کھاتے دیکھا۔ اور اس وقت مکہ میں میوہ یا پھل کا کہیں نام و نشان نہیں تھا اور خود وہ لوہے میں مقید تھے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا۔ کرامت اس امر کو کہتے ہیں جو عادتاً محال ہو اور نبی کے کسی متبع کامل کے ہاتھ پر ظاہر ہو۔ پس اگر وہ خرقِ عادت کام نہ ہو یا خرقِ عادت تو ہو لیکن نبی کے متبع کامل کے ہاتھ پر نہ ہو تو وہ استدراج ہے۔ استدراج ڈھیل دینے کو کہتے ہیں۔ جوگیوں وغیرہ کے کام اس زمرہ میں آتے ہیں۔ کرامت اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے اس لئے اس کی کوئی حد نہیں۔ معجزہ اور کرامت میں صرف یہی فرق ہے کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کے نبی کے ہاتھ پر ہوتا ہے اور کرامت ولی کے ہاتھ پر۔ کرامت کی دو قسمیں ہیں۔

(1) ایک حسّی یعنی عجیب کاموں کا واقع ہو جانا اور دوسرے معنوی یعنی توفیقاتِ عجیب کا نصیب ہو جانا۔

(2) معنوی کرامت حسّی کرامت سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔

2.2.2.7... کشفِ الٰہی

ذات و صفاتِ الٰہی کے متعلق علوم و اسرارِ معارف کا کشف جس میں شیطان وساوس کو شامل کر کے غلط سمت میں لے جا سکتا ہے یا ان کو فلسفیانہ رنگ میں لے جا کر سالک کو گمراہ کر کے تعلی میں مبتلا کر سکتا ہے۔ فلسفیانہ تصوف اسی سے بنتا ہے۔

2.2.2.8... کشفِ کونی

جن چیزوں کو عام لوگ نہیں دیکھ سکتے ان کا نظر آجانا، چاہے وہ گزشتہ یا آئندہ کے حالات و واقعات ہوں یا دور و نزدیک کی چیزیں۔ ان میں پڑ کر سالک اپنے مقصد سے دور جا سکتا ہے۔ احقر کو اپنے شیخ نے اس پر ڈانٹ دیا تھا کہ دور کرو دور کرو یہ راستے کے کھیل تماشے ہیں۔ حضرت تھانویؒ نے اس کو ایک مثال سے واضح کیا ہے کہ کوئی اپنی منزل پر ایسی گاڑی میں پہنچتا ہے جس میں کھڑکیاں

سب بند ہیں اور سالک کو رستے میں کچھ نظر نہیں آتا لیکن اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے دوسرا وہ کہ جس میں کھڑکیاں سب کھلی ہیں اور راستے میں دل کو لبھانے والی چیزیں نظر آتی ہیں۔ اس میں بھی سالک اگر اپنی منزل پر پہنچ جائے تو پھر تو یہ بھی کامیاب ہوگا پہلے کی طرح لیکن اس میں احتمال ضرور ہے کہ سالک ان مناظر میں پڑ کر کہیں گاڑی سے اتر نہ جائے اور گاڑی چل کر اس کو چھوڑ نہ جائے تو ایسے سالک کو حرمان کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

2.2.2.9... وحدۃ الوجود سکر کے ساتھ

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جس کو وحدۃ الوجود کہا ہے وہ یہی ہے اس میں سالک کو ماسویٰ کا علم نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ سے بعض ناگفتنی باتیں سالک کے منہ سے نکلتی ہیں جس میں وہ معذور ہوتا ہے۔

2.3... موانع

یوں تو جتنے بھی معاصی اور تعلقات ماسویٰ اللہ ہیں سب اس راہِ سلوک کے رہزن ہیں۔ مگر چند ضروری چیزوں کو بیان کیا جاتا ہے جن سے سالک کو بے حد پرہیز کرنا چاہئے۔ ورنہ ساری محنت بے کار و رائیگاں چلی جائے گی۔ یہ موانع مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) تصنع (2) تعجیل (3) حسن پرستی (4) مخالفتِ سنت (5) مخالفتِ شیخ

2.3.1... تصنع

"عَنْ أَسْمَاءَرضی اللہ عنها قالت: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "الْمُتَشَبِّعُ بِمَا لَمْ يُعْطَ كَلَابِسِ ثَوْبَيْ زُورٍ" (البخاري) حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جو شخص ایسی چیز کا اظہار کرے جو اس کو نہیں ملی اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کسی نے دونوں کپڑے جھوٹ کے پہنے ہوں۔"

چونکہ مَا لَمْ يُعْطَ عام ہے ظاہری اور باطنی نعمتوں پر اس لئے جو شخص اپنا کوئی ایسا حال ظاہر کرنا چاہے جو اس کو حاصل نہیں تو وہ بھی اس میں آئے گا۔ تصنع بابِ تفعل سے ہے جس میں تکلف پایا جاتا ہے پس ایسا طریقہ جس میں بتکلف کسی عادت یا خوبی کو اپنے میں ظاہر کیا جائے۔ پس جو بتکلف بزرگوں کی طرح اپنے آپ کو ظاہر کرے گا وہ بھی اس وعید میں داخل ہوگا۔

تصوف تو محبت کا راستہ ہے

اس میں دعویٰ اور تصنع کا کہاں دخل۔ دوسری بات یہ ہے کہ تصنع مخلوق کی خوشنودی یا دنیاوی مفاد کے لئے کیا جاتا ہے جو کہ تصوف کے بنیادی مقاصد کی خلاف ورزی ہے اس لئے ایسے لوگ بہت دور پڑ جاتے ہیں۔ اس میں جھوٹے خواب، جھوٹے حال اور تمام ریائی افعال داخل ہیں۔ اللہ تعالیٰ مجھ سمیت سب کو اس سے محفوظ فرمائے آمین۔ بعض لوگ اپنے آپ کو تسلی دیتے ہیں کہ جیسے

بزرگ کہتے تھے کہ ہم میں اصل کہاں ہم تو نقل کرتے ہیں تاکہ مقربین کی نقل سے ہمارا بھی بھلا ہو جائے اور ہم قبول ہو جائیں۔ وہ اس وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ انہوں نے اچھا عمل کرنے کی انتہائی کوشش کے بعد یہ بات محض دعویٰ کے رد میں ایک حال میں کہی ہوتی ہے کیونکہ ان کو اپنے اعمال اچھے نظر ہی نہیں آتے چاہے وہ کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں پس وہ اپنے اعمال کو کچھ نہ سمجھتے ہوئے ان کو محض نقل قرار دیتے ہیں جو کہ ان کی غایت تواضع کی وجہ سے ہے جب کہ یہاں پر عمل سرے سے موجود ہی نہیں صرف دکھاوا ہے۔ کتنا فرق ہے ان میں اور ان میں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ سالک بعض دفعہ بڑوں کی کتابوں سے ان کے احوال پڑھ کر ان سے متاثر ہو جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کو بھی یہ احوال حاصل ہو جائیں پس ان احوال کو مقصود خیال کر کے ان کی نقل شروع کرتے ہیں۔ ان میں وہ اقوال و معارف جو ان حضرات کے احوال کے ثمرہ کے طور پر ان کی مبارک زبانوں پر جاری ہوئے وہ یہ عوام سے بیان کرنے لگتے ہیں۔ عوام کو چونکہ اصل اور نقل کی پہچان نہیں ہوتی اس لئے وہ بھی ان کو اصل سمجھ کر ان کے معتقد ہوجاتے ہیں۔ جس سے ان کو بھی اپنے اوپر بزرگ ہونے کا خیال آنے لگتا ہے اور اس کو پھر نبھانے کے لئے بزرگوں کے احوال کی نقل اتارتا رہتا ہے جس سے وہ اس تصنع کی دلدل میں پھنستا رہتا ہے۔ اللہ بچائے شیطان کے اس جال سے۔ کاش وہ یہ بات سمجھ جاتا کہ احوال مقصود نہیں مقامات مقصود ہیں اور سب سے اصل مقصود تو اللہ تعالیٰ کی رضا ہے تو یہ غلطی نہ کرتا۔ اس لئے مطالعہ بھی شیخ کے مشورہ سے کرنا مناسب ہے۔ بعض لوگوں کو اس سے بھی دھوکہ ہو جاتا ہے کہ یہ فرمایا گیا ہے کہ دعا میں اگر رونا نہ آئے تو رونے کی شکل ہی بنا دے چونکہ یہ بھی تصنع ہے اور اس کا حکم ہے اس لئے تصنع ناجائز نہیں۔ یہاں بھی ان لوگوں کو یہ دھوکہ ہوا ہے کہ اس میں رونے کی شکل بنانے سے مراد صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے بتکلف عاجزی کا اظہار ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کے سامنے تو عاجزی مطلوب ہے ہی اس لئے یہ بتکلف رونے کی شکل بنانا ایک ذریعہ ہوا اللہ تعالیٰ کے رحم کو متوجہ کرنے کا اس لئے یہ مستحسن ہے لیکن اگر یہی بتکلف

رونا اس لئے ہو کہ لوگ میرا رونا دیکھ کر معتقد ہو جائیں تو پھر یہ گریہ ریائی بن جائے گا جیسے شیعہ لوگ کرتے ہیں۔ اس وقت یہ مذموم ہو گا۔ اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اس سے البتہ مشائخ کی ان باتوں پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے جو صحیح مشائخ اپنے مریدوں کی اصلاح کے لئے کرتے ہیں۔ یعنی وہ اپنے مشیخت کا خیال رکھ کر بعض دفعہ بتکلف بعض اُمور انجام دیتے ہیں کیونکہ ان کو ہر طرح کے لوگوں کے مزاج کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اس سے مقصود اپنی بزرگی کا اظہار نہیں بلکہ عوام کو بدگمانی سے بچانا ہوتا ہے تاکہ ان کو روحانی نقصان نہ ہو۔ یہ مدارات کے قبیل سے ہے اور مشائخ کے فرائضِ منصبی میں سے ہوتا ہے لیکن بعض مشائخ ان سے بھی مبرا ہوتے ہیں۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے۔

سوختن افروختن و جامہ دریدن
پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت

2.3.2... تعجیل

"قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ـ يُسْتَجَابُ لِأَحَدِكُمْ مَا لَمْ يَعْجَلْ" (ترمذي) رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے ہر ایک کی دعا قبول کی جاتی ہے جب تک جلدی نہ کرے۔

پس ایک مانع مجاہدات کے ثمرات میں عجلت اور تقاضا کرنا ہے کہ اتنے دن مجاہدہ کرتے ہو گئے اب تک کچھ نتیجہ نہیں ہوا پھر اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ یا تو شیخ سے بد اعتقاد ہو جاتا ہے یا مجاہدہ کو ترک کر دیتا ہے۔ طالب کو سمجھنا چاہئے کہ کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو دفعتاً حاصل ہو جاتی ہو، دیکھو یہی شخص خود کسی وقت بچہ تھا کتنے دنوں میں جوان ہوا۔ پہلے جاہل تھا کتنے دنوں میں عالم ہوا۔ غرض عجلت و تقاضا اپنے شیخ پر فرمائش ہے جو بہت مضر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر ایسا شخص اپنے رہبر پر قناعت نہیں رکھتا۔ ہر کس و ناکس سے چارہ جوئی کرتا ہے اور پھر ہرجائی ہونے کی وجہ سے اس کے اوپر سے شیخ کی عنایت و لطف بھی جاتا

رہتا ہے اور پھر مزید برآں یہ کہ جس چیز کو جلدی چاہتا ہے اس کا حصول اختیار سے خارج ہوتا ہے اس سے اور بھی پریشانی بڑھتی ہے غرض ظاہراً و باطناً ہر طرح سے برائی ہی برائی ہاتھ آتی ہے۔

ہمہ کامی زخود کامی بہ بدنامی کشید آخر
نہاں کے ماند آں رازے کزد سازند محفلہا

وصال یار کی چاہت میں جو تعجیل ہوئی مجھ سے
کیا الفت کا سامنے غیر کے اظہار، ہوا رسوا

خود کامی سے مراد استعجالِ وصل ہے یعنی محبوب کے وصال میں جلدی مچانے کا انجام یہ ہوا کہ ہر جگہ رسوائی ہوئی کیونکہ مجھے اپنی محبت کا اظہار دوسروں سے کرنا پڑا جس سے سب پر میری محبت کا راز فاش ہوا۔ راز اس کا یہ ہے کہ جب دوسروں سے اپنا حال کہے گا تو یہ ہرجائی بنے گا اور کوئی بھی اس کو خصوصیت کے ساتھ توجہ نہیں دے گا اس لئے محروم ہو جائے گا۔ طریق میں سب سے مشکل اس چیز سے اپنے آپ کو بچانا ہے کیونکہ اپنا مطلب ہر ایک کو عزیز ہوتا ہے لیکن دو باتیں سالک کے ذہن میں نہیں رہتیں جس سے وہ تعجیل میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے اس لئے وقت سے پہلے اس کا حصول انسان کو محروم کر دیتا ہے۔ ایک طالبعلم ہے وہ میڈیکل کالج میں پڑھتا ہے وہ ایک مطلوبہ کورس پورا کرے گا۔ اس کے امتحانات دے گا جب کامیاب ہو گا تو ترقی کرتے کرتے ایک دن ڈاکٹر بن جائے گا۔ اب ایک طالب علم ڈاکٹروں کو دیکھ دیکھ کر چاہتا ہے کہ وہ بھی جلدی سے ڈاکٹر بن جائے اور اس کی تدبیریں کرنے لگے تو وہ کبھی بھی ڈاکٹر نہیں بن سکے گا کیونکہ وہ پڑھائی پر اپنی توجہ مرکوز نہیں کر سکے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ طریق میں طریقہ بتانا تو شیخ کے ذمہ ہے لیکن وصول شیخ کے اختیار میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں۔ یہ ہر سالک کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے معاملے پر موقوف ہے پس اگر شیخ کی تعلیمات صحیح ہیں اور کسی سالک کو وصول نہیں ہو رہا تو گڑبڑ تو سالک میں

ہوئی۔ یہ جس شیخ کے پاس بھی جائے گا تو اپنے ساتھ یہ گڑبڑ لے جائے گا تو وہاں بھی اس کو ناکامی ہوگی۔ دل میں یہ ہر شیخ سے بدگمان ہوتا جائے گا اور اصل برائی اس کے نفس میں ہوگی۔ پس اگر یہ اپنا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ درست کرلے اور ایک شیخ کامل پر اعتماد رکھے تو کامیابی چند قدم پر ہے۔

اس کے الطاف شہیدی تو ہیں مائل سب پر
تجھ سے کیا بیر تھا گر تو کسی قابل ہوتا

2.3.3... حسن پرستی

اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس دنیا میں امتحان کے لئے بھیجا ہے۔ اس کے لئے بعض چیزوں کی محبت دل میں ڈال دی اور اس سے رکنے کا حکم دیا یہ جانچنے کے لئے کہ کون حکم پر عمل کرتا ہے اور کون نہیں۔ ان میں سے ایک حسن بھی ہے۔ ہر شخص کو ہر حسین چیز اچھی لگتی ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی کئی حکمتیں ہیں۔ ان حسینوں میں بعض کو دیکھنا جائز، بعض کو دیکھنا ناجائز ہے۔ پس جن کو دیکھنا ناجائز ہے ان کی طرف دیکھنا اللہ تعالیٰ کے احکامات کی خلاف ورزی ہے جس کی وجہ سے سالک اپنی منزل سے بہت دور جاسکتا ہے اس لئے یہ بھی بڑے موانع میں سے ہے۔ ان میں عورتوں کی محبت اور امارد یعنی لڑکوں کی محبت آتی ہے۔ امارد کے ساتھ اختلاط زیادہ ہوتا ہے اور یہ چونکہ غیر فطری بھی ہے اس لئے ان کی محبت زیادہ بری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے بچائے۔ جواہرِ غیبی میں لکھا ہے کہ ایک شخص طواف کرتا جاتا تھا اور کہتا تھا کہ "اَللّٰھُمَ اِنِّی أَعُوْذُبِكَ مِنْكَ" یعنی اے اللہ میں تجھ سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔ کسی نے اس کا حال دریافت کیا تو کہنے لگا کہ ایک بار کسی حسین امرد کو نظرِ شہوت سے دیکھا اسی وقت غیب سے ایک طمانچہ لگا جس سے آنکھ جاتی رہی۔

یوسف بن حسین فرماتے ہیں کہ "رَأَیْتُ اٰفَاتِ الصُّوْفِیَة فِیْ صُحْبَةِ الْاَحْدَاثِ وَمُعَاشَرَةِ الْأَضْدَادِ وَرِقَقِ النِّسْوَانِ" یعنی دیکھا میں نے آفاتِ صوفیا

کو امردوں کے میل جول کرنے کو اور ناجنسوں سے ملنے کو اور عورتوں سے نرمی برتنے میں۔ شہوت بالنساء سے زیادہ اشد امردوں (یعنی بے ریش) لڑکوں کی شہوت ہے۔ آج کل امردوں کے ساتھ ابتلاء عام ہو رہا ہے۔ یہ فعل حرمت میں سب سے بڑھا ہوا ہے اسی لئے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ بڑا ڈر مجھ کو اپنی امت پر قوم لوط کے فعل کا ہے۔ (ابن ماجه)۔ دوسری حدیث میں فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ سات قسم کے گنہگاروں پر ساتوں آسمانوں کے فرشتے لعنت کرتے ہیں یہ لعنت بھی اس کثرت سے ہوتی ہے کہ ملعون کو تباہ کرنے کے لئے کافی ہو جاتی ہے۔ (ان میں سے اول) اغلام کرنے والا ملعون ہے آپ نے یہ تین بار فرمایا۔ (الحدیث طبرانی) نیز ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مرد کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے جو کسی مرد سے لواطت کرے۔ (الحدیث) عورتوں کے ساتھ نرمی اور مہربانی بھی بعض اوقات بہت مہنگی پڑتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے مواقع کا شیطان طاق میں ہوتا ہے کہ کس طرح مرد اور عورت کی اپنے آپ میں فطری میلان کو استعمال کر کے ان کو یا ان میں کسی کو گناہ میں مبتلا کرے۔ ایسے مواقع پر دل پر پتھر رکھنا ہی سب سے بڑی عقلمندی ہے۔ مظفر قرمینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نرمی اور مہربانی کرنے میں سب سے برا عورتوں سے نرمی اور مہربانی کرنا ہے۔ کسی نے شیخ نصیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ لوگ عورتوں کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کو دیکھنے میں ہماری نیت پاک ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ جب تک جسم انسانی باقی ہے امر و نہی بھی باقی ہے اور تحلیل اور تحریم کے ساتھ مخاطب ہے۔

بعض لوگ ایسے ہیں جو شہوت سے پاک و صاف ہیں۔ مگر ان میں بھی اکثر نظر کے مرض میں مبتلا ہیں۔ حالانکہ زنا آنکھوں سے بھی ہوتا ہے۔ اس میں بھی بہت کم لوگ احتیاط کرتے ہیں حالانکہ نظر فعل کا مقدمہ ہے اور فقہ کا قاعدہ ہے کہ حرام فعل کا مقدمہ بھی حرام ہوتا ہے خوب اچھی طرح سمجھ لیں۔ میلان کے دو درجے ہیں۔ ایک تو مرد اور عورت کا ایک دوسرے کی طرف فطری میلان جو کہ طبعی ہے اور اس میں بڑی حکمتیں ہیں۔ اسی پر تناسل کا سلسلہ قائم ہے اس

لئے اس کو کوئی ختم نہیں کرسکتا اور نہ ہی اس کی امید رکھنی چاہیے اِلّا کہ غلبہء حال ہو جس کا انسان مکلف نہیں۔ دوسرا درجہ میلان کا اختیاری ہے کہ اپنے اختیار سے نامحرم کو دیکھنا یا نظر کو برقرار رکھنا وغیرہ۔ یہ چونکہ اختیاری ہے اس لئے اس سے رکنا بھی اختیاری ہے چاہے کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو البتہ مجاہدہ سے آہستہ آہستہ آسان ہو جاتا ہے۔ اس کا انسان مکلف ہے اور اس پر اجرِ عظیم بھی ہے۔ ایک حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کے ڈر سے نامحرم سے نظر ہٹائی اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں ہی ایسی کسی عبادت کی توفیق دے دیں گے جس سے وہ اپنے ایمان کی حلاوت دنیا میں محسوس کریں گے۔ اصل بات یہ کہ دنیا کی شہوت مذموم نہیں کیونکہ اسی سے تو تقویٰ کا حمام روشن ہے لیکن اس کے تقاضا پر بالقصد عمل پیرا ہونا یا اس کا عزم کرنا مذموم ہے۔ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ "ہمارے ہاں رہبانیت نہیں۔ ہماری رہبانیت یہ ہے کہ شباب ہو۔ موقع ہو۔ دعوت ہو اور ہم کہیں کہ ہمیں اللہ کا ڈر مانع ہے۔"

بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ ایک بار اچھی طرح دیکھنے سے غبار نکل جائے گا پھر طلب نہیں رہے گی حالانکہ اس کی طرف جتنی توجہ کی جائے گی شہوت کی آگ مزید بھڑکے گی حتیٰ کہ آخری مرحلہ پر ممکن ہے تھوڑی دیر کے لئے معاملہ سرد پڑ جائے لیکن پھر اس کی عادت ہو جاتی ہے اور طلب مزید بڑھ جاتی ہے۔ اور اس میں شہوت بالنساء سے شہوت بالامارد زیادہ اشد ہے۔ اول تو کوشش کرنی چاہیے کہ کسی ایسی جگہ جایا ہی نہ جائے جہاں پر اس قسم کا فتنہ ہو۔ اگر بدنظری خدانخواستہ ہو جائے تو وہیں سے پھر اس کا گلا گھونٹا جائے یعنی اس سے توبہ کرنی چاہیے اور ذہن کو کسی اور چیز میں مشغول کیا جائے۔ "اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوْذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ النِّسَاءِ" اور "اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْأَمارِدْ" اس وقت کی دعا ہے۔ آج کل انٹرنیٹ وغیرہ پر یہ مصیبت عام ہے اس کو کھولتے ہوئے بھی یہ دعا پڑھنی چاہیے اور ہمت کر کے اپنی نظر کی حفاظت کرنی چاہیے۔ چاہے کتنی ہی خطرناک صورت حال بن جائے ہمت سے انسان چاہے تو بچ سکتا ہے یہ دعا پڑھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنی چاہیے اور ہمت کرنی چاہیے۔

یہی اصل علاج ہے۔ یہ سوچنا چاہیے کہ اگر اس عورت یا لڑکے کے وارثوں کو میری اس حرکت کا پتا چلے تو وہ کیا کہیں گے اور یہ کہ اگر میری بہن بیٹی بیوی بیٹے وغیرہ کو کوئی اس نیت سے گھورے تو میں کیا کہوں گا نیز اللہ تعالیٰ کو تو ہر چیز کا پتا ہے اس کو تو میرے دل کے ارادے کا بھی پتا ہے پس مجھے اپنے دل کی حفاظت کرنی چاہیے جس کے لئے مجھے کان اور آنکھ پر پہرا بٹھانا چاہیے۔ اگر خدانخواستہ کسی پر دل آجائے تو اس کا اصل علاج تو یہ ہے کہ اپنے شیخ کو فوراً اطلاع کی جائے تاکہ وہ اس کے لئے مناسب تدبیر کرے۔ اگر اس کے ساتھ شادی ممکن ہو تو اس کے ساتھ شادی کا بندوبست کرنا چاہیے نہیں تو دل سے اس کا خیال نکال پھینکے۔ اس کی آسانی کے لئے اگر صحت اجازت دے تو "لا اِلٰہَ اِلا اللہ" کا ذکر اس طرح کرے کہ "لا اِلٰہَ" میں یہ تصور کرے کہ اس کی محبت دل سے نکال پھینک رہا ہوں اور "اِلا اللہ" میں یہ تصور کرے کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں داخل کر رہا ہوں۔ یہ روزانہ ایک ہزار بار کرے۔ عفت پر ثابت قدم رہے ملنے کی کوشش نہ کرے۔ اگر اس میں جان بھی چلی جائے تو اعلیٰ درجہ کی شہادت ہے۔

2.3.4... مخالفتِ سنت

تصوف کا ثمرہ وصول ہے اور وصول کا سب سے بڑا ذریعہ اتباعِ سنت ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا "قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ" (آلِ عمران: 31) یعنی اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنا چاہتا ہو تو وہ اتباعِ سنت کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو محبوب بنا لیں گے۔ پس اگر اتباعِ سنت وصول کا سب سے بڑا ذریعہ ہے تو مخالفتِ سنت سب سے بڑا مانع ہو گا۔ افسوس اس زمانے میں رسوم و بدعات کی بڑی کثرت ہے اور تصوف بھی انہی رسوم و بدعات کا نام رہ گیا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے فرمایا حضور اکرم ﷺ نے "أَنْ يَّأْتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَّا يَبْقىٰ مِنَ الإسلام اِلَّا اسْمُهُ وَلَا يَبْقىٰ مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهُ" (الحديث رواه بيهقي) یعنی عنقریب لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ نہ باقی رہے

گا اس میں اسلام سے مگر نام ہی نام اور نہ باقی رہے گا قرآن سے مگر صرف خطوطِ نقوش۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مخلوق پر سب راستے بند ہیں سوائے اس کی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قدم بہ قدم چلے۔ آپ سے کسی نے پوچھا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اب ہم واصل ہو گئے ہیں اس لئے ہمیں نماز روزہ کی اب حاجت نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ واقعی واصل تو ہوگئے ہیں لیکن سقر کے ساتھ یعنی جہنمی ہوگئے۔ حضرت ابو العباس دینوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

"لوگوں نے ارکانِ تصوف کو توڑ دیا اور اس کے طریقوں کو تباہ کر دیا اور اس کے معنوں کو بدل دیا ایسے ناموں سے جو خود گھڑے، طمع کا نام زیادت رکھا، بے ادبی کا اخلاص اور دینِ حق سے نکل جانے کو شطحیات اور بری چیزوں سے لذت لینے کو خوش طبعی اور خواہش کی پیروی کا امتحان اور دنیا کی طرف لوٹ آنے کو وصل اور بد خلقی کا رعب اور بخل کا جوانمردی اور سوال کا عمل اور بدزبانی اور بے ہودگی کا ملامت اور قوم کا یہ طریقہ نہیں تھا۔"

افسوس ہے کہ بعض لوگ صوفیوں کا لباس تو زیبِ تن کر لیتے ہیں لیکن شاہی وردی کو اتار دیتے ہیں یعنی داڑھی نہیں رکھتے۔ ایسے لوگ جو اپنے آپ کو صوفی کہتے ہیں ان کو شرم آنی چاہیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی میں ایک پارسی قاصد کو جو بغیر داڑھی کا تھا کو دیکھنا گوارا نہ فرمایا تو جو اپنے آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی کہتا ہے اور طریقت کا جو کہ تکمیلِ شریعت کا نام ہے مدعی ہے کیسے یہ سمجھتا ہے کہ بغیر اس اتباعِ سنت کے طریقت میں ترقی کر سکتا ہے۔ کاش یہ بات سب کو سمجھ آجائے۔ جس کو جتنا جلدی سمجھ آجائے بہتر ہے۔ اہلِ کشف کا کہنا ہے کہ اب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سلام کا جواب نہیں دیتے جس نے داڑھی نہ رکھی ہو یا اس نے داڑھی چھوٹی کی ہو۔ ایک مرید اگر ایسا کرتا ہے تو یہ اس کا ذاتی نقصان ہے لیکن جو بزعم خود شیخ ہو اور متبع سنت نہ ہو اس کو ہرگز شیخ نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ طریقت کے ڈاکو ہیں۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "اگر تم ایسا

آدمی دیکھو جس کے ہاتھ پر کرامتیں ظاہر ہو رہی ہیں یہاں تک کہ ہوا میں اڑتا ہے تو دھوکے میں نہ آنا جب تک یہ نہ دیکھو کہ وہ امر و نہی، حفظ و حدود اور اتباع شریعت میں کیسا ہے؟"

تصوف اصل میں شریعت کے ظاہر پر عمل پیرا ہو کر اعمالِ قلب کو درست کرنے کا نام ہے۔ پس جہاں اصل مقصد فوت ہو رہا ہو اور صرف رسومات باقی رہیں تو اس وقت اس کو چھوڑ کر حق کی تلاش لازمی ہے جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ "صوفیا کی نسبت تو بڑی بھاری نعمت ہے لیکن ان کی رسومات کا کچھ بھی وزن نہیں"۔

2.3.5... مخالفتِ شیخ

تصوف میں اصلاحِ نفس کا سب سے بڑا ذریعہ اتباعِ شیخ کامل ہے۔ جیسا کہ اعمالِ ظاہر میں کسی امام کی تقلید سے نفس کے شر سے انسان بچ سکتا ہے اس طرح اعمالِ قلب میں نفس کے شر سے انسان اتباعِ شیخ سے ہی بچ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جس کو جس چیز کا ذریعہ بنایا ہے اس چیز کا حصول اس کی قدردانی پر رکھا گیا ہے مثلاً والدین ظاہری وجود کا ذریعہ ہیں اس لئے جو والدین کی قدر نہیں کرتے ان کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ استاد علم کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے تو جو استاد کی قدر نہیں کرتے ان کے علم میں برکت نہیں ہوتی۔ شیخ روحانی ترقی کا ذریعہ ہوتا ہے تو جو شیخ کی قدر نہیں کرتے ان کی روحانی ترقی رک جاتی ہے۔

حضرت ابن منصور رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ کے دل کو مکدر کیا تھا کیونکہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ ان کو اظہارِ حال سے روکتے تھے اور اس کو اس پر قادر سمجھتے تھے لیکن ابنِ منصور رحمۃ اللہ علیہ اپنے آپ کو قادر نہیں سمجھتے تھے اور اپنا حال ظاہر کر دیتے تھے تو انہوں نے کبھی چین نہیں پایا یہاں تک کہ ان پر علماء کرام نے کفر کا فتویٰ لگایا اور انجام کار سولی پر چڑھ گئے۔ چونکہ ابن منصور رحمۃ اللہ علیہ معذور تھے اس لئے آخرت میں تو معتوب نہیں ہوں گے لیکن زندگی میں تو مزید ترقی سے رک گئے۔

بعض دفعہ شیخ کی مخالفت تو کوئی نہیں کرتا لیکن شیخ کی تعلیم کے علاوہ از خود مجاہدہ کرتا ہے اس سے چند روز میں گھبرا کر وہ تھوڑا تعلیم کیا ہوا بھی چھوٹ جاتا ہے، چنانچہ بہت سے لوگوں کو ایسا اتفاق ہوا۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اعمال میں اتنا اختیار کرو کہ اکتاؤ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نہیں اکتاتا جب تک تم نہ اکتا جاؤ۔ شیخ سے محبت و عقیدت میں فتور ڈالنا یا اس سے بھی بڑھ کر شیخ کو رنجیدہ کرنا اور اس کو ایذا پہنچانا انتہائی نقصان دہ امر ہے کہ اس سے مناسبت باقی نہیں رہتی اور بدون مناسبت کے طالب کو نفع نہیں ہو سکتا اور مناسبتِ شیخ کے یہ معنی ہیں کہ شیخ سے مرید کو اس قدر موانست و عقیدت ہو جائے کہ شیخ کے کسی قول و فعل و حال سے مرید کے دل میں طبعی نکیر نہ پیدا ہو گو یہ عقیدتِ عقلی ہی ہو یعنی شیخ کی سب باتیں مرید کو پسند ہوں اور یہی مناسبتِ بیعت کی شرط ہے لہٰذا اس کا بہت اہتمام چاہئے اس کی سخت ضرورت ہے جب تک یہ نہ ہو مجاہدات، ریاضات، مراقبات، و مکاشفات سب بیکار ہیں۔ کوئی نفع نہ ہو گا۔ اگر طبعی مناسبت نہ ہو تو عقلی پیدا کر لی جائے اس پر نفع موقوف ہے۔ اسی لئے جب تک پوری طرح مناسبت نہ ہو بیعت نہ کرنا چاہئے۔ جب پوری طرح محبت و مناسبت ہو جائے اس وقت پیر سے بیعت زیادہ نافع ہے۔

یہ بھی جاننا چاہیے کہ مخالفت اور چیز ہے اور اختلاف اور چیز ہے۔ بعض دفعہ کسی فقہی جزیہ میں شیخ سے اگر اختلاف ہو جائے اور دل میں شیخ کا ادب ہو اور ظاہر میں بھی کسی بے ادبی کا مرتکب نہ ہو تو اگر شیخ کے ہاں اس قسم کے اختلاف کی وسعت موجود ہو تو اس سے نقصان نہیں ہوتا۔ یہ بات تجربے سے ثابت ہے کہ طبعاً بعض مشائخ ادب اور اخلاص کے ساتھ اختلاف سے ناراض نہیں ہوتے بلکہ خوش ہوتے ہیں۔ اس لئے اس وقت اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ حضرت مولانا عُزیر گل صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جب ایک دفعہ یہ خیال ہوا کہ مخالفتِ شیخ سے بہت نقصان ہوتا ہے اور ان کی طبعی سادگی اور اخلاص کی وجہ سے بعض دفعہ شیخ کے ساتھ اختلاف کا موقع بھی آجاتا تھا۔ اس لئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ جو ان کے شیخ تھے کے ہاں جانا چھوڑ دیا۔ حضرت کو اطلاع ہوئی تو بلایا اور پوچھا

کہ کیوں نہیں آتے۔ انہوں نے کہا کہ حضرت مخالفتِ شیخ سے عاقبت خراب ہو جاتی ہے اور میں اپنی عاقبت خراب نہیں کرنا چاہتا اس لئے نہیں آتا۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر شیخ ایسا ہی چاہتا ہو تو مولانا نے کہا کہ پھر تو میں کروں گا تو شیخ نے فرمایا کہ پھر آیا کرو۔

حضرت مولانا رشید گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بہت محبت تھی لیکن بعض مسائل میں ان کا مسلک وہ نہیں تھا جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا تھا انہوں نے نہ تو اپنا مسلک چھوڑا اور نہ حاجی صاحب کو اور حاجی صاحب کے دل میں بھی کبھی مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی وقعت کم نہ ہوئی بلکہ بڑھ گئی۔ خود راقم کو اپنے شیخ مولانا اشرف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ایک مسئلے میں اختلاف تھا۔ حضرت نے راقم کو کبھی اپنے مسلک سے رجوع کرنے کا نہیں فرمایا بلکہ ایک دفعہ صراحت کے ساتھ اس عاجز نے حضرت سے پوچھ بھی لیا کہ اگر حضرت مناسب سمجھیں تو اپنے مسلک کو چھوڑ دوں۔ حضرت نے اس کی اجازت نہیں دی۔

2.4... خواطر (خیالات)

کسی بندے کے دل میں جو خیال آتا ہے اسے خاطر کہتے ہیں، وہ کبھی خیر ہوتا ہے کبھی شر ہوتا ہے۔ خیر کا خیال کبھی من جانب اللہ ہوتا ہے۔ کبھی فرشتے کی جانب سے جس کا نام ملہم ہے۔ اور کبھی شیطان کی جانب سے بھی ہوتا ہے اور شر کا شیطان کی طرف سے یا نفس کی طرف سے ہوتا اور کبھی کبھی حکمتاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو خیر ہوتا ہے وہ اکراماً ہوتا ہے یا اتمامِ حجت کے لئے ہوتا ہے اور جو شر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے وہ امتحاناً ہوتا ہے اور محنت میں ڈالنے کے لئے ہوتا ہے، ملہم کی طرف سے ہمیشہ خیر ہی دل پر وارد ہوتا ہے کیونکہ اس کا کام ہی یہی ہے، یہ مرشدِ ناصح کی طرح ہوتا ہے اور جیسا شیطان انسان کے ساتھ لگا ہوتا ہے اس طرح ملہم بھی انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ شیطان کی طرف سے جو خیر ہوتا ہے وہ مکر و استدراج ہوتا ہے۔ یہ صورتاً تو خیر نظر آتا ہے لیکن اس کے اندر شر چھپا ہوا ہوتا ہے مثلاً کسی اعلیٰ خیر سے روکنے کے لئے کسی جھوٹی خیر یا چھوٹے خیر میں مبتلا کرنا اور جو شر ہوتا ہے وہ اِغوا کیلئے یا ذلیل کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ نفس کی طرف سے جو شر ہوتا ہے وہ بے راہ روی کے لئے یا راہِ حق کے مجاہدات سے بچنے کے لئے ہوتا ہے اور اس میں بہت کم خیر ہوتا ہے شیطان کی طرح جیسے اخلاص کے بغیر شریعت۔

شیطان اور نفس کے شر کے درمیان فرق

نفس کے اندر حکمتاً کچھ رذائل رکھے گئے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے کچھ تقاضے اس میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان رذائل کو دبانا اصلاحِ نفس کہلاتا ہے جب تک نفس کے کسی رذیلے کی اصلاح نہیں ہوچکی ہوتی ہے شیطان اس رذیلے کے مطابق وساوس ڈال کر انسان کو گناہوں میں مبتلا کرتا رہتا ہے لیکن اگر کسی رذیلے کی اصلاح ہو جائے تو پھر شیطان کے لئے چونکہ میدان کھلا ہے تو کسی اور رذیلے جس کی اصلاح سے ابھی تک سالک غافل ہوتا ہے کی بنیاد پر وساوس ڈالنے کا انتظام کرتا رہتا ہے اور اس میں وہ بہت مشاق ہے وہ سالک کے حالات اور احوال کے

مطابق وسوسہ ڈالنے کی سعی کرتا ہے۔ اس وسوسے کے شر کو دفع کرنے کا ایک طریقہ یہ بتایا جاتا ہے کہ اپنے آپ کو کسی اور مباح کام میں مشغول کر دے جس کی طرف طبیعت جلدی مائل ہو سکتی ہو پس اگر اس سے دھیان ہٹ گیا یا وسوسہ اتنا کمزور ہو جائے کہ گناہ نہ کرا سکے تو یہ نفس کے اس رذیلے کا اثر تھا پھر اگر کسی اور صورت میں اس گناہ کا تقاضا دوبارہ ابھر آئے تو یہ شیطان ہے جو گناہ کروانے پر تلا ہوا ہے اور اس کے لئے وہ اسی رذیلے کا پلیٹ فارم دوبارہ ایک مختلف شکل میں استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اس کی ایک مثال عرض ہے کہ احقر وضو ہونے یا قائم نہ رہنے کے شک میں مبتلا تھا۔ میرے شیخؒ نے میرا علاج کیا اور حضرتؒ نے فرمایا کہ جب تک قسم نہ کھا سکو کہ میرا وضو نہیں ہے اس وقت تک آپ کا پرانا وضو بحال ہے کیونکہ شک یقین کو زائل نہیں کر سکتا۔ اس میں کافی افاقہ ہوا تو ایک دن عرض کیا کہ حضرت اب تو میں اتنا بے فکر ہو گیا ہوں کہ ممکن ہے اب اس کی وجہ سے واقعی بے وضو کی حالت میں وضو کے قائم ہونے پر کہیں یقین نہ کر بیٹھوں حضرت نے فرمایا خبردار اس کی طرف توجہ نہ کرنا کیونکہ شیطان اب دوسرے رخ سے وہی حملہ کر رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکمتاً جو شر وارد ہوتا ہے اور شیطان کی طرف سے وارد شر کے درمیان فرق

جو شر اس طرح وارد ہو کہ نہایت مضبوط ہو اور ایک حالت پر رہے۔ نفس نہایت شدت سے اس کے کرنے کو بے قرار ہو، دفع کی تدبیریں کرتا ہو مگر کسی طرح دفع نہیں ہوتا وہ شر من جانب اللہ ہے۔ اس کا علاج بغیر اس کے کچھ نہیں کہ حق تعالیٰ کے دربار میں اعانت اور توفیق طلب کرے اور تضرع اور گریہ و زاری رکھے اور اگر اس قدر شدت نہ ہو مگر ایک ہی حالت پر رہے وہ نفس کی جانب سے ہوتا ہے۔ اور اگر کسی گناہ کے بعد خطرہ شر قوت کے ساتھ پیدا ہو تو وہ من جانب اللہ عاصی کی اہانت اور اس گناہ کی ظلمت کی سزا کے طور پر ہے اور اگر گناہ کے بعد شر کا خطرہ قوت کے ساتھ پیدا نہ ہو، اول ہی اول ہو تب وہ

شیطان کی جانب سے ہے۔ بشرطیکہ ذکر کرنے کی وجہ سے دفع ہو جائے یا کمزور ہو جائے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا

قالَ جَلالُ الدِّینِ عَبْدُالرَّحْمنِ بْنُ أَبِی بَکْرٍ السُّیُوطِیُّ رحمہُ اللہ: وَأَخْرَجَ ابْنُ أَبِی شَیْبَۃَ وَابْنُ جَرِیرٍ وَابْنُ مَرْدُویَہْ عَن ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنھما فِی قَوْلِہ: الوَسْوَاسِ الخَنَّاسِ قَالَ: الشَّیْطَانُ جَاثِمٌ عَلَی قَلْبِ ابْنِ آدَمَ، فَإِنْ سَھَا وَغَفَلَ وَسْوَسَ، وَإِذَا ذَکَرَ اللہَ خَنَسَ (الدر المنثور:15/808) کہ شیطان آدم کی اولاد کے قلب پر ٹیک جما کر بیٹھتا ہے، جب اللہ کا ذکر کرتا ہے، تو ہٹ جاتا ہے اور جب اللہ کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے تو وسوسے ڈالتا ہے۔ اور اگر وہ شر ذکر کی وجہ سے دفع نہ ہو کمزور ہو تو نفس کی طرف سے ہے جس طرح کہ شیطان کو خطرہ "خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَہ مِنْ طِیْنٍ" یعنی آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا اور اس کو آپ نے خاک سے پیدا کیا۔ (الاعراف:12) نفس کی جانب سے تھا جس کا دفعیہ نہ اس کا ذکر کر سکا اور نہ حق تعالیٰ کی تلقین و تذکیر سے ہوا اس کا سبب عبدیت اور عجز کا نہ ہونا تھا نیز مشاہدہ سے محرومی تھی وہ طاعت و عبادت محض جسمانی تعب تھا، قلبی مشاہدہ نہ تھا کیونکہ بعد مشاہدہ حجت کا پیش کرنا نہیں ہوتا بلکہ تعمیل میں تسلیم و رضا ہوتی ہے یہ "کیفَ و لِمَا" مشاہدے سے قبل ہی ہوا کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور ملہم کی طرف سے خیر کے خطرہ کے وارد ہونے میں فرق

جو خیر، قوت اور صمیم قلب کے ساتھ وارد ہو کہ اس پر بلا عمل کئے چین نہیں آتا یا وہ خیر مجاہدہ اور طاعت کے بعد ہو یا وہ خیر اصول اور اعمالِ باطنہ میں سے ہو تو وہ من جانب اللہ ہے۔ "وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا" اور جن لوگوں نے ہمارے لئے کوشش کی ہم اُن کو ضرور اپنے رستے دکھا دیں گے۔ (العنکبوت:69) یہ آیتِ کریمہ اس پر دلیل ہے اور اگر ایسی قوت و حالت نہ ہو یا مجاہدہ ابتدائیہ کے بغیر ہو یا اعمالِ ظاہرہ کی کسی شاخ کے متعلق ہو تو وہ خیر ملہم

کی جانب سے ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور شیطان کی طرف سے خیر کے خطرہ کے وارد ہونے میں فرق

جو خیر کا خطرہ اس طرح وارد ہو کہ اس سے خوف کے بغیر ایسا نشاط محسوس ہو اور رکاوٹ کے بغیر عجلت ہو اور عمل میں انجام پر نظر نہ ہو وہ شیطان کی طرف سے ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ عجلت من جانب الشیطان ہے مگر پانچ مواقع میں۔

(1) نکاح باکرہ (2) ادائے قرض (3) تجہیز میت (4) اطعام مہمان (5) توبہ از گناہ

اور اگر خیر کا خطرہ اس طرح وارد نہ ہو بلکہ خوف کے ساتھ نشاط ہو اور انجام پر نظر ہونے کے ساتھ ہو تو وہ من جانب اللہ تعالیٰ ہے اور من جانب ملک بھی کہا جاتا ہے۔

غور طلب

خوف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس خیر کے پورے طور پر ادا ہونے اور اس کو اس کے حق کے طریق پر ادا ہونے کا خوف ہو، نیز قبول ہونے نہ ہونے کا احتمال ہو کر خوف ہو۔ انجام پر نظر ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اس کے متعلق رشد و خیر اور ثواب و آخرت میں دیکھنے اور امید رکھنے پر نظر ہو، دوسرا مطلب اور غرض نہ ہو۔

ملہم ایک فرشتے کا نام ہے جو آدمی کے دائیں جانب قلب پر جما بیٹھا ہوتا ہے اور وسواس ایک شیطان کا نام ہے جو آدمی کے بائیں جانب قلب پر جما بیٹھا ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ "اِذَا وُلِدَ لِابْنِ اٰدَمَ مولود قَرَنَ اللّٰہُ مَلَکًا وَقَرَنَ بِہٖ شَیْطَانًا فَالشَّیْطَانُ جَاثِمٌ عَلٰی اُذُنِ قَلْبِ ابْنِ اٰدَمَ الْأَیْسَرِ وَالْمَلَکُ جَاثِمٌ عَلٰی اُذُنِ قَلْبِہِ الْأَیْمَنِ فَھُمَا یَدْعُوْنہ" یعنی جب بھی انسان کے کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ایک فرشتہ پیدا فرماتے ہیں اور

ایک شیطان بھی۔ شیطان تو اس کے قلب کے بائیں جانب بیٹھ جاتا ہے اور فرشتہ اس کے قلب کی داہنی جانب پر اور وہ دونوں اس کو اپنی اپنی طرف بلاتے ہیں۔

شیطان کے خطرے اور شر کو دفع کرنے کے لئے معمولی توجہ، ذکر اور "لاحول ولا قوۃ الا باللہِ العلیِّ العظیم" کا ورد کفایت کرتا ہے۔ کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ "اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطَانِ کَانَ ضَعِیْفاً" یعنی بے شک شیطان کا فریب کمزور ہے۔ (النساء:76) اصل علاج شیطانی وساوس کا یہ ہے کہ قطعاً اس طرف التفات نہ ہو اور التفات نہ ہونے کی پہچان یہ ہے کہ ان وساوس پر مغموم و متفکر نہ ہو بلکہ وسوسے سے پہلے جو حال تھا اسی طرح رہے بلکہ وسوسے کا آنا اپنے مؤمن ہونے پر دلیل سمجھ کر مسرور ہو چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب وساوس کے آنے پر اپنا حال ذکر کیا کہ یا رسول اللہ اب تو ایسے وسوسے آتے ہیں کہ اس سے تو ہمارا جل کر کوئلہ ہو جانا اچھا ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، "ذٰلِکَ صَرِیْحُ الاِیْمَانِ" یہ کھلی ہوئی ایمان کی دلیل ہے۔ چور وہیں آتا ہے جہاں کچھ ہوتا ہے البتہ ہوائے نفس کے دفع کے واسطے بہت ہی جدوجہد اور اس پر غیظ و قہر کی ضرورت ہے۔ اس لئے ہوائے نفس کے دفع کے تین طریق ہیں۔

شہوات سے روکنا

اس کی خواہشات بمقاومتِ نفس پوری نہ کی جائے جیسے کہ چوپایہ شہ زور کا جب چارہ روک دیا جاتا ہے یا کم کر دیا جاتا ہے تو نرم پڑ جاتا ہے۔ اس طرح خواہشِ نفس بھی آہستہ آہستہ مضمحل ہو کر منقطع ہو جاتی ہے۔

عبادت کا بوجھ اس پر لادنا

جس طرح گدھا کہ جب اس کو چارہ کی کمی کے ساتھ بوجھ زیادہ لادا جاتا ہے تو پست و تابع اور منقاد ہو جاتا ہے۔ دولتی نہیں پھینکتا۔ اسی طرح نفس پر عبادتِ نافعہ کا بوجھ ڈالا جائے تو وہ رام ہو جاتا ہے۔ کشاکشی سے نکل جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا اور اس کے سامنے عاجزی

جیسا کہ فرمایا "اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ" (یوسف:53) یعنی نفس تو ہر ایک بری ہی بات بتلاتا ہے بجز اس کے کہ جس پر میرا رب رحم کرے۔ جب ان تینوں اُمور کی پابندی کی جائے گی تو اِن شاءاللہ تعالیٰ شریر نفس اطاعت گزار ہو جائے گا اور اس کے شر سے مامون و محفوظ رہے گا، مگر پھر بھی اس سے غافل نہیں ہونا چاہیے، کہیں غفلت میں غلبہ نہ پالے۔

حقیقتِ نفس

انسان کے اندر ایک ہی قوت ہے جس سے کسی چیز کی خواہش ہوتی ہے۔ اس کا نام نفس ہے خواہ وہ خواہش خیر ہو یا شر اور یہ نفس تین طرح پر ہے۔

(1) نفسِ امّارہ: یہ اکثر شر کی خواہش کرتاہے اور نادم بھی نہیں ہوتا۔ اسی درجے کا نام ہوائے نفس ہے۔

(2) نفسِ لوّامہ: جو شر کی خواہش بھی کرے اور نادم بھی ہو۔

(3) نفسِ مطمئنہ: اکثر خیر کی خواہش کرے۔ اس کو نفسِ مطمئنہ کہتے ہیں۔

خیال کی قسمیں اور ان کا حکم

حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لئے ان کے خیالات سے تجاوز فرما دیاہے۔ جن کی وہ اپنے جی سے باتیں کرتے ہیں۔ جب تک کہ ان کو منہ سے نہ نکالیں یا ان کو عمل میں نہ لائیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ ان کے سینوں میں جو وساوس پیدا ہوں۔ خیال کے مراتب پانچ ہیں۔

2.4.1... ہاجس

جب کوئی بات قلب میں ابتداءً واقع ہوئی اور نفس نے اس کو ابھی لیا نہیں اس کو ہاجس کہتے ہیں۔

2.4.2... خاطر

اگر اس شخص کو توفیق ہوئی اور اول ہی سے اس کو دفع کر دیا تو اس کے بعد والے حالات سے بچ گیا اور اگر نفس اس کی طرف متوجہ ہوا مگر اس کے کرنے نہ کرنے کا کوئی منصوبہ نفس نے فی الحال نہیں باندھا اس کو خاطر کہتے ہیں۔

2.4.3... حدیثِ نفس

جب نفس کرنے نہ کرنے کے برابر درجہ میں منصوبہ باندھنے لگے اور ان سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ ہو تو اس کو حدیثِ نفس کہتے ہیں۔

تینوں کا حکم: یہ تین درجے ایسے ہیں کہ ان پر نہ عتاب ہے اگر یہ شر میں ہے اور نہ ثواب ہے اگر خیر میں ہے۔ پھر جب اس فعل کو کر لیا تب اس فعل پر عتاب یا ثواب ہو گا اور ہاجس، خاطر اور حدیثِ نفس پر نہ ہو گا۔

2.4.4... ہم

جب نفس میں فعل یا عدم فعل کا منصوبہ ترجیح فعل کے ساتھ ہونے لگا، لیکن وہ ترجیح قوی نہیں، بلکہ مرجوح ہے۔ جیسا کہ وہم ہوتا ہے اس کو ہمّ کہتے ہیں اس پر ثواب بھی ہوتا ہے اگر وہ خیر میں ہے اور عتاب بھی ہوتا ہے اگر وہ شر میں ہے البتہ اس مرتبے میں آدمی کے واپس ہونے کا مکان زیادہ ہوتا ہے۔

2.4.5... عزم

پھر جب فعل کا رجحان قوی ہو گیا یہاں تک کہ جازم مصمم بن گیا اس کو عزم کہتے ہیں۔ اس پر بھی اس کے مطابق ثواب ہوتا ہے اگر خیر میں ہے اور عتاب ہوتا ہے اگر شر میں ہے۔

اجازت

شرائطِ اجازت

شیخ طالب کو جب مجالست و مکاتبت وغیرہ سے مسلسل اصلاح کی طرف باستقلال و استقامت متوجہ پاتا ہے۔ اور وہ اس راہِ سلوک کو طے کرتا ہوا سیر الی اللہ تک پہنچ جائے تو اس وقت شیخ اس مرید طالب کو خلافتِ بیعت سے نوازتا ہے۔ سیرِ سلوک دو قسم پر ہے سیر الی اللہ و سیر فی اللہ۔ جب دل کو ایک خاص حد تک پاکی حاصل ہو جائے اور ایک خاص حد تک رذائل دب جائیں جتنے کہ شریعت پر چلنے کے لئے ضروری ہیں تو شیخ اس کو افادۂ عام اجازت دے سکتا ہے۔

مرید کی جتنی جتنی اصلاح ہوتی جاتی ہے اتنا اتنا اس کو اپنے اوپر خشیت کے طاری ہونے کی وجہ سے خطرہ بڑھتا رہتا ہے۔ اس اثناء میں شیخ جب مرید کو اجازت دیتا ہے اور مرید کو خلافت کے شوق کی بیماری نہ ہو تو اس کو اکثر تعجب ہوتا ہے اور وہ صرف امتثالِ امر کے طور پر اس کو قبول کرتا ہے ورنہ حقیقت میں اپنے آپ کو اس کا قابل نہیں پاتا۔

غور طلب

شیخ مرید کو سیر الی اللہ کے مرتبے پر پہنچنے کے بعد ہی مجازِ بیعت کر دیتا ہے اور کبھی سیر فی اللہ کے حصول کا انتظار کرتا ہے۔ یہ مرید کے حال اور شیخ کے ذوق پر منحصر ہے۔

خلافت کا شوق ایک خطرناک گڑھا

شیخ کو جب بھی شرح صدر ہو وہ خلافت دے سکتا ہے جس کے لئے ہر شیخ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا اپنا معاملہ ہے البتہ مرید کے دل میں اگر خلافت کا خیال ہے تو یہ اس راستے کی بہت بڑی گھاٹی ہے جس سے جو بھی بچ جائے بڑا ہی خوش نصیب ہے۔

ایک دفعہ ایک بزرگ سے کوئی مرید بیعت ہوا اور خانقاہ میں رہنے لگا۔ حضرت نے بڑی کوشش کی کہ اس کا کام چل جائے لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ اس بزرگ کو فکر ہوئی کہ یہ کیا ماجرا ہے کہ میں اس کو آگے بڑھانے کی کوشش میں لگا ہوا ہوں لیکن اس کو فائدہ نہیں ہو رہا، بالآخر انہوں نے اس مرید سے پوچھا کہ آپ کی میرے پاس آنے کی کونسی نیت تھی اس نے کہا کہ حضرت ماشاءاللہ آپ کا فیض چار دانگ پھیل رہا ہے، میری بھی خواہش ہے کہ یہ نعمت اگر میسر ہو تو اس کو پورے عالم میں پھیلانے کی سعی کروں۔ حضرت نے فرمایا اوہ! کتا یہاں لیٹا ہوا ہے نکالو اس خیال کو دل سے، ابھی سے تو نے پیر بننے کی ٹھانی ہے، تو اس سے توبہ کرائی پھر اس کے بعد اس کو فائدہ ہونا شروع ہوا۔ اس لئے کسی سے کوئی بیعت ہو تو محض اپنی اصلاح کے لئے ہو، کسی اور کی اصلاح کے لئے نہ ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہسپتال میں جو بیمار ہوتا ہے وہ ڈاکٹر کے پاس آیا ہو تو اپنے آپ کو چھوڑ کر دوسروں کے علاج کی فکر میں ہو تو روحانی رذائل تو جسمانی بیماریوں کے مقابلے میں زیادہ شدید ہیں تو اس میں دوسروں کی فکر اپنی فکر سے کسی کو کیونکر غافل کرے۔

حضرت اقدس سید شبیر احمد کاکاخیل دامت برکاتہم
کی دیگر تصوف کی کتب

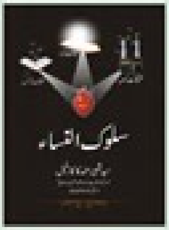
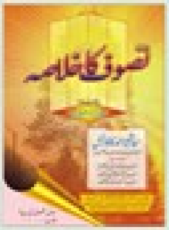

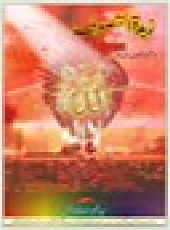

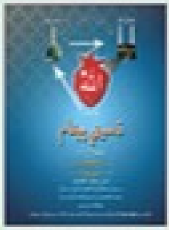

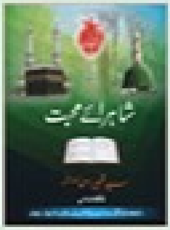

ویب سائیٹ tazkia.org

اردو، انگریزی، پشتو، عربی میں عقائد، فقہ اور تصوف سے متعلق بہت سی معلومات کا خزانہ

درسِ مثنوی (جمعہ)، اصلاح و تربیت سے متعلق سوالوں کے جوابات (سوموار)
عارفانہ کلام (حضرت شاہ صاحبؒ) (منگل)، درسِ مکتوبات حضرت مجدد الف ثانیؒ (بدھ)
درسِ عبقات (شاہ اسماعیلؒ) (جمعرات)

مندرجہ بالا بیانات موسم گرما میں بعد از نماز عصر اور موسم سرما میں بعد از نماز مغرب منعقد ہوتے ہیں

اتوار کو خواتین کیلئے اصلاحی بیان (11 بجے دن)
مختلف مقامات پر بیان (بعد از نماز مغرب) اور انگلش لیکچر (8 بجے رات)
جمعہ کو مجلس درود شریف، ختم قرآن و دعا (بعد از نماز عصر) اور اصلاحی جوڑ
(ہفتہ عصر سے اتوار کی اشراق تک) ہوتا ہے۔

تمام بیانات ویب سائٹ tazkia.org پر بھی براہ راست سنے اور ڈاؤنلوڈ کیے جاسکتے ہیں

خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ مکان نمبر CB-1991/1 گلی نمبر 4 بالمقابل جامع مسجد سیدنا حمزہ، شاہ ... ویسٹریج III، راولپنڈی
فون نمبر: 03325289274